بھوپال ایکسپریس

اویس شاہ



98 رائے

سمجھوتہ ایکسپریس

اویس شیخ

فکشن ہاؤس
۱۸۔ مزنگ روڈ، لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب = سمجھوتہ ایکسپریس
مصنف = اویس شیخ
پبلشرز = فکشن ہاؤس
18_ مزنگ روڈ' لاہور
فون 7249218-7237430
پروڈکشن = ظہور احمد خاں / رانا عبدالرحمان
معاون = ایم سرور
پرنٹرز = اے- این- اے پرنٹرز' لاہور
سرورق = ریاظ
اشاعت = 1999ء
قیمت = -/180 روپے

انتساب

مہکار شیخ کے نام

پیش کردہ

اندر کمار گجرال

سابق وزیر اعظم (ہند)

7/8/06

ترتیب

پیش لفظ		
اظہار خیال	آئی کے گجرال	11
	حنیف رامے	13
	فرخندہ لودھی	15
امرتسر	امن مارچ، گولڈن ٹمپل، جلیانوالہ باغ، امرتسر کے بازار	
	فرید کوٹ، تقسیم پنجاب اور مسلم سکھ فسادات	21
کلکتہ کا فٹ پاتھ		79
جناح اور گاندھی		99
آئی کے گجرال سے مکالمہ		121
امیر جماعت اسلامی ہند سے مذاکرات		131
دہلی	ملاقاتیں: پاکستان ہائی کمشنر، نائب صدر، سیکرٹری کانگرس آئی	
	زیارت: مرزا غالب، امیر خسرو، نظام الدین اولیاء	151
لاہور کنونشن	پاک بھارت تجارت، مسئلہ کشمیر مذہبی رواداری	167
جے پور		193
ماؤنٹ ابو		199
کھیڑی کیمپ		209
تاج محل		217
اجمیر شریف		223
انور ملک کی کہانی		229
رقص و موسیقی		247

پیش لفظ

"سمجھوتہ ایکسپریس" خواہشوں کا ایک ننھا سا دیا ہے جو دشمنیوں' بے یقینیوں' بداعتمادیوں اور نفرتوں کے اندھیروں کے بیچ جلا کر رکھ دیا گیا ہے۔ مجھے امید ہے پاک و ہند میں بسنے والے کروڑوں انسانوں کے دلوں کی تمنائیں' امیدیں' خواہشیں' آرزویں اور انسان دوستی کے جذبے اس دیے کی لو کو کم نہیں ہونے دیں گے۔ چراغ سے چراغ جلے گا تو روشنی ہر سو پھیل جائے گی نفرتوں کے سائے مٹ گئے تو زندگی پھر سے لوٹ آئے گی۔

امن کے قیام کے لئے کی جانے والی میری کوششوں کا محور دونوں ملکوں میں بڑھتی اور پھیلتی ہوئی وہ غربت ہے جسے میں نے اپنی تمام تر خوفناکیوں اور ہولناکیوں کے ساتھ پر پھیلائے بڑے قریب سے دیکھا ہے۔ ہمیں اپنے اسی مشترکہ دشمن سے لڑنا ہے۔ تاکہ 21ویں صدی میں داخل ہوتے ہوئے ہم زمانے کے بہاؤ میں اکھڑنے سے بچ جائیں۔

بھارت کے سابق وزیراعظم آئی کے گجرال نے میری کتاب کے لئے اپنے بصیرت افروز خیالات کا اظہار کرکے میری عزت افزائی فرمائی۔ ان کی تحریر سے دونوں ملکوں کے عوام کی جانب سے امن کے لئے کی جانے والی کوششوں کو بڑی تقویت ملی ہے۔ میں ان کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ جناب سیتا پال کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ ان کی شفقت ہمیشہ میرے ساتھ رہی ہے۔ ان کے تعاون کے بغیر یہ کتاب مکمل نہیں ہو سکتی تھی۔ پنجاب کے سابق وزیراعلیٰ اور سابق سپیکر جناب حنیف رامے کا بے حد ممنون ہوں جنہوں نے "سمجھوتہ ایکسپریس" کے لئے اپنے گرانقدر خیالات سے نوازا۔ ان کی تحریر کا ایک ایک لفظ میرے لئے باعث فخر ہے۔ اس سے جہاں میری حوصلہ افزائی ہوئی وہاں کتاب کے وقار میں اضافہ بھی ہوا۔

محترمہ فرخندہ لودھی کا دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے میری کتاب کو پسند کیا اور شاندار الفاظ میں اپنے تاثرات لکھے جو اس کتاب کا نہایت اہم حصہ ہیں۔

اویس شیخ

15 فروری 1999ء

اظہار خیال

آئی کے گجرال

مجھے خوشی ہے کہ آپ کی کتاب "سمجھوتہ ایکسپریس" منظر عام پر آ رہی ہے۔ آپ کے بھارت کے سفر نے دونوں ملکوں کے عوام کے درمیان دوستی اور باہمی رابطوں کے نئے راستے بنائے ہیں۔

بھارت اور پاکستان دو آزاد اور خودمختار ملک ہیں جو ایک دوسرے کی آزادی اور اقتدار اعلیٰ کا احترام کرتے ہیں۔ دونوں ملکوں کے درمیان بہت سی چیزیں مشترک ہیں۔ جن سے ہم اپنی زندگیوں میں بہتری لانے کے ساتھ ساتھ ادب اور لٹریچر میں بھی ایک دوسرے سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

آپ کی کتاب "سمجھوتہ ایکسپریس" پڑھنے والوں کو یہ جاننے میں بڑی مدد ملے گی کہ ہم دونوں ممالک ایک دوسرے کی فلاح اور خوشحالی کے لئے کتنا کچھ کر سکتے ہیں۔ میں آپ کو "سمجھوتہ ایکسپریس" لکھنے پر داد دیتا ہوں۔

نیک تمناؤں کے ساتھ

محمد حنیف رامے

اویس شیخ کی کتاب "سمجھوتہ ایکسپریس" دراصل پاکستان اور بھارت کے درمیان امن اور دوستی کے اس سفر کی کہانی ہے جو دونوں ملکوں کے چند درد مند انسانوں کے دل و دماغ میں تو شروع ہو چکا ہے۔ لیکن جسے تاریخ اور جغرافیے کے میدانوں میں طے کرنا ابھی باقی ہے۔

ایک وقت تھا کہ ہم ایک ہی ملک میں رہتے تھے اور سمجھا جاتا تھا کہ ایک ہی قوم کے افراد ہیں۔ انگریز کے خلاف ہماری مشترکہ جدوجہد اس کا ثبوت ہے۔ لیکن حالات کے جبر نے ہندوستانی مسلمانوں میں یہ شدید احساس ابھار دیا کہ آزادی کے بعد اپنی غالب اکثریت اور ذات پات کے بندھنوں کی بناء پر ہندوستانی ہندو ان کے ساتھ برابری کا سلوک نہ کرے گا۔ بالاخر انہوں نے الگ قوم ہونے کے ناتے الگ وطن کا مطالبہ کیا جس کے نتیجے میں تقسیم ہند وجود میں آئی۔

جب اقبال نے 1930ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس (الہ آباد) میں برصغیر کے مسلمانوں کے لئے علیحدہ وطن کی بات کی تو انہیں یقین تھا کہ دو ملک بن جانے سے اس خطے میں جہاں طاقت کا توازن قائم ہو گا وہاں امن کا دور دورہ بھی ہو جائے گا۔ بدقسمتی سے بعض غلط اور ناجائز جغرافیائی فیصلوں نے ہماری تاریخ کے گذشتہ پچاس برس بدامنی کی نذر کر دیئے اور دونوں ملک اچھے ہمسایوں کے برعکس ایک دوسرے کے مخالف ہی نہیں دشمن بن گئے۔ دونوں کے درمیان تین جنگیں تو پہلے ہی ہو چکی ہیں اور اب کہ دونوں ایٹمی قوت بن گئے اگر خدانخواستہ ایک جنگ اور ہو گئی اور اس میں ایٹمی ہتھیار استعمال ہو گئے تو پھر رہے نام اللہ کا' دونوں تباہ و برباد ہو جائیں گے۔

سوال یہ ہے کہ کیا پاکستان اور بھارت کے درمیان صرف دشمنی ہی ہو سکتی ہے؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ دونوں ملک ایک دوسرے کے وجود کو دل سے تسلیم کر کے کشمیر کے مسئلے کا ایک ایسا حل تلاش کر لیں جو نہ صرف پاکستان اور بھارت کے لئے قابل قبول ہو بلکہ کشمیری عوام کی امنگوں کے بھی مطابق ہو اور یوں اس خطۂ زمین میں

واقعی طاقت کا توازن قائم ہو جائے اور یہ امن کا گہوارہ بن جائے؟

اویس شیخ سمجھتے ہیں کہ ایسا ہونا بھی چاہئے اور ایسا ہو بھی سکتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ہم نے جنگ، اور دشمنی کو آزما کر دیکھ لیا ہے اور اب ہمیں امن اور دوستی کو موقع دینا چاہئے۔ یہ حقیقت ہے کہ جنگ اور دشمنی نے ان دونوں ملکوں کو بھوک اور خوف کے سوا کچھ نہیں دیا۔ دونوں ملکوں نے اپنے محدود وسائل اپنے عوام کی تعلیم، صحت اور خوشحالی کے لئے استعمال کرنے کے بجائے ایک دوسرے کے خلاف جنگی تیاریوں پر خرچ کر کے اپنے آپ کو آزادی کی نعمتوں اور فوائد سے یکسر محروم کر رکھا ہے۔ یقیناً تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی۔ جب تک بھارت اپنی روش اور رویہ نہیں بدلتا اکیلا پاکستان کچھ نہیں کر سکتا۔ لیکن اہل پاکستان کو جنہیں اسلام کے حوالے سے عالمگیر امن کا حامی ہونا چاہئے، پہل کرنی ہوگی اور اس خطے میں جہاں یہ دونوں ملک آباد ہیں جنگ اور دشمنی کے مقابلے میں امن اور دوستی کی تلاش میں نکلنا ہوگا۔

بہر حال ہم میں سے اویس شیخ نے تو قدم بڑھا دیا ہے اور اس کے لئے وہ داد کے مستحق ہیں۔

امن اور دوستی کے سفر میں اویس شیخ جہاں جہاں گئے "سمجھوتہ ایکسپریس" ان کے اس سفر کی وہ کہانی ہے جو ان کی ذات سے نمودار ہو کر تاریخ اور جغرافیے کے وسیع میدانوں تک پھیل جانے کے لئے بیتاب ہے۔ جہالت، بیماری اور ناداری کے شکنجوں میں پسنے والے وہ کروڑوں انسان جو ان دو ملکوں میں آباد (یا برباد) ہیں ایک سوالیہ نشان بنے بے تابی سے انتظار کر رہے ہیں کہ پاکستان اور بھارت کی اندھی، بہری اور خود غرض قیادتیں اپنی عوام دشمن سیاست کو خیرباد کہہ کر کب ایک دوسرے کی جانب خیر سگالی کا ہاتھ بڑھاتی ہیں۔

اویس شیخ نے جس جذبے اور سلیقے سے اپنے سفر کے ڈانڈے کروڑوں انسانوں کے روشن مستقبل سے ملائے ہیں میرے نزدیک وہ محض انسان دوستی ہی نہیں سچی حب الوطنی اور خداشناسی سے عبارت ہے۔

محمد حنیف رامے

25 - نومبر 1998ء

فرخندہ لودھی

اویس شیخ نے انتہائی ذمہ داری کے ساتھ ایک ایسے مسئلے پر قلم اٹھانے کی ہمت کی ہے جو گذشتہ نصف صدی سے بھی پہلے جنوبی ایشیا کے بے خبر عوام کو ہولے ہولے اپنی گرفت میں لے رہا تھا اور اب تک صدی کی کئی دہائیاں گزر جانے کے باوجود جوں کا توں قائم ہے۔ عوام کی صلاحیتیں ضائع ہو رہی ہیں۔ ایک Status quo کی حالت چلی آرہی ہے۔

دنیا بھر کے دانش ور اس امر پر متفق ہیں کہ گرم اور سرد' دونوں قسم کی جنگیں مسائل کو حل کرنے میں کبھی مددگار ثابت نہیں ہوتیں۔ جنگجویانہ کیفیت کو برقرار رکھنا چند مفاد پرست لوگوں یا گروہوں کا وتیرہ ہے۔ بے خبر عوام کے جذبات کو بھڑکائے رکھنا اور اپنا الو سیدھا کرتے رہنا اور تشنج زدہ ماحول کی برقراری ان گروہوں کی ضرورت زندگی ہے۔

"سمجھوتہ ایکسپریس" تشنج کی فضا کی نشان دہی کرتی ہے۔ جو پاکستان اور ہندوستان کے عوام کے درمیان ہر وقت موجود رہتی ہے۔ یہ تسلیم کر لینے میں دقت ہی کیا ہے کہ پاکستان ایک حقیقت ہے۔ ہندوستان کے ارباب بسط و کشاد اس حقیقت کو جانتے ہیں۔ اس حقیقت کو معرض وجود میں آئے آدھی صدی بیت چکی ہے۔ سیاست اور ٹیکنالوجی میں ہونے والی پیش رفت ممالک کی تاریخ اور جغرافیے کے تحفظات پر ہر لحظہ اثر انداز ہو رہی ہے۔ علاقائی' قومی' مذہبی اور روایتی پنداروں میں سنیدھیں لگ چکی ہیں۔ ایسے ماحول میں جنگجویانہ ماحول کو طول دینا کسی فرد یا کسی خطے کے لئے قطعی سود مند نہیں ہو سکتا۔ انجام فنا کے سوا کچھ نہیں۔ ایٹمی دوڑ میں اپنی برتری ثابت کرنا کسی قوم اور ملک کے عوام کو طاقت ور نہیں بنا سکتا۔ پاکستان یا ہندوستان کے عوامی سطح کے مسائل اسلحے سے حل ہو سکتے تو ان دو ملکوں نے وقفے وقفے سے تین جنگیں لڑ کر دیکھ لی ہیں۔ نتیجہ۔؟ فائدے میں ہمیشہ وہی رہے جو مختلف حوالوں سے ہمسایہ

ممالک کو لڑنے مرنے پر آ

اویس شیخ نے اپنی تصنیف میں دونوں ممالک کے عوام کے حوالے سے بہت سے عوامل اور حقائق کو قاری کے سامنے لانے کی ایک اچھی' کارآمد کوشش کی ہے۔ منفی رجحانات پیدا کرنے میں ہمارا کاغذی اور الیکٹرک میڈیا ہر وقت' ہر گھر اور ہر فرد کے ملاعات پہنچاتا رہتا ہے۔ ٹی وی' ریڈیو چوبیس گھنٹے سمعی و بصری ری رہے ہیں۔ ہر شخص' ہر گ طلاعات کی تشریح اور زاویہ ہائے کے مطابق کر کے' زور ش وپیگنڈا ک ر و غوغا کے درمیا اویس شیخ نے بڑے اعتماد کے ساتھ "سمجھوتہ ایکسپریس" کے ذریعے دونوں ممالک کے لئے بقائے باہمی کا راستہ نکالنا چاہا ہے جسے ہم عوامی میں تو بہتر ہے۔ ان کی اس سعی کے الفاظ ہی کے الفاظ میں پر کھا جا سکتے ہیں: وہ کہتے ہیں:

"میں نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یاں اور یاں وہیں جڑ پکڑتی ہے، جہاں رابطوں کا فقدان ہو۔ کمیونی گیپ ہو۔ اس طرح جو ہے ہی سب سے بڑا ہتھیار ہوتا ہے ا ت کو جوں کا توں ہتی ہیں۔ جو چیلنج (Confrontation) کی ری رہتے ہیں۔

اپنے موقف کی مزید وضاحت وہ اس ط تے ہیں:

"ہم فیصلہ کیا ہے کہ اس خلاء جائے اور عوامی رابطوں کو تیزی کے ایا جائے۔ اس طرح لوگ سچائیوں اور حقیقتوں کو سے دیکھ سکیں گے۔ دونوں ں کے ذرائے ابلاغ اور حکومتیں' سیاست دانوں کے جھوٹ پر مبنی پروپیگنڈے ر مذہبی لیڈروں کے عسکری بیانات ملاپن ظاہر ہو جائے گا۔"

اویس شیخ نے جن جذ الات کا اظہار کیا ہے وہ قابل ہزار ستائش ہیں۔

غور کرنے کی بات ہے کہ ہم مسلمان لوگ۔ لمعالمین کے پیرو ی عالم کر ائی۔ جمہو ر جمہور ے اپنے سے ر کیوں کر ا۔ یہ ا ذی شعو ن

میں ہر وقت کلبلاتا رہتا ہے۔ ہمیں فخر ہے کہ ہمارے پاس جدید ترین نظریہ حیات ہے۔ پھر ہم غیروں کے آلۂ کار کیوں بنتے ہیں۔ ہم اپنے مسائل کو خود کیوں حل نہیں کرتے۔ دوسروں کے دست نگر کیوں ہیں؟ رواداری اور اخوت کی مثالوں سے تاریخ اسلام بھری پڑی ہے۔ ہمیں عوام کو عوام سے متنفر کرنے والی قوتوں کی نفی کرنی چاہئے۔ وہ ہاتھ جو ایک ملک کے عام آدمی کو دوسرے ملک کے عام آدمی سے ملنے سے روکتے ہیں۔ ان کی نشان دہی کرنا اور ان کو روکنا ہی اس جدید نقطہ نظر کی حامل کتاب "سمجھوتہ ایکسپریس" کا مرکزی خیال ہے۔ یہ عام رویہ کو نیا زاویہ فکر دینے والی تحریر ایک سفرنامہ' ایک ریورتاژ اور ایک مطالعہ و مشاہدہ ہے۔

ہمارا ملک' پاکستان' جس کا بنیادی مقصد مسلمان عوام کو سماجی اور اقتصادی تحفظ دینا تھا۔ اس کے ارباب اختیار آغاز ہی سے اس مقصد سے روگردانی کر گئے۔ اس کی بڑی وجہ غالباً" یہ ہے کہ برصغیر کے مسلمان انگریز کی آمد کے بعد عجب نفسیاتی کشمکش میں مبتلا ہو کر ہندو کے مقابلے میں اقتصادی طور پر بدحال ہوگئے۔ تعلیم کے میدان میں پیچھے رہ گئے۔ بحیثیت مسلمان اپنے اصولوں کی برتری کے احساس نے انہیں زمانے کا ساتھ دینے سے قاصر رکھا۔ مسلمانوں کو ہندو کے مقابلے میں ایک الگ ملک میں رہنے میں اپنی بھلائی نظر آئی۔ قائداعظم کی قائدانہ صلاحیتوں کے نتیجے میں انڈین مسلمز پاستان حاصل کرنے میں کامیاب بھی ہوگئے۔ مگر پاکستانی قوم کو گذشتہ پچاس برسوں میں بقا کا مسئلہ مسلسل درپیش رہا۔ لوگوں نے فردا" فردا" بہت کچھ کیا۔ بہت کچھ بنایا مگر افسوس وہ ایک قوم نہ بن سکے۔ بلکہ قوم کے نام پر غیروں سے بھیک مانگ کر اپنے اپنے گھر بناتے رہے۔ پاکستانی افراد میں باہم اتفاق رائے نہیں۔ ہم آہنگی نہیں۔ ابھی تک وہ ایک خواب کی کیفیت میں ہیں۔

ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں (غالب)

پاکستان ایک نظریاتی ملک ہے۔ اس کی سرحدیں بھی نظریاتی ہیں۔ لہٰذا دیکھنے میں آیا ہے کہ پاکستان کے افراد جملہ حقوق اور حدود کا تعین اپنے مفاد کے حساب سے

کرتے ہیں۔ اس نئے متشکل معاشرے میں یکجہتی کی توقع' پاکستان کی نظریاتی سرحدوں کے درمیان رہتے ہوئے' ایک فرد کو دوسرے فرد سے بھی نہیں۔ ایک نفسانفسی کا عالم ہے۔ جیسے پاکستان ابھی بالغ نہیں ہوا۔ خودستائی کے دور سے گزر رہا ہے۔ قوموں کی زندگی میں پچاس برس کا عرصہ ایک معمولی بات ہے۔ تاہم یہ سوچنا ضروری ہے کہ اب کارواں سے بچھڑے ہوئے اونٹ کو کسی نہ کسی کروٹ بیٹھ جانا چاہئے۔

دوسری طرف ہمارا ہمسایہ ملک بھارت ہے۔ جس کی تاریخ ہزاروں صدیاں پرانی ہے۔ اپنے تہذیب و تمدن پر بھارت کے عوام کو فخر ہے۔ اس کی سیاست مختلف النوع' مختلف النسل حملہ آوروں سے بھڑنے اور پھر مفتوح کی حیثیت سے زندگی بسر کرنے کے نتیجے میں وجود میں آئی۔ چنانچہ غلامی کے طویل عرصے نے نفسیاتی طور پر بھارت کو خوفزدہ کر رکھا ہے۔ اسے اپنی طرف بڑھنے والے ہر ہاتھ پر شک ہے خواہ وہ ہاتھ دوستی کا ہو۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ بھارت کے پاس گہرا سیاسی شعور اور معتبر سیاسی علم ہے۔ چانکیہ کے سیاسی "سکول آف تھاٹ" کو تمام دنیا کے سیاست کے طالب علم جانتے ہیں۔ چانکیہ کے خیالات سے متفق ہونا ضروری نہیں لیکن دنیائے سیاست کا ایک اہم سنگ میل تو اسے ماننا ہی پڑتا ہے۔ چانکیہ نے حکمرانی کے کچھ بنیادی اصول وضع کئے ہیں جن میں سے ایک اصول یہ ہے کہ

"پائے تخت کو مضبوط رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہمسائے سے دوستی نہ کرو بلکہ ہمسائے کے ہمسائے سے تعلقات استوار رکھو۔ اس طرح بہت سی سازشوں سے محفوظ رہو گے۔"

لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ بھارت کے اپنے ہمسایہ ممالک کے ساتھ تعلقات ٹھیک نہیں ہیں۔ ان ضمن میں ہم چین اور پاکستان کی مثال پیش کر سکتے ہیں۔ بھارت نے آزادی حاصل کرنے کے بعد نصف صدی گزرنے پر بھی' ان دو ممالک کے ساتھ خیر سگالی اور رواداری کا مظاہرہ نہیں کیا۔ یہ امر اپنی جگہ درست کہ کچھ بیرونی طاقتیں حالات کو جوں

کا توں رکھنے کے حق میں ہیں۔ برصغیر کے عوام آج بھی گورے کی چالوں کا شکار ہیں۔ اس کی رعایا ہیں۔ بے دام غلام ہیں۔

عالمی تاریخ کی سب سے بڑی جبری ہجرت کے بعد پچاس اکاون برس گزر جانے کے بعد یہ باور کر لینا فطری سی بات ہے کہ لوگوں کے جسموں اور ذہنوں پر لگے زخم مندمل ہو چکے ہوں گے کہ وقت از خود مرہم کا کام انجام دیتا ہے۔ شیخ اویس کے ذہن کی بھی یہی کیفیت ہے۔

اویس شیخ نے سوچا' غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ خطے میں امن و آشتی کے مسئلے کا حل ہماری اپنی مٹھی میں ہے۔ برصغیر کے عوام کو اس بند مٹھی کو کھلوانے کی جسارت کرنا ہوگی۔ عوام چاہیں تو اپنے رہنماؤں کی رہنمائی کر سکتے ہیں۔

"سمجھوتہ ایکسپریس" کا مسودہ پڑھتے ہوئے میرے علم میں اضافہ ہوا اور بہت سے حقائق سامنے آئے۔ مگر ساتھ ساتھ عجیب خیالات بھی آتے رہے کہ کتاب کا مصنف خواہ مخواہ بڑ ہانک رہا ہے یا کوئی دیوانہ بے تعبیر خواب دیکھ رہا ہے۔ پھر خیال آتا کہ کھلی آنکھوں خواب دیکھنا حقیقت کی تلاش کی طرف پہلا قدم ہوتا ہے۔

اویس شیخ کی مثبت سوچ سے انکار ممکن نہیں۔ ان کے خیال میں ایک دوسرے کے تشخص کو مجروح کئے بغیر برابری کی سطح پر دوستی قائم ہو سکتی ہے۔ دنیا بھر میں بے شمار ہمسایہ ممالک چانکیہ کی سیاست کے برعکس ایک دوسرے سے دوستی اور تعاون برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ وہ پرامن بقائے باہمی پر یقین رکھتے ہیں اور زندہ ہیں۔

اویس شیخ ان دونوں ممالک کی بیوروکریسی کو بھی "حالات جوں کا توں رکھنے" کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں اور اپنے تاثرات ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

"سفارتکار ایک ایسی دیوار ہیں جو بڑی پرسکون ہے۔ نہ پتھر مارتی ہے۔ نہ نعرے لگاتی ہے۔ لیکن اس کی ترقی بھی تو نہیں۔ اس نے دیوار ہی رہنا ہے۔ انسان اور دیوار میں یہی فرق ہے۔"

ہم عوام کسی کو بھی مورد الزام ٹھہرائیں۔ حالات کے ٹیڑھے پن کو دور کرنے کے

لئے عوامی سطح سے جدوجہد کا آغاز کیا جائے تو بہتر ہے۔ حکومتیں وہ کام نہیں کر سکتیں جو عوام کر لیتے ہیں۔ بظاہر خوش قسمتی سے آجکل دونوں طرف جمہوری حکومتیں ہیں۔ عوام کی رائے کا احترام ہونا چاہئے۔ وہ لوگ جو حالات کے دھارے کے ساتھ چلنا سیکھ چکے ہیں اگر وہ اپنی جنم بھومی یا ان گلیوں کو دوبارہ اپنی زندہ آنکھوں سے دیکھنا چاہتے ہیں یا بچپن کے ناسٹلجیا کی تسکین چاہتے ہیں اگر وہ سہولت سے ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر آجالیا کریں تو کسی حکومت کے پایہ تخت کو خطرہ لاحق نہیں ہونا چاہئے۔

اویس شیخ نے اپنے موقف کی وضاحت میں ایک ہندو اور ایک مسلمان کی ہجرت کی مثالیں پیش کی ہیں جنہیں پڑھ کر ایسی لاکھوں کہانیاں سامنے آتی ہیں۔ تاریخ کا اپنا ایک عمل ہے مگر تعلقات میں اعتدال لانے کی کوشش ضروری ہے تاکہ اللہ کی مخلوق کا بھلا ہو۔ امن و آشتی کا دور دورہ ہو۔

"سمجھوتہ ایکسپریس" کے مصنف اویس شیخ کی تمنا اور مخلصانہ تجاویز طرفین کے ذی شعور شہریوں کے دل کی آواز ہے۔

خدا ہم سب کو احترام آدمیت کی توفیق دے

فرخندہ لودھی

21 ستمبر 2008ء

امرتسر

امن مارچ۔ گولڈن ٹیمپل۔ جلیانوالہ باغ۔ امرتسر کے بازار۔
فرید کوٹ۔ تقسیم پنجاب اور مسلم سکھ فسادات۔

سمجھوتہ ایکسپریس لاہور ریلوے سٹیشن سے دھیرے دھیرے واہگہ بارڈر کی طرف رینگنے لگی۔ دل میں ایک عجیب کیفیت کا احساس تھا۔ ایک انہونا سا جذبہ جس میں خوف، تجسّس، محبت چھپی ہوئی تھی۔ ہم دونوں ملکوں کی سوچی سمجھی تباہی کے راستے کی طرف پیش قدمی (Mutually assurad Destruction) کے درمیان سے امن کا راستہ نکالنے نکلے تھے۔ ہمارا ہوشمند جذبہ خوف پر غالب آچکا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کچھ فتح کر لیا ہے۔ نفرتوں، دشمنوں اور بے یقینیوں کے سمندر پاٹ کر ایسا راستہ بنا لیا ہے جہاں سے مسافروں کے بہت سے قافلے گزریں گے۔ مسافر جو لمبے عرصے سے اپنے بچھڑے یاروں اور پیاروں کو ملنے کو ترس گئے ہیں۔ جو آج تک اپنا گھر بار عزیز دوست یاد کر کے روتے رہے ہیں۔ جو ایسے جو ہڑ دیکھنا چاہتے ہیں جہاں وہ بچپن میں سکول جاتے وقت تختی دھویا کرتے تھے۔ وہ درخت دیکھنا چاہتے ہیں جہاں سکول سے واپس گھر کو لوٹتے ہوئے اس کے سائے میں بیٹھ کر کھیلا کرتے تھے اور آم توڑ کر کھایا کرتے تھے۔ گھر کا وہ کمرہ دیکھنا چاہتے ہیں جہاں وہ پیدا ہوئے تھے۔ اس مٹی کی خوشبو سونگھنا چاہتے ہیں جہاں ان کا بچپن، لڑکپن اور جوانی گزری۔ وہ گلیاں اور بازار محلے کے وہ دوست ہم جماعت وہ سب کیسے ہوں گے کہاں ہوں گے ہمارا امرتسراب کیسا ہوگا۔

سب کچھ اک خواب ہی تو ہے۔ پچاس سالوں میں دونوں ملکوں کی حکومتوں نے عوام کو آپس میں ملنے نہیں دیا۔ ایک دوسرے کو سمجھنے نہیں دیا۔ مکالمہ نہیں کرنے دیا۔ ایک دوسرے سے سوال نہیں کرنے دئے۔ جواب نہیں لینے دئے۔ حکومتیں ڈرتی رہیں کہ عوام کو ملنے دیا تو ان کے مفادات ختم ہو جائیں گے۔ عوام کے درمیان مفاہمت اور سمجھوتہ ہوگیا تو غلط فہمیاں شکوک و شبہات بد اعتمادیاں دور ہو جائیں گی۔ پارٹیشن کے وقت دونوں ملکوں کے عوام ایک دوسرے کا گلا کاٹنے اور گھر بار جلانے پر شرمندگی کا اظہار کر کے ایک دوسرے سے معافی مانگ لیں گے۔ پھر وہ آپس میں مل بیٹھ کر اپنے اپنے ملکوں کے متنازعہ مسائل کا حل بھی ڈھونڈ لیں گے۔ جو اس خطے میں امن کے لئے ناگزیر ہے۔ اس طرح اسلحہ کی دوڑ ختم ہو جائے گی۔ عوام کی دوستی ہو گئی

تو اسلحہ کی خرید پر کمشن بند ہو جائے گا۔ فوجوں کی تعد پڑے گی۔ ڈیفنس
سکڑ جائے گا۔ پاکستان میں جہاد کے نام پر ٹریننگ کیمپ بند ہو جائیں گے ت میں
پاکستان کے خلاف انتہا پسند مذہبی پٹ بے اثر ہو جائیں گے۔ عسکری
مہم جو جنوبی جماعتیں چندہ کہاں سے کھائیں گی۔ بھارت میں را اسلام
خطرے میں پڑ ۔ سمگلنگ رک جائے گی تو سمگلر بھوکے مریں گے۔ ایجنسیا
ئیں گی تو ہزاروں خفیہ والے بے کار ہو جائیں گے۔ اسلئے بارڈر پر گرما گرمی قائم
جنگ کا سا ماحول رہنے دو اور عوام کو آپس میں نہ ملنے دو۔ کمیونیکیشن گیپ
رہے گا تو حکومتی کنٹرولڈ میڈیا سے جھو ڈہ جوں کا توں چلے گا اور کامیاب
گا۔ کون تصدیق کرے گا کہ سچ اور جھوٹ کیا ہے۔ یہاں کہو بھارت کے عوام
پاکستان نفرت کرتے ہیں۔ وہاں کہو پاکستان کے عوام بھارت سے نفرت کرتے ہیں۔
ایک وقت میں کتنے سارے خیالات بجا ان کرنے کے ساتھ
کے نہاں خانے ئے اور جب جھٹکے رین رکی تو معلوم ہوا یہ
ہے۔ یہاں ٹرین کسٹم کلیرنس کیلئے کئی گھنٹے رکے گ

یہ سات افراد فا و بھارت کی دعوت پر امرتسر میں بھارت کی پچاسویں
آزادی کی تقاریب میں لیے جا رہا تھا۔ ہمارے ساتھ پاکستان کے انگر اخبار
"دی نیوز" کے صحافی عارف شمیم اور ان عمرانہ یا تھیں۔
پاکستان اپنی یں سالگرہ 14 اگست 1997ء کو منا رہا تھا۔ جبکہ بھا
کی گولڈن جوبلی سرکاری طور پر 15 اگست کو منائی تھیں دونوں ملک ایک دن کے وقفے
سے اپنی اپنی آزادی کی تقاریب کا اہتما ہے تھے۔ ہماری تنظیم نے یہ منفرد
دیا کہ دونوں ملکوں کے عوام ایک دوسر ملک کی آزادی کی
میں شرکت کریں۔ ہم نے ایک
آزادی کے
ں شرکت کی ٹیم نے بھی ایک سو پاکستانی
رائے عامہ کے کے پروگراموں میں شرکت کے لئے

بلایا۔ جنوبی ایشیا کے باقی ملکوں کو بھی دعوت نامے بھیجے گئے۔ جنہوں نے نجوشی دونوں ملکوں کی تقریبات میں شرکت پر آمادگی ظاہر کی۔

پروگرام کے مطابق لاہور میں آزادی کی تقریبات میں دونوں ملکوں کے عوام کی شرکت کے موقع پر قومی گیت' علاقائی موسیقی اور کلچرل پروگراموں کے علاوہ دیگر موضوعات پر گروپ میٹنگ ہونا تھیں۔ جن میں "مذہبی رواداری' پاک بھارت تجارت' مسئلہ کشمیر' ماحولیات' جنوبی ایشیا سے اسلحہ کی دوڑ کا خاتمہ' خواتین کے حقوق' نیوکلیائی اور ایٹمی جنگ کی روک تھام وغیرہ شامل تھے۔

اس کے علاوہ دو کلو میٹر تک "امن ریلی" کا فیصلہ ہوا جس میں پاکستان اور بھارت کے عوام کے علاوہ سری لنکا' بھوٹان' مالدیپ' بنگلہ دیش' نیپال' افغانستان اور برما کے عوام نے بھی حصہ لینا تھا۔

سارک ملکوں کے سفیروں کو بھی شرکت کے لئے دعوت نامے بھیجے گئے۔ انہوں نے نہ صرف ان تقریبات میں شرکت پر آمدگی ظاہر کی بلکہ اپنے اپنے پیغامات بھی بھجوائے جو اس موقع پر شائع ہونے والے بروشر میں چھپے تھے۔ سیکرٹری جنرل سارک نے مجھے اپنے خط میں اس تقریب کے اہتمام پر پیشگی مبارک باد دی۔ پاکستان نیشنل اسمبلی کے سپیکر الٰہی بخش سومرو نے اپنے پیغام میں لکھا کہ دونوں ملک اپنی توانائیاں' پیسہ اور وقت تعمیری کاموں میں نہیں لگا سکے۔ وہ پچاس سالوں میں بھی اپنے مسائل حل نہیں کر سکے۔ جنوبی ایشیاء کے ملکوں کو آپس کے مسائل اور تنازعات حل کرنے میں عقل' فہم و ادارک' سوچ بچار اور معاملہ فہمی سے کام لینا ہوگا۔ جنوبی ایشیا ترقی میں بہت پیچھے رہ گیا ہے۔ نئی صدی میں داخل ہوتے وقت ہمیں بہتری کی طرف قدم بڑھانا ہوگا۔ جو باہمی اشتراک اور تعاون کے بغیر ممکن نہیں۔

میں سیکرٹری جنرل ساؤتھ ایشین فریٹرنٹی کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اور امن کے قیام کے لئے ان کی کوششوں کو سراہتا ہوں۔

سری لنکا کے ہائی کمشنر جنرل جی۔ ایچ۔ ڈی سلوا نے بھی اپنے پیغام میں نیک

تمناؤں کے اظہار کے ساتھ ہماری آزادی کی پچاسویں سالگرہ کی مبارکباد دی اور تقریبات کے مشترکہ انعقاد کی کامیابی کی دعا کی۔ بھارت کے لیڈ آف دی اپوزیشن (موجودہ وزیراعظم) اٹل بہاری واجپائی نے بھارت اور پاکستان کی آزادی کے جشن کو مشترکہ طور پر منانے پر مبارکباد کا پیغام بھیجا اور اسے قابل تعریف مثال قرار دیا۔ وزارت داخلہ نے ہمیں خط میں لکھا "وزارت داخلہ اس تقریب کے انعقاد کی حمائت نہیں کرتی" ہمیں تشویش لاحق ہوئی۔ میں نے اسلام آباد میں سپیکر الٰہی بخش سومرو اور سابق نگران وزیراعظم ملک معراج خالد سے ملاقات کی جو بے نتیجہ ثابت ہوئی۔ اسی دوران مسلح افواج کے رسالے "الہلال" نے اپنی اشاعت میں لکھا۔ "بھارت سے دوستی کے یرقان میں مبتلا گروہ کی ملک دشمن جسارتیں بڑھ رہی ہیں۔ مفت سیر سپاٹے اور شاپنگ کارسیا گروپ پاک فوج کو کمزور کرنا چاہتا ہے اور خود مختار کشمیر چاہتا ہے۔ ان کو لاکھوں کشمیریوں کی شہادتوں اور عورتوں کی پامال ہوئی عزتوں کی پرواہ نہیں۔ کشمیری بھائی مایوس نہ ہوں۔ پاکستانی ان کے لئے اپنا لہو بہاتے ہیں اور بہاتے رہیں گے۔ یہ گروہ بھارت کے ساتھ دوستی کی پینگیں بڑھانے کے عشق میں عرصے سے ہندوؤں کی منافقانہ فطرت' پاکستان کی نظریاتی اساس' قومی مفادات اور تحریک پاکستان کے دوران لاکھوں مسلمانوں کی ہندوؤں کے ہاتھوں شہادتوں اور پاکباز مسلمان عورتوں کی عصمتوں کو تار تار ہونے کو نظر انداز کر کے بھارت سے دوستی کے لئے دیوانے ہوئے جا رہے ہیں۔

یہ گروپ جو گانے بجانے والیوں کا رسیا اور ان کو کھلی چھٹی دلانے کے لئے بے چین نظر آتا ہے۔ مقبوضہ کشمیر میں ہندوؤں کے ہاتھوں ساٹھ ہزار شہید ہونے والوں' بھارتی درندوں کی گولیوں سے لاکھوں معزور ہونے والوں اور مسلمان عورتوں سے کھیلی جانے والی ہولی کو یہ گروپ اپنے پاؤں تلے روند کر اور کنٹرول لائن کو مستقل حیثیت دینے' حق خود ارادیت کے برعکس خود مختار کشمیر کے گن گاتا ہے۔ یہ گروپ مسئلہ کشمیر پر اوسلو پیکٹ جیسا معاہدہ چاہتا ہے۔ اس گروہ کے وطن دشمن ارکان سیر سپاٹے کے

شوق کی ذاتی تسکی فری شاپنگ کے سیمیناروں کے بہانے افواج پاکستان' جہاد کشمیر اور پاکست پر امن ایٹمی پروگرام کے خلاف تے سناؤ لھائی دیتے ہیں اور ان یں لوگ بھی شامل ہیں۔ جنہیں خو ج نے عہدے اور منصب عطا کئے اور جنہیں خداداد آج بھی پسند دے رہی لوگ پاکستان میں باکثرت پیدا ہو سنڈیول ے این جی اوز کے ہمنارو ں کے ذریعے اساس پاکستان اف زہر اگلتے ہیں۔ ان سیمیناروں سے جو غیر ممالک کے مذموم مقا ے کر کے ان سے کروڑوں روپے اینٹھ یی ں۔ وہاں یہ منصبدار بھی اپنی جیبیں نے ہیں۔ اگر ان نام نہاد دانشوروں کی عورتوں کی عزتیں بھی ایسے ر تار کی گئی ہوں جیسے کشمیری عو بھارتی فوج کر رہی ہے۔ تو کیا تب بھی یہ لروہ بھارت سے دوستی کا خواہاں ہو گا۔ ان تما کے باو ر ادران کشمہ کو ان کے پروپیگنڈہ م نہیں آنا چاہئے۔ اور یہ بات ذہن میں رکھنی ہئے کہ پا کے عوام 1948ء ی آزادی کے لئے اپنا خون بہا رہے ہیں اور یہ رہے گا۔ پاکستان کے جرات مند بیٹے کشمیر سیاچین اور ایٹمی پروگرام سمیت پاکستان کے ہر محاذ پر کسی ناشکرے پاکستانی یا غیر ملکی کو پاکستان کے مفادات کے ف کوئی اقدام نہیں کرنے دیں گے۔

جماعت اسلامی کے ایک ترجمان رسالے میں ایک تند و تیز مضمون ہمار ا جس میں مجھے ب ت بھارت ک کہا گیا۔

بھارتی دانشوروں کے جس وفد ز ہا ی آزاد ک تقریبات میں شرکت کرنا تھی اس میں بھارت کے چیف آف نیول سٹاف ، الق ہیف ٹس بمبئی ہائی کورٹ' پاک انڈیا فورم ' سابق وائس چانسلر' ص رٹری ساؤتھ ایشین فرینڈشپ۔ انڈیا' سکھ فورم دہلی کے صدر' قلم سر' صد شمی سوسائٹی جے رئین آل انڈیا و یلیج انڈسٹریز کمشن اور انٹرنیشنل اوڈیسی نامل تھے۔

پاکستان کے بعض اخبارات نے منفی پروپیگنڈہ کی طرح کی

خبریں تھیں۔

"غیر ملکی طائفوں کی پاکستان آمد اور پذیرائی انتہائی شرمناک ہے۔ یہ خیر سگالی کے نام پر کھلم کھلا بے حیائی ہے"

جماعت اسلامی پاکستان کے ڈپٹی سیکرٹری [redacted]

"گولڈن جوبلی تقریبات میں بھارتی اداکاروں اور رقاصاؤں کی شرکت قومی عزت [redacted] فی ہے"

روزنامہ نوائے وقت نے لکھا

"بھارتی طائفے کی آمد سے ملک [redacted] اشتعال پھیلے گا۔ پاکستان کے بعض دانشور اور ادیب قومی غیرت نیلام کر کے بھا[redacted] سے دوستی کرنا چاہتے ہیں۔ اس سے کشمیری مسلمانوں کے زخموں پر نمک پاشی ہوگی"

اسی دوران وزارت داخلہ کی طرف سے ایک اور خط ملا جس میں وہی الفاظ دہرائے گئے جو پچھلے خط میں لکھے گئے تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ ہمیں یہ تقریب منعقد کرنے سے کھلے الفاظ میں منع نہیں کیا گیا بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ حکومت اس کی حما[redacted] نہیں کرتی۔

ادھر دہلی میں پاکستانی ہائی کمشنر نے بھارتی مندوبین سے ان کے پاسپورٹ طلب کر [redacted] رت میں یہ تاثر پھیل گیا کہ پاکستان میں یہ تقریب منعقد ہو جائے گ[redacted] ایک اخبار نے لکھا کہ بھارت کے وزیراعظم آئی کے گجرال ذاتی طو[redacted] اس بات کے خواہشمند ہیں کہ دونوں ملکوں کی آزادی کی مشترکہ تقریب منعقد ہو۔ دہلی سے شائع ہونے والے ایک اخبار "عالمی خ[redacted]ار" نے یہ خبر نمایاں طور پر شائع کی۔

"بھارت، بنگلہ دیش، نیپال، بھوٹان، سری لنکا کے ڈیلی گیٹ سیکرٹری جنرل ستیہ پال کی قیادت میں 10 اگست کی رات کو بذریعہ ٹرین لاہور کیلئے روانہ ہوں گے۔ مشری اویس شیخ لاہور میں اس کیمپ کو آرگینائز کر رہے ہیں۔"

6 اگست تک پاکستان ہائی کمشن دہلی نے بھارتی مندوبین کو ویزے نہیں دیئے تھے

جس پر انہیں تشویش لاحق ہوگئی۔

میں نے لاہور میں پریس کانفرنس منعقد کی۔

"برصغیر پاک و ہند کی پچاسویں آزادی کی سالگرہ کا یہ اہم اور تاریخی موقع ہے جبکہ پاک بھارت خارجہ سیکریٹریوں کی سطح پر بات چیت کا یہ دوسرا اور بے حد اہم دور شروع ہو چکا ہے۔

پاک بھارت تعلقات میں گذشتہ پچاس سالوں میں زبردست کشیدگی' خوف' نفرت' بداعتمادی قائم رہی ہے۔ دونوں ملک تین جنگیں بھی لڑ چکے ہیں۔ اب پہلی دفعہ ایک سازگار ماحول پیدا ہونے کے امکانات ابھرے ہیں۔ جس میں فریقین کو اپنی اپنی فکسڈ پوزیشن سے نکل کر افہام و تفہیم کے ذریعے پر امن مذاکرات کر کے اپنے مسائل کا حل تلاش کرنے کا بہترین موقع میسر آیا ہے۔

ہم دونوں ممالک کو مبارکباد دیتے ہیں کہ انہوں نے اپنے مسائل کو جنگ کی بجائے پر امن مذاکرات کے ذریعے حل کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ دونوں ممالک کے وزرائے اعظم کے درمیان ہاٹ لائن قائم ہو چکی ہے۔ آپس کی بات چیت میں مسئلہ کشمیر بھی شامل رکھا گیا ہے۔ ہم آئی کے گجرال اور نواز شریف کی اس کے لئے کی جانے والی کوششوں کی حمائت کرتے ہیں۔

پاکستان کے عوام نے بھارت کے ساتھ مذاکرات کے عمل کو سراہا ہے۔ ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ باہمی اعتماد کو بڑھانے والے اقدامات کئے جائیں۔ کتابوں' رسائل' اخبارات کی ایک دوسرے کے ملک میں ترسیل پر پابندی ختم کی جائے۔ ویزہ کی پابندیاں نرم کی جائیں۔ دونوں ملک خطرناک اسلحہ بارڈر سے دور لے جائیں۔ تین سالوں میں افواج میں 25% کمی کی جائے میزائل بنانے کے پروگرام بند کئے جائیں۔ جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کیا جائے۔ جنوبی ایشیاء کے ممالک کے آپسی اختلافات ختم ہونے تک اس خطے سے غربت کا خاتمہ ممکن نہیں۔ ہم نے عوام کی سطح پر جنوبی ایشیا میں باہمی مفاہمت' اتحاد اور دوستی پیدا کرنے کے لئے کوششیں شروع کر دیں ہیں۔ دونوں ملکوں کے عوام

کی خاموش اکثریت امن چاہتی ہے۔ انکی دلی خواہش ہے کہ پاک بھارت تعلقات معمول پر آجائیں۔ لیکن اسلحہ فروش ایسا نہیں ہونے دیتے۔

ساؤتھ ایشین فریٹرنٹی۔ پاکستان نے دونوں ملکوں کی آزادی کے جشن کو مشترکہ طور پر منانے کا پروگرام بنایا ہے۔ جنوبی ایشیاء کے ملکوں کے 120 افراد ہماری آزادی کی تقریب میں شریک ہوں گے۔ پھر ہم سب لوگ واہگہ بارڈر کے راستے 14 اگست کی شام امرتسر چلے جائیں گے اور اگلے روز 15 اگست کو بھارت کی آزادی کے جشن میں شامل ہوں گے۔ ہمیں حکومت کی طرف سے یہ تقریب منعقد کرنے کی ابھی تک باقاعدہ اجازت نہیں ملی۔ ہم حکومت سے درخواست کریں گے۔ کہ ہمارے اس پروگرام کو کامیاب کرنے میں ہم سے تعاون کرے۔"

اس اپیل کا کچھ اثر نہ ہوا۔ ایک انگریزی اخبار میں میرا انٹرویو شائع ہوا جس میں میں نے وزارت داخلہ اور بیوریوکریسی کے دیگر کوارٹرز کی طرف سے فرینڈ شپ کیمپ پروگرام بلاک کرنے کی کوششوں کی مذمت کی۔

ہمارے تمام انتظامات دھرے کے دھرے رہ گئے۔ دونوں ملکوں کی اسٹیبلشمنٹ اور بیوریوکریسی نے یہ تقریب ناکام بنا دی۔ پاکستان نے عین وقت پر بھارتی وفد کے ایک سو ارکان کے ویزے روک لئے۔ ردعمل کے طور پر بھارت نے بھی ہمیں ویزے جاری نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔

اس تقریب کی ناکامی کی ذمہ داری زیادہ تر پاکستان پر عائد ہوتی ہے۔ اس سے پیشتر مارچ 97ء میں بھارت کی جانب سے امرتسر میں بیساکھی میلہ میں شرکت کیلئے دوسو پاکستانیوں کو دعوت دی گئی۔ مقررہ تاریخ سے چند روز پیشتر بھارت میں سیاسی عدم استحکام پیدا ہوگیا اور وزیراعظم دیوی گوڑا کی حکومت گر گئی۔ اس طرح ہمیں بھارت نے ویزے جاری نہ کئے۔ بیساکھی میلہ میں پاکستانیوں کی اتنی بڑی تعداد کو ملنے والی دعوت کو بھارتی وزیر خارجہ آئی کے گجرال کی آشیرباد حاصل تھی۔ لیکن بھارت کا ایک مخصوص طبقہ بھارت کی نرم ویزہ پالیسی اور تنازعات کے حل کے لئے مذاکرات کے

سلسلہ کو ناپسند کرتا تھا۔ امرتسر میں پاکستان سے بہتر تعلقات کے خواہشمند دو سو پاکستانیوں کی بیساکھی میلہ میں آمد کا شدید انتظار کر رہے تھے۔ پاکستانی وفد کے لئے موسیقی و دیگر خصوصی پروگرام تشکیل دئے گئے تھے۔

14 اگست کو بھارت کی ایک تنظیم CDF اور ہماری تنظیم SAF نے مل کر واہگہ بارڈر پر مشترکہ طور پر گولڈن جوبلی تقریب کا اہتمام کیا تھا۔ دونوں جانب کے سو سو افراد کو موم بتیاں لیکر رات بارہ بجے واہگہ بارڈر پہنچنا تھا۔ اس خبر کی اشاعت کے بعد ایک ہوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ حکمران جماعت کے ایک ایم۔ پی۔ اے نے اخباری بیان دیا کہ واہگہ بارڈر پر "ہند پاک رت جگا" کی اجازت نہیں دیں گے۔ شرانگیز تقریب کا انعقاد آزادی کے لئے لہو بہانے والے شہداء سے غداری کے مترادف ہے۔ برصغیر کے مسلمانوں نے انگریزوں اور ہندو سامراج کی مشترکہ مخالفت کا مقابلہ کر کے آزادی حاصل کی تھی۔ یہ تقریب پاکستان کے اساسی نظریئے کی نفی ہے۔ پاکستان اور بھارت کی یہ نام نہاد تنظیمیں پاکستانی عوام کے جذبات سے کھیل رہی ہیں۔ اگر کسی تنظیم یا ادارے نے گولڈن جوبلی کے موقع پر ایسی تقریب کا انعقاد کرنے کی کوشش کی تو لاہور کے غیر تمند اور محب وطن عوام ان کا گھیراؤ کریں گے۔

ہماری تنظیم کی رکن فریال علی گوہر نے مجھ سے کہا کہ ہمیں ہر صورت واہگہ بارڈر پر جانا چاہئے۔ ہم پاکستان کی سرزمین پر جہاں چاہیں جا سکتے ہیں۔ ایسا کوئی قانون نہیں جو ہمیں اپنی سرزمین پر موم بتیاں لیکر جانے سے روک دے۔

اگر آپ امن کے لئے کام کر رہے ہیں تو ڈٹے رہیں اور بالکل نہ گھبرائیں۔ میں نے تمام ممبران کو خطوط لکھ دئے کہ وہ 14 اگست کی درمیانی رات واہگہ بارڈر پر موم بتیاں لیکر پہنچ جائیں۔

11 اگست کو اخبار گارڈین کی نمائندہ نے مجھے لندن سے فون کیا اور میرا انٹرویو لیا۔ میں نے اس کے سوالوں کے جواب میں بتایا کہ ہم امن کے لئے کام کر رہے ہیں۔ ہم واہگہ بارڈر پر ضرور جائیں گے۔ ہم بھارت اور پاکستان کے عوام مل کر اپنی اپنی

حکومتوں پر ال رہے ہیں کہ پ مسئلے مذاکرات کے ذریعے حل کر لیں۔ ہم
دونوں ملکوں ام جنگ نہیں چاہتے۔ میں ایک وفد لیکر ا ں جا رہا ہوں جہاں
بھارت ا کی تقاریب میں شرکت ے۔
ہارڈین میں اس ن کی اشاعت کے بعد گ ت کو لاہور کی انتظامیہ نے
لیشن جاری کیا ہمیں واہگہ با جانے سے روک دیا گیا۔
ٹیفکیشن کی عبارت یہ تھی۔
مسلم تنظ ے واہگہ بارڈر پر جشن ب لگا دی گئی ہے ایسے کسی
پروگرام کی اجازت ا سکتے۔ جو تحریک پاکستان کے منافی ہو ا حب سے ملک
کے محب وطن عوام ہوتی ہو۔ باز نہ رہنے والی تنظیموں اف سخت
کاروائی کی جائے گی۔"

کے وزیراعلیٰ ۔ اپنے ساتھیوں کو نہیں جانے دیں گے اور
اقلیتوں کے لئے ی اقدامات کریں گے۔
اس نوٹ کی اشاعت کے بعد ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم اس پر عمل کریں گے
اور واہگہ بارڈر کا پروگرام ملتوی کر دیا گیا۔

میرے ایک دوست جو وزارت اطلاعات پاکستان کے اہم عہدے پر فائز ہیں اسلا
باد میں ایک ملاقات میں مجھ سے بحث میں الجھ گئے تھے۔ ان کا کہنا تھا۔ آپ کا
پروگرام انتہائی غلط بلکہ خطرناک ہے۔ پاکستان میں موجود وہ عناصر جو دونوں ملکوں کی
سرحدوں کو پھر سے ایک کر بات کرتے ہیں و ں اس طرح کی سرگرمیوں
سے اپنے حاصل کریں گے۔ بھارت تو پہلے ہی چاہتا پاکستان اور بھارت
کے درمیان یہ سرحد) ختم ہو جائے۔ میں نے ان سے کہا کہ ہم پاکستان کی آزادی اور
خود مختاری پر کبھی سمجھوتہ نہیں کر سکتے۔ ہم بھارت اور پاکستان کے عوام تو دراصل
ا ۔ دشمن سے لڑ رہے ہیں۔ اور وہ ہے غربت۔ 13. اگست کو بھارت
رے محصر سے وفد کو امرتسر میں لئے ویز ی کر دئے۔ اسی رات پاک

انڈیا پیپلز فورم کے رہنما ڈاکٹر مبشر حسن نے مجھے گھر پر فون کیا اور کہا کہ آپ امرتسر وفد لے کر نہ جائیں۔ آپ کہہ دیں کہ بھارتی لیڈروں کی طرف سے بیانات صحیح نہیں آرہے اس لئے ہم بھارت نہیں جائیں گے۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے معذرت کر لی۔

ہم ہر طرح کے خارجی اور اندرونی دباؤ' دھمکیوں اور گالیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے امرتسر روانہ ہو چکے تھے۔ ہماری روانگی کے دن روزنامہ نوائے وقت کے ایڈیٹر مجید نظامی کی تقریر اخباروں میں چھپی انہوں نے کہا تھا "کچھ بے غیرتوں کا بارڈر کے اس پار انتظار ہو رہا ہے"

واہگہ بارڈر پر چار پانچ گھنٹے کا صبر آزما وقت گزرنے کے قریب تھا۔ خفیہ ایجنسیوں کے ارکان جن کو ہمارے آنے کی پہلے سے اطلاع تھی۔ ہم سے پوچھ گچھ کر چکے تھے۔ کسٹم کے عملے نے ہمیں چند منٹوں میں فارغ کر دیا۔ ہم جیسے مسافروں پر وہ اپنا وقت ضائع نہیں کرتے۔ وہ سمگلروں اور پھیرے لگانے والوں سے اپنے معاملات طے کرتے ہیں۔

خدا خدا کر کے ٹرین اٹاری بارڈر کی طرف روانہ ہوئی۔ ٹرین بہت آہستہ رفتار سے چل رہی تھی۔ جوں جوں انڈین بارڈر قریب آرہا تھا۔ ٹرین میں بیٹھے مسافروں میں سنجیدگی' خوف تجسس اور دلچسپی کا احساس بڑھ رہا تھا۔ میری نظر ان کھیتوں پر تھی جو گاڑی کے دونوں اطراف پھیلے ہوئے تھے۔ ایک جگہ گاڑی بہت آہستہ ہو گئی۔ پھر بالکل رک گئی۔ معلوم ہوا کہ بھارت کی سرزمین شروع ہونے والی ہے۔ اب ٹرین آہستہ آہستہ رینگنے لگی۔ ایک جگہ بورڈ پر لکھا تھا۔ "Welcome India" آگے بڑھے تو ایک اور بورڈ پر نظر پڑی "Biggest Democracy in the World" اچانک دونوں جانب گھوڑوں کی چاپو کی آواز سنائی دی اور دیکھتے ہی دیکھتے گاڑی کے دونوں اطراف بھارتی سیکیورٹی کے گھڑ سوار گاڑی کے ساتھ گھوڑے دوڑاتے ہوئے چلنے لگے۔ انکی نظریں ڈبوں کے اندر بیٹھے مسافروں پر تھیں جو دم سادھے دلچسپی اور حیرت سے یہ منظر دیکھ

رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے جنگ لگ گئی ہے اور ہم سب قیدی بنا کر بیرکس میں لے جائے جا رہے ہیں۔ یہ منظر مجھے کبھی نہ بھولے گا۔ گاڑی کے دونوں جانب دور دور تک پھیلے ہوئے کھیتوں میں بھارت کے کسان کام کرتے ہوئے نظر آرہے تھے ان کھیتوں میں جگہ جگہ ہاتھ سے چلنے والے پمپ لگے ہوئے تھے۔ غالباً یہ پمپ ٹیوب ویل کے بھاری خرچے سے بچنے کیلئے لگائے گئے تھے۔

اٹاری بارڈر آچکا تھا۔ اس وقت شام کے 4 بجے تھے۔ یوں لاہور سے اٹاری بارڈر کا 30 منٹ کا سفر 7 گھنٹے میں طے ہوا۔

اٹاری ریلوے سٹیشن پر ہمارے استقبال کیلئے ساؤتھ ایشین فریٹرنٹی کے سیکرٹری جنرل ستیا پال، سیکرٹری امرتسر کمیٹی کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا رپو دامن سنگھ، اسٹنٹ کمشنر کسٹمز راجن چوہدری موجود تھے۔ ہم سب کسٹم آفیسر کے کمرے میں چلے گئے۔ گرمی اور اعصاب شکن ماحول نے ہمیں تھکا دیا تھا۔ ائرکنڈیشنڈ کمرے میں بیٹھ کر ہم نے اطمینان کا سانس لیا۔ اسی جگہ انڈین پریس اور ٹی وی والے پہنچ گئے تھے۔ جہاں انہوں نے ہم سے انٹرویو لیا۔ میرے علاوہ عمرانہ یاسمین اور عبدالرشید نون نے بھی انٹرویو دئے۔ اگلے روز کئی اخباروں میں یہ انٹرویو چھپے۔ زی ٹی وی نے اسی رات ہمارا انٹرویو نشر کیا۔ بھارت کے مشہور اردو اخبار ہند سماچار نے صفحہ اول پر میرا انٹرویو شائع کیا۔

"بھارت پاکستان کی بنیاد پرست و افسر شاہی دونوں دیشوں میں شانتی قائم کرنے میں رکاوٹ ہے۔ مسئلہ کشمیر حل ہو جائے تو دونوں دیشوں میں کوئی اختلاف ہی نہ رہے۔ ہم تو پاکستان سے امن کا پیغام لائے ہیں۔ اگر دونوں دیشوں کے دلوں کی آزادی کو ٹٹولا جائے تو دونوں دیشوں کے لوگ آپس میں سد بھاونا رکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن رکاوٹ ڈالنے والے اکثر پنتھی نیتا جو دونوں دیشوں میں موجود ہیں۔ وہ افسر شاہی کا سہارا لیکر دونوں دیشوں کو ایک ٹیبل پر بیٹھ کر بات چیت کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ بلکہ ایسے حالات پیدا کر کے خوشگوار حالات کو مزید الجھن بھرا بنا دیتے ہیں۔ دونوں دیشوں کی مالی حالت آپس کے بہتر تعلقات سے بہتر ہو سکتی ہے تو کسی دوسرے دیش کی پھٹو بن کر

دونوں میں سے کسی کو فائدہ نہیں ہونے والا ہے۔ ورلڈ بنک اور دوسری مالیاتی ایجنسیاں ان دونوں ملکوں کو امداد فراہم کر کے ہمیں اقتصادی طور پر غلام بنا رہی ہیں۔ بھارت پاکستان اور جنوبی ایشیا کے تمام ملکوں کو آپس کے معاملات بیٹھ کر حل کر لینے چاہئیں۔ ہتھیار بیچنے والے امریکہ اور دیگر ممالک ہمارے مسائل کو جوں کا توں رکھنا چاہتے ہیں۔

دونوں ملکوں کے پر دھان منتریوں (وزرائے اعظم) کی بات چیت کامیاب ہوئی ہے۔ شری گجرال نے جو پہل کی ہے تو پاکستان کے لوگ اس پر خوش ہیں۔ نتائج اچھے نکلے ہیں اور بنیاد پرستوں کے حوصلے پست ہوئے ہیں۔

جہاں تک پاکستان سرکار نے گولڈن جوبلی کے موقع پر بھارتی نیتاؤں کو پاکستان کا ویزہ نہیں دیا اور اس طرح بھارت سرکار نے بھی بعد میں پاکستانیوں کے ویزے روک لئے تو اس کے لئے میں پاکستان سرکار کو قصور وار ٹھہراتا ہوں۔ لیکن بھارت سرکار نے جو ہم 12 لوگوں کو ہی ویزہ دیا یہ بھی اچھی بات نہیں ہے یہ پچاس سالوں کے بعد مثال ہے جب بھارت پاکستان کے لوگ اکٹھے مل کر جشن آزادی منا رہے ہیں۔ ایک دوسرے سوال کے جواب میں شری اویس شیخ نے واضح کیا کہ کٹر پنتھی (بنیاد پرست) سیاسی سرکاروں پر دباؤ ڈال کر ان کو ایک دوسرے کے قریب نہیں آنے دینا چاہتے۔ ہم صرف واہگہ بارڈر پر روشنی کرنے نہیں آئے بلکہ بھارت کی آزادی کے جشن میں شرکت بھی کریں گے۔

واہگہ سرحد پر یوم آزادی کی شب پاکستان کی طرف سے کسی کے نہ آنے کے بارے میں پوچھے جانے پر شری شیخ نے کہا کہ اس سلسلہ میں پاکستان پر الزام تراشیاں کرنا غلط ہے۔ کیونکہ کچھ اندرونی وجوہات کی بنا پر ہی لوگ سرحد تک نہیں آپائے۔ ہم دونوں دیشوں کی سرکاروں پر دوستی کا ہاتھ بڑھانے کیلئے دباؤ ڈالنا جاری رکھیں گے۔ عمرانہ یاسمین نے بتایا کہ ہم امن چاہتے ہیں اس لئے پاکستان کی طرف سے عورتوں کی نمائندگی کرنے خود آئی ہوں عبدالرشید نون نے کہا پاکستان کے لوگ مسئلہ کشمیر کی وجہ سے تناؤ میں رہتے ہیں۔ اسے حل کرنا ہوگا۔"

امرتسر میں ہمارے تین روزہ قیام کے دوران سب سے اہم تقریب سیمینار تھا۔ جس میں بھارت کے طول و عرض سے ماہر تعلیم' دانشور' صحافی' وکلاء سماجی و سیاسی شخصیات' خواتین' طلباء اور مزدوروں کے نمائندے شامل تھے۔ اس کے علاوہ دیگر جنوبی ایشیائی ممالک کے نمائندہ افراد بھی موجود تھے۔ پاکستان کی نمائندگی کرتے ہوئے میں سٹیج پر موجود تھا۔ امرتسر کے ایک بزرگ لیبر لیڈر کی تقریر پاک بھارت تعلقات کی موجودہ صورت حال کے حوالے سے بہت اہم تھی۔ انہوں نے کہا

"میں آئی کے گجرال اور نواز شریف کو خراج عقیدت پیش کرتا ہوں جنہوں نے مثبت سوچ کے ساتھ آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا۔ جو لوگ' دانشور' سیاسی لیڈر بھارت میں بیٹھ کر یہ کہتے ہیں۔ کہ پاکستان اور بھارت پھر سے ایک ہو جائیں۔ لائن آف کنٹرول ختم کر دی جائے دونوں اگست 1947ء سے پہلے والی پوزیشن میں واپس آجائیں وہ خام خیالی میں بستے ہیں۔ وہ بھارت میں آئی کے گجرال اور پاکستان میں نواز شریف کے ہاتھ کمزور کر رہے ہیں۔ وہ بھارت کے دشمن ہیں۔ یہ بات ہمارے کہنے کی نہیں۔ ایسی آواز ادھر سے آئے تو اور بات ہے۔ بھارت سے ایسی آواز سخت نقصان دہ ہے۔ بلکہ وہ دونوں ملکوں میں مزید کھچاؤ اور بداعتمادی پیدا کرے گی۔ ہم کہتے ہیں پاکستان ایک آزاد اور خود مختار ملک ہے۔ ہمیں اس کی آزادی دل سے قبول ہے۔ پاکستان اقتدار اعلیٰ کا مالک ہے۔ بھارت کو اسی حیثیت کے ساتھ دیگر آزاد اور خود مختار ملکوں کی طرح اپنے تعلقات پاکستان کے ساتھ استوار رکھنے ہیں۔"

میں نے اپنی تقریر میں پاکستان کے عوام کی جانب سے بھارت کے عوام کو آزادی کی پچاسویں سالگرہ پر مبارکباد دی۔ بھارت میں ہمیں اس کی گولڈن جوبلی تقریبات میں شرکت کی دعوت دینے پر شکریہ ادا کیا اور کہا:

"پاک بھارت پچاس سالہ تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ دونوں ملکوں کے عوام مل کر آزادی کی تقریب منا رہے ہیں۔ اگرچہ آپ حضرات کو ہماری حکومت نے آخر وقت میں ویزے نہ دئے تاہم میں اس کیلئے بے حد معذرت خواہ ہوں۔ آپ کی محبتیں

اور خلوص پاکستانی عوام کو پہنچاؤں گا۔ ہم یہاں صرف واہگہ بارڈر پر روشنیاں کرنے نہیں آئے بلکہ بھارت کی آزادی کی گولڈن جوبلی تقریبات میں شرکت کرنے بھی آئے ہیں۔ آپ کی حکومت نے رد عمل کے طور پر ہمارے سو افراد کے ویزے بھی روک لئے۔ کم از کم آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ دراصل دونوں ملکوں کی بیوریوکریسی نے مل کر اپنے روائتی رویوں کی بنا پر اس منفرد اور تاریخی تقریب کا انعقاد نہ ہونے دیا۔ جب مجھے سپیکر قومی اسمبلی پاکستان الٰہی بخش سومرو کا پیغام موصول ہوگیا جس میں انہوں نے فرینڈشپ کیمپ کے لاہور میں انعقاد کی تعریف کی تو میں کافی مطمئن تھا کہ پاکستان کی حکومت اور حکمران جماعت مسلم لیگ کے اہم لیڈر نے حکومت کی پالیسی واضح کر دی ہے اور اب بھارتی مہمانوں کو ویزے مل جائیں گے۔ اسی اثنا میں جناب اٹل بہاری واجپائی کا پیغام بھی موصول ہو چکا تھا۔ لیکن پھر آخر کیا وجہ ہوئی۔ کیوں بھارتی دانشوروں کو وقت پر ویزے نہ مل سکے۔ اس کی ذمہ داری دونوں ملکوں کی بیوریوکریسی پر ہے۔ آئی کے گجرال یا نواز شریف پر نہیں۔

میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ غلط فہمیاں اور بداعتمادیاں وہیں جڑ پکڑتی ہیں جہاں آپس کے رابطوں کا فقدان ہو۔ کمیونیکیشن گیپ ہو۔ اس طرح جو خلاء پیدا ہوتا ہے۔ وہی سب سے بڑا ہتھیار ہوتا ہے ان قوتوں کیلئے جو حالات کو جوں کا توں رکھنا چاہتی ہیں۔ جو چپقلش (Confrontation) کو قائم اور جاری رکھنے کے حق میں ہیں۔ اس لئے میں نے اور جناب ستیاپال نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس خلاء کو پر کیا جائے اور عوامی رابطوں کو تیزی کے ساتھ بڑھایا جائے۔ اس طرح لوگ سچائیوں اور حقیقتوں کو قریب سے دیکھ سکیں گے۔ دونوں ملکوں کے ذرائع ابلاغ اور حکومتوں و سیاستدانوں کے جھوٹ پر مبنی منفی پروپیگنڈہ اور مذہبی لیڈروں کے عسکری بیانات کا کھوکھلا پن ظاہر ہو جائے گا۔

ہم امن کے راستے پر چل نکلے ہیں۔ دونوں ملکوں کے ان چند سو لوگوں کے ساتھ کروڑوں عوام کی خواہشیں' امیدیں' تمنائیں اور دعائیں شامل ہیں۔ خاموش اکثریت

طاقت کا روپ دھار کر ایک دن مٹھی بھر جنگجو لوگوں کو خاموش کر دے گی۔ برصغیر کے عوام کی قسمت کا ستارہ ضرور چمکے گا۔ غربت اور بیماریوں کا خاتمہ ہوگا۔ پاکستان اور بھارت کشمیر کے مسئلے سمیت اپنے تمام جھگڑے طے کر لیں عوام کے پاس حکومتوں کو دینے کیلئے وقت کم ہے۔ عوام اپنی اپنی حکومتوں کی مدد کریں گے۔ حکومتیں عوام کے تعاون سے ہی تمام مسئلے حل کر سکتی ہیں۔"

ان خیالات کے اظہار کے بعد میں نے صاحب صدر سے پنجابی میں تقریر کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ سٹیج پر بیٹھے دو تین افراد نے ایک ساتھ کہا ضرور جی ضرور

صدر جلسہ نے کہا "تسی تقریر پنجابی وچ ای کرو جی۔"

میں نے کہا "جدوں میں امرتسر وچ آن لگا تے میرے ماں پیو بہت خوش ہوئے۔ میرے ماں پیو اتھے ای پیدا ہوئے سن۔ او امرتسر دے محلے کٹڑہ ماہن سنگھ ڈ ہگراں دی گلی وچ رہندے سن۔ اونا کیہا کہ ساڈا محلہ تے ساڈا گھر ضرور دیکھیں۔ میں اک سکھ بھرا نوں کیہا کہ میں نوں اوتھے لے جا۔ تے اونے کیہا کہ او محلہ تے گھر ویخ کے کیہ کرو گے۔ میں کیہا بھئی میرے ماں پیو دی خواہش اے۔

تقریر کے بعد جب میں واپس اپنی جگہ بیٹھا تو میرے ساتھ بیٹھے ایک باریش مسلمان شخص نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ میں جماعت اسلامی ہند کا جنرل سیکرٹری ہوں۔ آپ نے بہت اچھی تقریر کی۔ آپ کی باتوں میں سچائی اور حقیقت پسندی نے ہمیں متاثر کیا ہے۔ میں بہت خوش ہوا کہ جماعت اسلامی ہند بھارت کی سیاسی و معاشرتی زندگی میں سرگرم کردار ادا کرتی ہے۔

تقریب کے بعد میں شرکاء کی توجہ کا مرکز رہا۔ خاص طور پر سکھ حضرات میں خاصا پاپولر ہوگیا۔ ایک سردار جی نے کہا جب آپ نے پنجابی زبان میں اپنے والدین کی خواہش کے مطابق اپنا پرانا گھر اور محلہ دیکھنے کی بات کی تو ہماری آنکھوں میں آنسو آگئے۔

اگلے روز کیمپ میٹنگ میں مختلف کمیٹیاں بنائی گئیں جنہوں نے اپنے اپنے اجلاس

منعقد کئے اور تجا[illegible] ب کیں اور اپنی اپنی رپورٹیں جنرل ہاؤس اجلاس میں پیش کیں جنہیں رد و بدل اور نئی تجاویز کے ساتھ اتفاق رائے سے منظور کیا گیا۔

مختلف کمیٹیوں نے [illegible]ہ موضوعات پر اجلاس [illegible]ئے۔ کشمیر' خواتین کے [illegible]' انسانی حقوق' قانون اور اس کی عملداری' مذہبی رواداری [illegible]نگ کی روک لحہ کے پھیلاؤ کا خاتمہ' ثقافتی ہم آہنگی' جنوبی ایشیاء میں تعاون [illegible]ہ کار۔

کیمپ میٹنگ میں یہ [illegible]جویز پیش کی کہ مشترکہ امن مارچ کیا جائے۔ اس تجویز کو پسند کیا گیا اور اگلے روز کیمپ [illegible]ختام پر آزادی کی اس منفرد تقریب میں تمام شرکاء نے بینر اٹھالئے۔ تین سو افراد نے چار کلومیٹر تک امن [illegible]ے جلوس میں شرکاء تمام راستے نعرے لگاتے رہے

"امن کے دو نشان - بھارت اور پاکستان

"جنگ نہیں امن" "تیری آن میرا [illegible] پاکستان"

کئی چوراہوں اور ہجوم والی جگہوں پر جلوس [illegible]ے [illegible]مین اور اہم افراد پر جوش انداز میں تقاریر کرتے رہے۔ میں نے بھی ایک چوراہے پر جلوس کے شرکاء سے خطاب کیا۔

جلیانوالہ باغ

آج 78 سال بعد پاکستان اور سارک ملکوں سمیت بھارت کے 22 صوبوں سے آئے ہوئے مندو[illegible] نوالہ باغ میں جمع تھے۔ یہ باغ چاروں جانب سے بلند دیواروں میں گھرا ہوا ایک میدان ہے۔ جس میں آنے جانے کیلئے صرف [illegible] دروازہ ہے۔ باغ کے [illegible]خل ہونے کیلئے ایک "نسبتاً" تنگ راہداری سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ باغ برصغیر کی آزادی کی تاریخ [illegible] حصہ بن چکا ہے۔

1917ء کے اختتام پر [illegible]ند نے ایک عدالتی کمیٹی قائم کی [illegible]، کنگز بینچ کی

نمائندگی مسٹر جسٹس رولٹ نے کی۔ وہ اس کمیٹی کے سربراہ تھے۔ جب کہ ہندوستان کے دو اور جج اس میں شامل تھے۔ اس کمیٹی کا مقصد ہندوستان میں انقلابی تحریک کی آڑ میں مجرمانہ سازشوں کو بے نقاب کرنا اور ان مشکلات کا جائزہ لینا تھا جو منفی سرگرمیوں سے پیدا ہو رہی ہیں۔ نیز ان جرائم کو کچلنے کیلئے قانون ساز اداروں اور حکومت کی مدد کرنا۔ 1918ء کو اس کمیٹی نے اپنی سفارشات پیش کیں بعد میں ہندوستان کی مجلس قانون ساز میں رولٹ بل کے نام سے دوبل پیش کیے گئے۔ ایک بل اسلحہ ایکٹ کے بارے میں عارضی قانون سازی کیلئے تھا۔ دوسرا بل کافی سخت قانون سازی کیلئے پیش کیا گیا۔ جس کا مقصد ہندوستان کے تعزیری قوانین میں مستقل اور کڑی تبدیلیاں کرنا تھا۔ ہر مجلس قانون ساز میں اس بل پر کڑی نقطہ چینی کی گئی۔ کانگریس نے اس بل کو رد کر دیا اور کہا کہ اس سے ہندوستانی عوام کے بنیادی حقوق پر زد پڑے گی اور رائے عامہ کے صحت مند فروغ کی راہ مسدود ہو جائے گی۔

قائداعظم ان دنوں امپیریل لیجسلیٹو کونسل کے ممبر تھے۔ انہوں نے بطور احتجاج استعفے دے دیا۔ گاندھی جی نے 6 اپریل کو کل ہند ہڑتال کا اعلان کر دیا۔ جس پر عوام نے بھرپور لبیک کہا۔ گاندھی نے یہ اپیل بھی کی کہ کسی طرح کا تشدد نہ کیا جائے۔

امرتسر میں حالات حد سے زیادہ بگڑ گئے۔ پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر سر مائیکل او ڈائر نے دو مقبول رہنما ڈاکٹر ستیہ پال اور ڈاکٹر کچلو کو شہر بدر کر دیا۔ جس پر ہنگامے شروع ہوگئے۔ گاندھی کی پر امن احتجاج کی اپیل کارگر ثابت نہ ہوئی۔ اور برطانوی سرکار کے حفاظتی دستوں سے احتجاجی مارچ کرنے والوں کا ٹکراؤ ہوگیا۔ حفاظتی دستوں نے گولی چلا دی جس سے 3 افراد جاں بحق اور متعدد زخمی ہوگئے۔ مجمعے نے ہلاک زدگان کی لاشیں اٹھا کر شہر میں ماتمی جلوس نکالا اور راستے میں نیشنل بنک کی عمارت کو آگ لگانے کے ساتھ ساتھ اس کے یورپی مینیجر کو ہلاک کر دیا۔ پورے دن میں مشتعل ہجوم نے 5 انگریزوں کو مارنے کے علاوہ ریلوے گوداموں اور کئی سرکاری عمارتوں کو نذر آتش کر دیا ان حالات کے پیش نظر امرتسر میں مارشل لاء لگا دیا گیا اور جنرل ڈائر کو

مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر مقرر کر دیا گیا۔

اپنے عہدے کا چارج لینے کے بعد جنرل ڈائر نے شہر میں جلسے جلوسوں پر پابندی لگادی۔

13 اپریل کو ہندوؤں کا سال نو کا تہوار منایا جاتا ہے اس موقع پر ایک جلسہ عام کا اہتمام جلیانوالہ باغ میں کیا گیا۔ جنرل ڈائر فوج کی پوری بٹالین لیکر وہاں پہنچ گیا اور خبردار کئے بغیر عوام پر اندھا دھند گولیاں چلانے کا حکم دے دیا۔ اس المناک واقع میں 500 سے زائد افراد ہلاک اور 1000 سے زائد شدید زخمی ہوئے۔ بھگدڑ مچنے پر بہت سے لوگ اپنی جانیں بچانے کیلئے باغ کے اندر موجود کنویں میں کود گئے۔ بعد میں وہاں سے ایک سو بیس لاشیں نکالی گئیں۔ زخمیوں کو تڑپنے کے لئے رات بھر وہیں رہنے دیا گیا۔ طبی امداد تو درکنار پینے کے لئے دو گھونٹ پانی بھی نہیں دیا گیا۔ انسانی تاریخ میں ظلم اور جبر کا یہ گھناؤنا، مکروہ اور بھیانک واقع تھا۔

"جناح اور گاندھی" کے مصنف ایس کے موجمدار نے اپنی کتاب کے صفحے 83 پر لکھا ہے "اس موقع پر ایک انگریز عورت کی آبرو ریزی کی گئی۔ جس سے انگریزوں میں مزید تشدد بھڑک اٹھا۔ اس مقام پر مزید سپاہی متعین کئے گئے اور یہاں سے گزرنے والے ہر ہندوستانی کو نہایت ہی غیر انسانی انداز میں رینگنے اور پیٹ کے بل چلنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ حکومت نے گاندھی اور ان کی خاموش مذاہمت پر تمام الزامات عائد کرتے ہوئے انہیں تمام سانحوں کا براہ راست ذمہ دار ٹھہرایا اور وارننگ دی کہ وہ اپنی سرگرمیاں فورا" بند کر دیں۔ گاندھی نے 21 جولائی 1919ء کو ایک اخباری بیان کے ذریعے اپنی تحریک کو واپس لے لیا۔"

جلیانوالہ باغ کا سانحہ برطانوی استعمار اور حریت پسند ہندوستانی عوام کے صبرواستقلال کی بے مثال داستان ہے۔ اس واقعہ کے بعد ہندوستانی سیاست کا رخ تبدیل ہوگیا۔ اس میں مذاحمت جارحیت اور بغاوت آئی اور انگریزوں سے اپنے ملک کو آزاد کرانے کے لئے جوش اور جذبہ بیدار ہوا۔

جلیانوالہ باغ کے خونچکاں واقعے میں مسلمان بھی شامل تھے۔ ا۔ میں ڈاکٹر سیف الدین [illegible] ڑ بشیر احمد کا حصہ بھی ہے۔ ہندوستانیوں کو اس بات [illegible] نگوار حیرت ہوگی کہ جلیانوالہ با [illegible] سنایا جاتا۔

جلیانوالہ باغ میں عوام پر چلائی گئی گولیوں نے نشانات کو [illegible] لوہے کی گول رنگ میں محفوظ کیا گیا ہے۔

دوسری بار جب [illegible] دہلی سے لاہور واپس آرہا تھا تو ہمارے پاس امرتسر کا ویزہ نہیں تھا۔ اٹاری بارڈر پر ہماری ٹرین کو پانچ گھنٹے ٹھہرنا تھا۔ وفد میں شامل [illegible] ں نے امرتسر دیکھنے کی خواہش [illegible] ار کیا۔ میں نے اسٹنٹ کمشنر کسٹمز راجن چوہدری سے پاکستانی وفد کے شرکاء [illegible] کا ذکر کیا اور کہا کہ ہمیں گولڈن ٹیمپل اور جلیانوالہ باغ دیکھنے کا موقع دے دیں۔ ہم میں سے [illegible] مرتسر کبھی نہیں دیکھا۔ [illegible] اچھے اخلاق کے وضع دار انسان [illegible] انہوں نے امرتسر میں امن [illegible] پر بات کی۔ کہا کہ اگر وہ رضامندی ظاہر کر دیں تو وہ انہیں اپنی ذمہ داری [illegible] رجانے کی [illegible] دے سکتے ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے ہمیں خوشخبری سنائی کہ [illegible] میں اپنے ایک آفیسر کے [illegible] ج رہا ہوں اپنے [illegible] پورٹ ادھر ہی رکھدیں اور صرف جلیانوالہ باغ اور گولڈ [illegible] دیکھ کر واپس آ [illegible] ی جگہ سے کوئی شاپنگ نہ کریں۔ ہم سب بہت خوش تھے۔

گولڈن ٹیمپل دیکھنے [illegible] د جلیانوالہ باغ پہنچے۔ آدھ گھنٹے تک اس تاریخی جگہ کا ایک آ [illegible] دیکھتے رہے۔ ا [illegible] لی اور ظلم کا باب آج بھی [illegible] ود ہے [illegible] لے منہ پر طمانچہ [illegible] کتنی قر [illegible] نی پڑتی ہ [illegible] ت آزاد ہے۔ غلامی اور آزادی میں بڑا فرق ہ [illegible] ندھی جی [illegible] ن الفاظ کو بھول چکا ہے جو آزادی کے مفہوم اور مقصد [illegible] کرتے ہیں۔

میں آزادی کا مطلب صرف انتقال اقتدار نہیں لیتا۔ کہ برطانوی سامراج چلا جائے

اور اس کی جگہ چند دولتمند لوگ ہم پر حکمران بن بیٹھیں۔ میں آزادی اسے سمجھتا ہوں کہ ہر بھارتی باشندہ محسوس کرے، تجربہ کرے اور جان جائے کہ وہ آزاد ہے۔ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائے اور اقتصادی خود انحصاری حاصل کرلے"

جلیانوالہ باغ سے واپس آتے ہوئے تنگ راہ داری سے گزرتے وقت اچانک ہمارے وفد کے ایک رکن ڈاکٹر عمر خان کی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ سب لوگ پریشان ہوگئے کہ یہ کیسے ہوگیا وہ تو ہمارے ساتھ ساتھ چل رہے تھے اور معمولی سی ٹھوکر بھی نہ لگی تھی۔ میں نے انہیں سہارا دیکر نیچے بٹھایا۔ ان کا رنگ زرد ہوگیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کی حالت غیر ہونے لگی۔ یوں لگا جیسے کوئی انہونی آفت آگئی ہے اور ہم سب کسی مشکل میں پھنسنے والے ہیں۔ ہمارے پاس امرتسر کا ویزہ نہیں تھا۔ اب کیا ہوگا۔ لیکن ان سب تفکرات سے ماورا ڈاکٹر صاحب کی جان کی فکر تھی۔ خوش قسمتی سے قریب ہی پانی موجود تھا۔ ہارون شیخ اور عابد اقبال ایڈووکیٹ پھرتی سے لپکے اور قریب کی دوکان سے پانی کا جگ اور سوڈے کی بوتلیں لے آئے جنہیں پی کر ڈاکٹر صاحب کی حالت سنبھل گئی انہیں ڈی ہائیڈریشن ہوگئی تھی۔ بعد میں انہوں نے بتایا کہ ان کی ٹانگ کا آپریشن ہوا تھا اور اس کے اندر سریا لگایا گیا تھا جو زیادہ چلنے کی وجہ سے نکل گیا اور ٹانگ پھر سے ٹوٹ گئی۔ اسی دوران وہاں پولیس کے ایک دو سپاہی آگئے اور لوگ اکٹھا ہونے لگے۔ ہم نے انہیں بتایا کہ ڈاکٹر صاحب گر گئے ہیں اور کوئی بات نہیں۔

ایک گھنٹے کے بعد ہم سب واپس اٹاری پہنچ چکے تھے۔ وہاں تین گھنٹے تک اور رکنا پڑا اور پھر پاکستان سے واہگہ بارڈر پر بھی چار گھنٹے ٹرین رکی رہی۔ رات دس بجے کے قریب ہم لاہور ریلوے سٹیشن پہنچے۔ ڈاکٹر عمر خاں کے اندر بے پناہ حوصلہ صبر استقامت اور قوت برداشت پر ہم حیران تھے۔ آٹھ گھنٹے کے طویل سفر، انتظار اور اعصاب شکن ماحول سے گزر کر ٹوٹی ہوئی ٹانگ کے ساتھ واپس آجانا کسی معجزے سے کم نہ تھا۔

گولڈن ٹیمپل

امرتسر کی مشہور اور تاریخی عمارت گولڈن ٹیمپل سکھوں کی مذہبی عبادت گاہ ہے۔ اسے سکھ مذہب کے پانچویں گرو ارجن دیو نے تعمیر کروایا تھا۔ گرو ارجن دیو پنجاب کے مشہور صوفی بزرگ حضرت میاں میر کے دوست تھے۔ اس کا افتتاح انہی کے ہاتھوں سے ہوا۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت مذہبی رواداری کا دور تھا اور صوفیار مذہب کو انسانوں کی تقسیم کے لئے استعمال نہیں کرتے تھے نہ ہی مذہب کی زرہ بکتر پہن کر نفرتیں پھیلاتے تھے۔

گولڈن ٹیمپل میں داخلے کے لئے کوئی رکاوٹ نہیں۔ دربار صاحب کے اندر داخل ہونے کے چار گیٹ ہیں جو باہر مارکیٹ کی طرف کھلتے ہیں۔ گھنٹہ گھر' باباٹل' سرائے والا اور ٹھاڈا صاحب۔ اندر داخل ہونے سے پہلے دروازے کی سیڑھیوں کے نیچے بہتے ہوئے صاف شفاف پانی میں پاؤں دھونا ضروری ہے۔ سر پر ٹوپی یا رومال رکھنا لازمی ہے۔ یہ رومال اور ٹوپی دروازے پر ہی بلا قیمت مل جاتے ہیں۔ ہمارے ساتھ ہی دو غیر ملکی خواتین تنگ جینز پہنے ہوئے اندر داخل ہونے لگیں تو دروازے پر موجود شخص نے انہیں روک دیا اور کہا کہ اپنے سروں کو ڈھانپ لیں اور پاؤں دھو کر اندر داخل ہوں۔ اس نے یہ بھی کہا کہ جس جگہ انکی مقدس کتاب پڑھی جاتی ہے وہاں انہیں جانے کی اجازت نہیں۔

گولڈن ٹیمپل وسیع و عریض جگہ پر مشتمل ہے۔ اندر داخل ہوتے ہی دائیں جانب سیڑھیاں چڑھ کر بالائی منزل پر لنگر جاری رہتا ہے۔ یہاں ہر وقت زائرین اور سیاحوں کیلئے مفت کھانے کا انتظام ہے۔ ایک سکھ نے بتایا کہ دربار صاحب کے تمام انتظامی اخراجات اور لنگر وغیرہ لوگوں کے چندے سے چلتا ہے جو رضا کارانہ دیا جاتا ہے۔ لوگوں کے نذرانوں اور عقید تمندوں کی محبتوں سے گولڈن ٹیمپل کی دنیا آباد ہے۔ ہم

سب نے بھی یہیں سے لنگر کھایا۔

ٹیمپل پر سونے کا خول چڑھا ہوا ہے۔ جب سورج کی روشنی گنبد پر پڑتی ہے۔ تو یہ پر شکوہ عمارت بے حد خوبصورت لگتی ہے۔ دربار صاحب کے اندرونی حصے کی خوبصورتی بھی لاجواب ہے۔ اندرونی دیواروں پر قیمتی پتھر جڑے ہوئے ہیں اور مینا کاری سے اس کی چھت اور دیواروں کو سجایا گیا ہے۔ مختلف رنگوں کے حسین امتزاج سے ان قیمتی پتھروں پر گلکاری کر کے اور بیل بوٹے بنا کر فنی مہارت کا نادر نمونہ پیش کیا گیا ہے۔

دربار صاحب کے چاروں جانب خوبصورت تالاب ہے۔ جس میں صاف شفاف پانی ہے۔ جو دربار صاحب کی پاکیزگی' خوبصورتی اور وقار میں اضافہ کرتا ہے۔ چاند رات کو جب چاند کی روشنی کا عکس تالاب پر پڑتا ہے تو یہ جگہ پریوں کا دیس معلوم ہوتی ہے۔

دربار صاحب کے اندر سکھوں کی مقدس کتاب "گرو گرنتھ صاحب" چوبیس گھنٹے پڑھی جاتی ہے۔ خواتین مرد بچے بوڑھے جوان انتہائی عقیدت و احترام کے ساتھ اس کی تلاوت کرتے ہیں۔

جون 1984ء میں بلوسٹار آپریشن کے دوران بھارتی فوج نے اسے گھیرے میں لے لیا۔ مسلح سکھ گوردوارے کے اندر مورچہ بند ہوگئے۔

بھارتی فوج کے ساتھ ان کا مسلح تصادم بھی ہوا۔ فوج نے گولیاں چلائیں جس سے ٹیمپل کو شدید نقصان پہنچا۔ اسی سال اسے دوبارہ تعمیر کر دیا گیا لیکن ٹیمپل کے اندر جانے والے "اکال تخت گیٹ" کو ویسے کا ویسے ہی چھوڑ دیا گیا تاکہ یہ بتایا جا سکے کہ بھارتی افواج نے اس مقدس جگہ پر قبضہ کر کے اس کی بے حرمتی کی اور اسے نقصان پہنچایا۔

بلیو سٹار آپریشن کے تین ماہ بعد بدلہ لینے کے لئے اس وقت کی بھارتی وزیراعظم آنجہانی اندرا گاندھی کو اس کے ایک سکھ محافظ نے گولی ماردی۔ جس پر تمام بھارت میں شدید رد عمل ہوا اور ہندوؤں نے کئی سکھ قتل کر دئے۔ سکھوں کی طرف سے اپنا

الگ صوبہ بنانے کا زور پکڑ گیا۔ جس نے ایک تحریک کی صورت اختیار کر لی۔
پاکستان میں اس وقت جنرل ضیاء الحق [illegible] تھے۔ ضیاء الحق [illegible] ت چوہدر
ظہور الٰہی مرحوم نے لاہور میں اپنی [illegible] گاہ [illegible] سکھوں [illegible] میں بڑ
سرگرمی دکھانی شروع کر دی۔ اس کے پس پ [illegible] حکومت کی حمائت حاصل تھی۔
بھارتی حکومت [illegible] ام لگاتی رہی کہ پاکستان [illegible] لو ٹرینڈ [illegible] پنجاب میں
تخریبی کاروائیوں [illegible] سے [illegible] ھ [illegible] ن اس کی تردید کرتا رہا۔ تاہم اس صور
حال سے پاکستان نے فائدہ ا [illegible] کی۔ دراصل ایسی کاروائی سرد جنگ کا حص
[illegible] نمول کی بات ہے۔ دونو [illegible] پاس سال [illegible] ایک دوسرے ک [illegible] ں
[illegible] اٹھا کر اسے کمزور کرنے گرانے یا نیچا دکھانے کے مواقع ہاتھ سے نہیں جانے
دیے۔ دونوں ملک [illegible] [illegible] ہی [illegible] ں میں [illegible] تے آرہے ہیں۔
بے نظیر کے [illegible] اس پر [illegible] ا کہ اس [illegible] لھوں کے مسئلے پر
بھارتی حکومت کی [illegible] ہے اور اپنے ایک سرکردہ [illegible] ر اعتزاز [illegible] کے ذریعے
بھارتی حکومت کو ایسے سکھوں کی لسٹیں دی ہیں جو اپنے لئے علیحدہ صوبہ بنانے کی
کوشش میں مصروف عسکری تنظیموں کی قیادت کر رہے تھے۔

امرتسر سے واپسی پر لاہور ٹیکس بار ایسوسی ایشن کے سالانہ انتخابات میں نائب صدر
کے عہدے کے لئے میں نے انتخابی مہم کا آغاز کیا تو میرے خلاف زبردست مہم چلائی
گئی۔ مخالف گروپ کے چند افراد [illegible] الیکشن مہم کا حصہ بنا لیا اور پروپیگ
[illegible] بھارت کا ایجنٹ ہوں۔ اس منفی پروپیگنڈا [illegible] ممبران نے کوئی اثر نہ ا
پنے دو مخالفوں کو ہرا کر بھاری اکثریت سے [illegible] صدر منتخب ہوگیا۔ جس [illegible]
ملتا ہے کہ دانشور طبقوں کی خاموش اکثریت پاکستان [illegible] رت کے [illegible] امن اور
دوستی کی خ [illegible] ہے۔

امرتسر کے بازار:

امرتسر اگرچہ گولڈن ٹیمپل کی [illegible] سے شہرت رکھتا ہے۔ لیکن اس عظیم

گوردوارے کی خوبصورتی اور زینت وہ بارونق بازار ہیں جہاں زندگی جوان اور رواں دواں نظر آتی ہے۔ دوکانوں پر خوبصورت رنگوں والے پراندے' ہار' پازیبیں' چوڑیاں' ساڑھیاں' جوتیاں اور زیورات اس طرح سجا کر رکھے گئے ہیں جیسے آسمان پر سجی مختلف رنگوں سے مزین قوس قزح ہو۔

ان بازاروں میں پنجاب کا کلچر نظر آئے گا۔ یہاں خریداری کرتی ہوئی دوشیزائیں پنجاب کے حسن کا عکس دکھاتی ہیں۔ مرزا غالب نے اگر امرتسر کے بازار اور لاہور کی انارکلی دیکھ لی ہوتی تو وہ صرف کلکتہ کی حسیناؤں کی مدح ہی نہ کرتے۔ وہ یہاں کی مہ رخوں کے لئے مصوری سیکھتے' کسی پری چہرہ کے خیال حسن میں الگ سے غزل کہی ہوتی۔ خوبصورت ہونٹوں اور چمکتے گلابی گالوں پر قصیدہ لکھا ہوتا۔

میری حس جمالیات نے ایک خوبصورت پنجابی مٹیار کو "انارکلی کی موم بتی" کہہ ڈالا تو وہ خوشی سے پھولے نہ سمائی۔ اس نے اس فقرے کی شوخی کو اپنے حسن کی سند جانا اور بڑے فخر سے اپنی ہمجولیوں کو سناتی رہی۔

امرتسر کا تجارتی مرکز ناردرن انڈیا کا تیزی سے ترقی کرتا ہوا تجارتی مرکز ہے۔ اس کے کٹڑے (بازار) گولڈن ٹیمپل کے چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کٹڑوں کی تنگ اور پیچیدہ گلیاں ہیں۔ جہاں سورج کی روشنی بھی بمشکل ہی پہنچ پاتی ہے۔ لیکن ان کٹڑوں میں سجی طرح طرح کے رنگ و خوشبو میں بسی چیزوں کی کشش لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔ یہاں کا ایک مشہور بازار گرو بازار یا گولڈن کٹڑہ ہے۔ یہاں سے ناردرن انڈیا کو سونا سپلائی ہوتا ہے۔ اس کٹڑہ میں 2500 سے زیادہ دوکانیں ہیں۔ دور سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دوکانوں کے اوپر گھر ہیں جہاں لوگ رہائش پذیر ہیں لیکن قریب آنے پر پتہ چلتا ہے کہ ہر منزل پر دوکانیں ہی دوکانیں ہیں۔ جہاں لوکل اور ہول سیل بزنس ہوتا ہے۔ ہر بلڈنگ میں چالیس پچاس دوکانیں موجود ہیں جو زیورات بناتی ہیں۔ بازار کیسریاں سونے کے کاریگروں اور براس و سٹیل کے ماہروں کا مرکز ہے۔ قریب ہی درشتی ڈیوڑھی ہے جس کا پہلا نام کرمو ڈیوڑھی تھا۔ یہ مصنوعی زیورات کی

بہت بڑی مارکیٹ ہے۔ یہاں مصنوعی زیورات اتنی خوبصورتی اور مہارت سے بنائے جاتے ہیں کہ ایک نظر دیکھ کر دھوکہ ہوتا ہے یہ اصلی ہیں کہ نقلی۔ تمام مارکیٹ پر اصلی سونے کی مارکیٹ کا گمان ہوتا ہے کٹڑہ کاٹھیاں یہاں کا سب سے مشہور بازار ہے۔ اس بازار میں دڑیاں اور پاپڑ کی خوشبو دور ہی سے محسوس ہوتی ہے۔ جو کھانے میں بے حد لذیذ ہیں۔

مشری بازار میں ڈرائی فروٹ مارکیٹ ہے۔ افغانستان سے بھی ڈرائی فروٹ یہاں پہنچتا ہے۔ یہاں دلچسپی کی کوئی خاص چیز نہیں۔ خشک میوں کی مارکیٹ دیکھنے میں بھی خشک اور بور لگتی ہے۔ باہر نکلیں تو کٹڑہ ماہن سنگھ ہے۔ جسے دیکھتے ہی ایک خوشگوار تاثر ملتا ہے۔ ذوق جمالیات کی حس لطیف بیدار ہوتی ہے۔ یہاں دلہنیں بننے والی دوشیزائیں شادی کیلئے چوڑیاں خریدتی ہیں۔ سرخ اور کریم رنگ کی چوڑیاں جن پر تھوڑا گولڈن کلر ہو اسے ہر پنجابی دلہن ضرور پہنتی ہے۔

اس طرح کی چوڑیاں بھارت کے دوسرے شہروں میں بھی بھیجی جاتی ہیں۔ کٹڑہ ماہن سنگھ وہ جگہ ہے جہاں پارٹیشن سے پہلے میرے ماں باپ رہتے تھے۔ ان کا گھر کرموں ڈیوڑھی کے قریب ہی تھا۔ جو اب وہاں کا ایک بڑا تجارتی بازار بن گیا ہے۔

امرتسر کی سیاسی و سماجی شخصیت بلبیر سنگھ کھنا ہیں۔ امرتسر میں ان کا اپنا وسیع کاروبار ہے۔ وہ امرتسر ٹریڈرز سیل کے چیئرمین ہیں۔ ہمیں ان کی میزبانی کا شرف حاصل رہا۔ انہوں نے ہمارے وفد کو اپنے گھر بلایا اور پر تکلف کھانے کھلائے۔ ان کے اہل خانہ نے کمال محبت کے ساتھ ہماری مہمان نوازی کی۔ ہمیں تحائف بھی دئے۔ اور دیر تک ہمارے ساتھ گھل مل کر باتیں کیں۔

بلبیر سنگھ کھنا پاک بھارت تعلقات کی بہتری کے بہت خواہشمند ہیں۔ انہوں نے انگریزوں کے خلاف بھارت کی آزادی کی جنگ میں بھرپور حصہ لیا۔ میرے ساتھی عارف شمیم نے ان سے پوچھا کیا آپ نے کسی انگریز فوجی کو یا کسی انگریز سپاہی کو قتل کیا ہے۔ ان کا جواب تھا نہیں۔ میں گاندھی کی آہنسا (عدم تشدد) کا پیروکار ہوں۔

ہم گھر کے جس کمرے میں بیٹھے تھے اس کی دیوار پر کھنا کی ایک تصویر اندرا گاندھی کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ کھانے کے دوران کھنا نے اپنی بہو کو بلایا اور اس کے کان میں کچھ کہا۔ تھوڑی دیر میں وہ ایک چھوٹا سا لکڑی کا بکس اپنی ہتھیلی پر رکھ کر لائی اور اسے انتہائی آہستگی کے ساتھ ہمارے سامنے میز پر رکھ دیا۔ ہم سب کی نظریں اس پر جم گئیں۔ بلبیر سنگھ نے اپنے سر پر رومال رکھا اور پھر اس بکس کو کھولا۔ اس کے اندر چھوٹی سی کوئی چیز تھی۔ بلبیر نے ہم سب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا جانتے ہو یہ کیا ہے۔ دیکھو میں اسے کھول کر آپ لوگوں کو دکھاتا ہوں۔

ہمارا تجسس بڑھ گیا اور ہم سب متوجہ ہو کر اسے دیکھنے لگے۔ یہ ایک بالشت بھر کی کتاب تھی۔ جب اسے کھولا گیا تو ہم دیکھ کر حیران رہ گئے یہ قرآن پاک تھا۔ کھنا نے بتایا کہ یہ قرآن پاک کا نادر نمونہ اس کے آباؤ اجداد سے نسل در نسل چلا آرہا ہے۔ انہوں نے اسے تازندگی احترام کے ساتھ اپنے پاس رکھنے کی ہدایت کی تھی۔

یہ سکھ خاندان کتنا اچھا ہے جو دوسروں کے مذہب کا احترام بھی کرتا ہے۔ بیگم طاہرہ مظہر علی نے ایک مضمون میں لکھا کہ پارٹیشن کے تین سال بعد وہ فیض احمد فیض کے ساتھ منٹگمری (ساہیوال) میں کسان کانفرنس میں شرکت کیلئے گئیں اور وہاں ان کی ملاقات دو نوجوان لڑکیوں سے ہوئی جو تقریباً" بیس اکیس سال کی تھیں۔ میں نے ان سے پارٹیشن کے بارے میں ان کے تجربات و خیالات جاننے چاہے۔

انہوں نے بتایا کہ وہ امرتسر سے تعلق رکھتی ہیں۔ پارٹیشن کے وقت ان کا خاندان انتہائی خوفزدہ تھا۔ ایک رات ان کے گھر تین سکھ داخل ہوئے اور کہا کہ جلدی کرو آپ لوگوں کو یہاں سے جانا ہے۔ ہم آپ کو کسی نقصان سے بچانے یہاں آئے ہیں۔ انہوں نے قرآن پاک کے بارے میں پوچھا پھر انہوں نے قرآن مجید ہم سے لے کر اپنے ٹربان میں رکھ لئے اور ہمیں واہگہ بارڈر تک لے آئے۔ جہاں سے ہم عزت اور حفاظت کے ساتھ لاہور میں داخل ہوگئیں۔ لڑکی نے بتایا کہ یہ سکھ امرتسر کے نوجوان کسان تھے۔ ان کے انسانی احترام اور اعلیٰ انسانی قدروں کے ظرف کا تجربہ ہمارے دل و

دماغ میں اثر کر گیا اور ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم کسانوں کے ساتھ مل کر کام کریں گی۔ اس کے بعد ہم پاکستان کیمونسٹ پارٹی میں شامل ہو گئیں۔

فرید کوٹ کے ایک سکھ خاندان کے گھر چند گھنٹے مہمان رہنے کا تجربہ بھی حاصل ہوا۔ میرے ایک دوست نے فرید کوٹ میں اپنی منہ بولی بہن کیلئے کچھ تحائف اور رقعہ دیا تھا کہ یہ اسے ضرور پہنچا دیں۔ کلکتہ سے واپسی پر امرتسر میں صرف ایک رات کا قیام تھا۔ سخت سردی اور دھند کے باوجود میں نے فرید کوٹ جانے کا فیصلہ کر لیا جو امرتسر سے دو ڈھائی گھنٹے کی مسافت پر ہے۔ رات 9 بجے کے قریب میں امرتسر سے کرائے کی ٹیکسی لے کر فرید کوٹ روانہ ہوا۔ سردی اور خنکی میں بے حد اضافہ ہو چکا تھا اور دھند نے تمام علاقہ اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا جس کی وجہ سے گاڑی بہت آہستہ چلانا پڑی اور رات 1 بجے فرید کوٹ پہنچا۔ امرجیت سنگھ اور ان کا خاندان بڑی شدت سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ سب گھر والوں نے بڑی گرمجوشی سے میرا استقبال کیا۔ اور مزیدار کھانوں سے میری تواضع کی۔ دیسی گھی کے پراٹھے، لسی، مکھن، پنیر، ساگ، کوفتے، فیرنی کا بے حد مزہ آیا۔ تازہ پھلوں سے بھری ٹوکری میرے آگے رکھدی گئی۔ من پریت کور کی والدہ فروٹ نکال کر میرے سامنے پلیٹ میں رکھتی گئیں انہوں نے شاید مدتوں بعد فرید کوٹ میں کسی پاکستانی سے ملاقات کی تھی۔ محلے کے کچھ احباب، خواتین ان کے بچوں کے دوست اور سہیلیاں اور ہم جماعت اتنی رات گئے تک مجھ سے ملاقات کی خواہش میں وہیں رکے رہے۔ ان سب کا شوق ملاقات دلچسپی اور تجسس جس میں محبت غالب تھی سب دیکھنے کے قابل تھا۔ سب لوگ بچھے جاتے تھے۔۔ وہ مجھ سے بہت سی باتیں تھوڑے سے وقت میں کر لینا چاہتے تھے۔ وہ مجھ سے سوالات کر رہے تھے اور ساتھ ساتھ اپنے جذبات کا اظہار بھی۔ اپنی خواہشوں کا تذکرہ بھی۔ محلے کی ایک لڑکی نے کہا دل چاہتا ہے صبح نکلیں لاہور کی انارکلی میں شاپنگ کریں اور شام کو واپس آجائیں۔ آپ لاہورئے صبح امرتسر آئیں گھومیں پھریں اور شام کو واپس چلے جائیں۔ اس میں حکومتوں کا کیا نقصان ہے۔ ایک اور صاحب نے کہا لیکن باہر کی

طاقتیں ہمارے درمیان لڑائی جھگڑا ڈالے رکھتی ہیں۔ اویس صاحب آپ کے اخبار
ے دیس کے خلاف بہت کچھ لکھتے ہیں۔ غرض جہاں سے کوئی بات ختم کرتا دوسرا
وہیں سوال اٹھا دیتا۔ شاید وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ ا نے ابھی واپس
(دشمن ملک) چلے جانا ہے۔ پھر اسے یہاں کون آسانی سے ے دے گا ہم اسے
جلدی جلدی دل کی باتیں بتا دیں۔ تاکہ وہ پاکستانی بھائیوں بہنوں تک ، جذبات
پہنچا دے۔ میں ان کی کیفیت کو سمجھ رہا تھا۔ کے سوالوں کے کیا جواب دیتا۔
میرے سوال بھی ایسے ہی ہیں۔ بھارت اور پاکستان کی کسی ایسی صبح کی ،
جو یہ نوید لے کر آے کہ جھگڑوں کے ا سال اور صدیاں بیت گئیں۔ اب ں اور
دوستی کا سورج نکل آ نفرتوں کے روشنیوں میں چھپ گئے ہیں۔
میں نے سب کی طرف غور سے سنا دیا۔
دیکھ جی ! آپ سب لوگ یقین ۔ ایک دن میں آپ اور ب غالب
ہوں گے۔ جو لوگ امن چاہتے ہیں ۔ ہم لوگ سے سب
کچھ فتح کر سکتے ہیں۔ نفرت ج نہیں ہ ے ابال ہوتا ہے بت میں
ہوتی آپ غور کر لیں۔ جناح اور گاندھی ہمیشہ صلح کی بات کرتے تھے۔ پاکستان
بننے کے بعد دونوں لیڈروں کی خواہش ایک تھی۔ ام ت۔ بھائی چارہ۔
فلاح اور ترقی۔
میرے' میزبان نے میری آنکھوں میں شاید خواہشوں اور امیدوں کے سمندر دیکھ
لئے تھے۔ میں روانی میں انہیں جذبو کرتا جا رہا تھا۔ وہ اسے کسی دیوانے کی بڑ
وہ یقین کے سمندر میں غوطہ زن ہو گئے۔ من پر ال جی بولی "مجھے
ٹا۔ تو سچ کہتا ہے ل جھوڑنا م
نے انہیں بتایا اپس ام ے اور وہاں ۔
ساتھیوں کے ہمراہ بارڈر کراس کر کے لاہور پہنچنا ہے تو وہ اداس اور بار بار اصرار
کرنے لگے کہ یہیں ٹھہر جاؤں۔ میرے میزبان امرجیت سنگھ ۔ ثن سے

پہلے اور بعد کی صورت حال پر تبادلہ خیال کیا۔ وہ اپنی پرانی یادوں کا تذکرہ کرتے رہے۔ مجھے دو گھنٹے ان کے گھر گزارنے میں ایک لمحے کے لئے بھی اجنبی ہونے کا احساس نہیں ہوا۔ ان کا کھانا' لباس' گفتگو گھر کا ماحول سب ہم لوگوں جیسا تھا۔ زبان کی چاشنی اور مہمان نوازی کا یہ انداز پنجاب کی سر زمین کا خاصہ ہے۔ جہاں انسانی محسوسات اور رشتے مادی تصورات پر غالب رہتے ہیں۔ دیکھا جائے تو پورے جنوبی ایشیاء کے اس خطے میں مہمان نوازی کی یکساں روایت موجود ہے۔ یہی سکھ جو مدتوں مسلمانوں کے ساتھ اکٹھے رہتے آئے ہیں۔ آج جب وہ پاکستان میں آتے بھی ہیں تو یاتری بن کر۔ اجنبی لوگوں کی طرح۔ راولپنڈی' لاہور' شیخوپورہ' مری' منٹگمری میں وہ بڑی تعداد میں رہتے تھے۔ ان کی کئی پشتیں مسلمان گھرانوں کے ساتھ مشترکہ ہمسائیگی رفاقت اور دوستی میں رہتی آئی ہیں۔

مری اور اس کے گرد و نواح میں سکھوں کی آبادی تقریباً" 50% تھی۔ وہاں کے لوگ کہتے ہیں کہ ہم میلوں ٹھیلوں میں اکٹھے شرکت کرتے تھے۔ ایک دوسرے کے گھروں میں آنا جانا تھا۔ تحفے تحائف کا تبادلہ ہوتا تھا۔ پارٹیشن کے وقت ماحول یکسر بدل گیا۔ یہاں پر مقیم مسلمانوں نے جبراً" سکھوں کو نکالنے کے لئے ہتھیار اٹھالئے تھے۔ ان تمام بدقسمت حالات کے جبر کے باوجود آج بھی دونوں کمیونٹی کے افراد ایک ساتھ گزارے ہوئے اچھے وقتوں کو یاد کرتے ہیں۔ ہندو' سکھ اور مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت ملتی جلتی ہے۔ پنجاب میں زبان بھی یکساں بولی جاتی ہے۔ شادی بیاہ کے رسمیں' رشتوں ناطوں کا میل ملاپ خاندانی نظام اور اس کے خدوخال ایک جیسے ہیں۔ لیکن ہم لوگ اپنے ذہنوں اور سوچوں کو محدود کر چکے ہیں۔ کسی اور مذہب' عقیدے اور نسل کے لوگوں کے ساتھ مل کر رہنا بھول گئے ہیں۔ کوئی نہیں سوچتا کہ کتنا عرصہ ننکانہ صاحب' لاہور' راولپنڈی' مری' وغیرہ میں سکھ آبادی کا اہم حصہ رہے ہیں۔ ان کے تہذیبی ورثے یہاں موجود ہیں۔ اسی طرح امرتسر کے مسلمان آباد کار جو مغربی پنجاب میں ہجرت کر آئے تھے اب اپنی آبائی جگہ دیکھنے کو ترس گئے ہیں۔

امرتسر اور فرید کوٹ میں لاہور میں پائی جانے والی ہر چیز مل جاتی ہے لیکن مسلمان مشکل سے ملیں گے۔

قیام پاکستان کے وقت کے کرینا ک حالات و واقعات بڑے تلخ تھے۔ جس طرح سکھوں اور مسلمانوں نے ایک دوسرے کے گلے کاٹے' املاک تباہ کیں اس کی تلخیاں اب سکھوں کو بہت رلاتی ہیں۔ ایک احساس جرم ہے جو دونوں جانب محسوس کیا جاتا ہے۔ ماضی کے واقعات بے چین کر دیتے ہیں۔ واہگہ بارڈر پر کلکتہ جاتے ہوئے ایک بھارتی سکھ نے مجھے کہا تھا "یار دو ویں پاسیوں پاگل پن سی"

ایک اور سکھ نے امرتسر سے واپس آتے ہوئے کہا "روئے تسی وی بڑے اوتے روئے اسی وی بڑے آں" جب ہم واہگہ بارڈر سے سمجھوتہ ایکسپریس پر بیٹھنے لگے تو اس نے کسی قدر اداس لہجے میں کہا "ایہہ سمجھوتہ ایکسپریس نئیں۔ وچھوڑا ایکسپریس اے۔"

رات کے 2 بج چکے تھے۔ میں نے جانے کیلئے اجازت طلب کی۔ امرجیت سنگھ نے مجھے تحائف دئے اور سب لوگ باہر تک چھوڑنے کیلئے آئے انہوں نے کہا لاہور کو ہمارا سلام کہنا۔ لاہور ہمارے دلوں سے کبھی اوجھل نہیں ہوا۔ میں نے ان کے خلوص اور مہمان نوازی پر ان کا شکریہ ادا کیا۔ فرید کوٹ سے امرتسر واپسی کا سفر بیحد پر خطر بن گیا تھا۔ دھند نے سب کچھ اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ ہم نے ایک گھنٹے کے اندر بمشکل 5 میل کا سفر طے کیا۔ بالاخر جب آگے سفر کرنا ممکن نہ رہا تو ایک جگہ گاڑی کھڑی کر لی۔

راستے میں چلتی ہوئی تمام ٹریفک رک چکی تھی۔ ڈرائیور نے سردی سے بچنے کیلئے شراب پینا شروع کر دی۔ میرا سردی کے مارے برا حال تھا امرتسر صبح 9 بجے تک پہنچنا مشکل نظر آتا تھا۔ صبح 5 بجے میرے اصرار پر ڈرائیور نے گاڑی سٹارٹ کی جو آہستہ آہستہ چلتی رہی۔ جوں جوں دھند کم ہوتی گئی گاڑی کی رفتار بڑھتی گئی۔ خدا خدا کر کے ہم امرتسر پہنچ گئے۔ فرید کوٹ کا یہ سفر ہمیشہ یاد رہے گا۔

14 اگست 97ء کی شب واہگہ بارڈر پر جس تزیب ۔ اہتمام کا اگر تھ
بازگ ستان اور بھارت کے وفود اپنے اپنے بارڈ
کو لے کر پہنچنا ن حکومت پنجاب نے ایک نو ٹیفکیشن کے ذریعے
ہمیں اس طرح کی تق قد لرنے سے روک دیا تھا۔

14 اگست 97ء ب ہم امرتسر بارڈر پر موجود تھے جہاں بھارت کی جانب سے
اپنی آزادی ی جوبلی تقریبات منعقد کرنے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ ہم سات پاکستانی
صرف ئے گئے تھے۔ ہم یمپ کے ساتھ آدھی رات
سے پہلے وہا پہلے تھے۔ لوگوں کا دم گاڑیوں موٹر بسوں
یہاں تقریباً 5000 ریب لوگ جمع پ تھے۔ یہ پرو
کلدیپ نیر اہی میں بھارت تنظیم ار ڈیموکریسی اور ساؤتھ
ایشین فریٹرنٹی نے مل کر ترتیب ۔ تمام انتظامات بے ترتیبی کا شکا ۔ سٹیج پر
کسی کا کنٹرول نہ تھا۔ لیت اعلانات تقاریر سب کچھ آوازوں
میں دب چکا تھا۔ سا ین فریٹرنٹی کے جنرل سیکرٹری آکر تقر
بائیکاٹ کا اعلان کر دیا۔ ایک دو مقررین بمشکل اپنے کر پائے۔

تقریروں میں جذبات کا رنگ غالب تھا۔ وہ پاکستان کو مشورہ دے رہے تھے کہ آؤ پھر
سے مل جاؤ۔ ایک ہو جاؤ۔ بارڈر ختم کر دو۔ نہ سوچ ہے۔ پاکستان اور بھارت
اب کبھی ایک ملک نہیں بن سکتے۔ تاریخ کا ں رچکا ہے۔ ہمارے میزبان ستیا پال
میر خیال سے متفق ہیں۔ عوام کی عمومی نفسیات کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا
ہے یجھتی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔

اس اجتماع میں ایک جگہ پر انگریز بھپا ہوا ایک پمفلٹ تقسیم
"واہگہ ڈیکلریشن 14 - 15 اگست 97"
ت اور پاکستان اپنی پچاسویں آزا سالگرہ مشترکہ طور پر اس
خواہش کے اظہار کے ساتھ دونوں ملکوں اور حکومتوں کے

درمیان دوستی اور اشتراک عمل قائم ہو۔ ہم دونوں ملکوں کی حکومتوں کے درمیان مسلسل جاری محاذ آرائی کو ناپسند کرتے ہیں۔ اس محاذ آرائی کی وجہ سے دو جنگیں ہو چکی ہیں۔ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوششوں نے بداعتمادی دہشت اور خوف کو جنم دیا ہے۔ اسلحہ کی دوڑ شروع ہے۔ جس نے دونوں ملکوں کو اسلحہ کے تاجروں کا مرہون منت بنا رکھا ہے۔

دونوں ملکوں کی بیوریو کریسی' پریس اور غیر ذمہ دار سیاستدانوں نے اس صورت حال کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے مذموم مقاصد پورے کئے ہیں اور آج ہم آزادی کی پچاسویں سالگرہ پر یہ اعلان کرتے ہیں کہ پچاس سالہ محاذ آرائی کافی ہو چکی۔ ہم سیکیورٹی کے نام پر اب مزید مصیبتوں کا بار نہیں اٹھا سکتے۔ ہم ایک دوسرے کے ملک کے لئے ہمدردی کا رویہ چاہتے ہیں۔ ہم مستقل اور پائیدار دوستی کے خواہشمند ہیں۔

دنیا بھر میں قیام امن کیلئے زبردست موومنٹ چل رہی ہے۔ اور جمہوری قوتوں کو ہر جگہ تقویت مل رہی ہے۔ ہم امن کے قیام کی اس عالمی تحریک میں اپنا حصہ ڈال کر جنوبی ایشیاء میں امن' جمہوریت اور خوشحالی لانا چاہتے ہیں۔ ہم نے ان مقاصد کے حصول کیلئے کئی طرح کی کوششیں کی ہیں اور ان کوششوں کو اس وقت تک جاری رکھیں گے جب تک دونوں ملکوں کی حکومتوں کو مجبور نہیں کر دیتے کہ وہ تعاون کی پالیسی اپنا کر خوشحالی کے دور کا آغاز کریں۔ ہمیں معلوم ہے ایک دوسرے سے تعاون کی پالیسی میں دونوں ملکوں کا بھلا ہے اور کسی ایک ملک کا نقصان نہیں۔ ہمیں معلوم ہے اصولی طور پر دونوں ملکوں کی حکومتیں باہمی تجارت اور سرمایہ کاری کا فروغ ضروری خیال کرتی ہیں۔ لیکن اس محاذ آرائی کی وجہ سے وہ معاشی تعاون کے باہمی فوائد سے محروم رہتی ہیں۔

ہم اپنی اپنی حکومتوں سے کہہ رہے ہیں کہ وہ دونوں ملکوں میں آمدورفت کیلئے بارڈر ایریا میں ٹرانسپورٹ کے رابطے کھول دے۔ ویزہ کی پابندیاں ختم کی جائیں۔ پولیس رپورٹنگ کا سلسلہ بند ہو۔ دونوں ملک آپس میں سامان کی ترسیل و رسد پر

پابندیاں ختم کریں۔

ہمیں امید ہے اس طرح کے اقدامات سے دیگر سیاسی اختلافات کو حل کرنے کا راستہ نکل آئے گا۔ ہم جنگ کے مخالف' امن کے حامی اور انسان دوستی پر یقین رکھنے والے لوگ ہیں۔ ہم ایک دوسرے کے مسائل اور مشکلوں کو ہمدردی سے دیکھتے ہیں۔ ہم اسلحہ کی دوڑ میں خرچ ہونے والے سرمائے پر نوحہ کناں ہیں۔

ہمیں یہ محاذ آرائی اور دشمنی سے پر ماحول ورثے میں ملا ہے۔ لیکن ہم اپنے بچوں اور آنے والی نسلوں تک اسے نہیں لے جانے دیں گے۔ ہم اسے ختم کریں گے۔ دوستی کریں گے۔

دوستو! یہ ایک نادر موقع ہے۔ جو آپ کے دروازے پر دستک دے رہا ہے۔ ہم آپ کو دعوت دیتے ہیں۔ کہ آپ ہماری تحریک اور تنظیم میں شامل ہوں اور اسے امن خوشحالی اور ترقی کی لازوال قوت میں بدل دیں۔

سیف پاکستان - انڈیا

سٹیزن فار ڈیموکریسی۔ نیو دہلی

تقسیم پنجاب اور مسلم سکھ فسادات:

مارچ 1947ء کو خضر حیات خان کے استعفے کے بعد پنجاب کے گورنر سر ایوان جینکز نے خود حکومت کی ذمہ داریاں سنبھال لیں تو اس وقت ہر جگہ وسیع پیمانے پر قتل و غارت گری اور آتش زنی عام تھی۔ امن و امان بگڑنے کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ برطانوی افسر اب دلجمعی سے نوکری نہیں کر رہے تھے اور عوام کے مصائب سے لاتعلق تھے۔ اس غیر منقسم پنجاب کی کل آبادی 2 کروڑ 80 لاکھ تھی۔ جس میں ایک کروڑ 60 لاکھ مسلمان' 75 لاکھ ہندو اور 45 لاکھ سکھ شامل تھے۔ اگرچہ سکھ اقلیت میں تھے۔ لیکن وہ آبادی کا نہایت اہم حصہ تھے۔ وہ پورے پنجاب میں پھیلے ہوئے تھے۔ وہ بڑے کاشتکاروں میں شامل تھے۔ جو زمین کے مالک اور کاشتکار تھے۔ پانچ دریاؤں میں سے

نہروں کا نظام جو پورے صوبے میں کا عظیم جال پھیلا ہوا تھا اس کی تعمیر میں ان کا بڑا حصہ تھا۔ بیشتر نہریں مغربی پنجاب میں تھیں جنہیں سیراب کرنے والے دریاؤں کے منبع مشرقی پنجاب میں تھے۔ سکھوں کی متعدد اہم مقدس عبادت گاہیں مغربی پنجاب میں ہیں۔

ان حالات میں یہ واضح تھا کہ اگر پنجاب کی تقسیم عمل میں آگئی تو سرحدی لکیر خواہ کی کھینچی جائے' پورے سکھ فر کے نقصانات سہنے پڑیں جب پنجاب کی تقسیم کا حتمی فیصلہ ہوگیا تو لارڈ ریڈکلف کو جو باؤنڈری کمشن کے سربراہ تھے انہیں ہدایت دی گئی کہ پنجاب کے دونوں حصوں کے درمیان سرحد کھینچتے ہوئے مسلم اور غیر مسلم اکثریتی علاقوں کی تخصیص کو اولین ترجیح دیئے۔ ایسا کرتے ہوئے دوسرے کا بھی خیال رکھا جائے (جناح اور گاندھی از ایس کے صفحہ 368)۔

دوسرے عوامل کیا تھے۔ اس ترکیب کی تشریح کیا ہوگی اور کس طرح ہوگی۔ اس سلسلے میں گورنر پنجاب کا ایک خط اہم ہے جسے ایل موزلے نے اپنی کتاب کے صفحہ 206 پر رقم کیا ہے اور جناح اور گاندھی کے مصنف ایس کے نے کا حوالہ صفحہ 368 پر دیا۔

یہ خط لارڈ ماؤنٹ بیٹن وائسرائے ہند کو بھیجا گیا اس میں اسی گفتگو کی تفصیل تھی جو لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے نامور سکھ رہنما گیانی کرتار سنگھ سے کی۔ اس بات چیت سے سکھوں کی ان امیدوں اور امنگوں کا پتہ چلتی ہے جو انہوں نے ایوارڈ سے وابستہ کر رکھی تھیں۔ گیانی کرتار سنگھ نے کہا کہ وہ تقسیم کو صرف آبادی سمجھتے۔ سکھوں کو بھی اپنی سرزمین پر اتنا ہی حق ہے جتنا مسلمانوں اور ہندوؤں کو انہیں ننکانہ کا گوردوارہ اور ایک نہری نظام ضروری ملنا چاہئے اور آخر سکھوں کی چوتھائی آبادی کو پنجاب سے مشرقی پنجاب منتقل کرنے کیلئے لازماً انتظامات کرنے چاہئیں۔ لین دین اور تبادلہ آبادی کے ساتھ ساتھ جائیداد کو بھی

مد نظر رکھنا چاہئے۔ کیونکہ بحیثیت مجموعی سکھ مسلمانوں سے زیادہ خوش حال ہیں۔ گیانی نے کہا کہ جب تک شاہ معظم کی حکومت وائسرائے اور پارٹی رہنما یہ تسلیم نہیں کرتے کہ سکھوں کے مقدر کا فیصلہ ایک نہایت ہی اہم معاملہ ہے تو مسئلہ پیدا ہوگا۔ (پھر) وہ لڑنے پر مجبور ہوں گے۔"

جب حتمی طور پر 17 اگست کو ریڈ کلف ایوارڈ کا اعلان عام کیا گیا تو پتہ چلا کہ انہوں نے حد فاضل اس طرح کھینچی ہے کہ نہری نظام کا بڑا حصہ، گندم پیدا کرنے والی زرخیز زمین اور ننکانہ صاحب کا عظیم گوردوارہ پاکستان میں چلے گئے ہیں جب کہ نہری نظام کے قیام پر سکھوں کا سرمایہ خرچ ہوا تھا۔

ریڈ کلف ایوارڈ کے شائع ہوتے ہی سکھ مسلمان جنگ کا آغاز ہوگیا۔ اس معاملے پر غور و فکر بے کار ہے کہ پہلا پتھر کس نے پھینکا تھا۔ پنجاب میں پہلا فساد راولپنڈی میں ہوا۔ اس وقت تک لاہور اس آگ سے کسی قدر بچا ہوا تھا۔ پھر جب کشیدگی نقطۂ عروج پر پہنچ گئی تو ہندوؤں اور سکھوں نے تقسیم ملک کی تجویز یا فیصلے کے خلاف ایک جلوس نکالا۔ اس میں ایک شخص نے کسی مسلمان کی دوکان پر لگا مسلم لیگ کا جھنڈا اتار لیا یا پھاڑ دیا۔ ادھر اسمبلی ہال کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر اکالی لیڈر ماسٹر تارا سنگھ نے کرپان بلند کر کے دکھائی اور کچھ مشتعل کرنے والے الفاظ کہے۔ ان دو واقعات نے بارود کو دیا سلائی دکھانے کا کام کیا اور لاہور اسی آگ کی لپیٹ میں آگیا جس میں ملک کے دوسرے حصے جل رہے تھے۔ ان فسادات کا سلسلہ اکتوبر 1947ء تک جاری رہا۔ یہ آگ اس وقت ٹھنڈی ہوئی جب سارا لاہور ہندوؤں سکھوں سے اور سارا امرتسر مسلمانوں سے خالی ہوگیا (سوم آنند -- باتیں لاہور کی) ان فسادات کے پیچھے ایسے ہاتھ ہوں گے جو نظر نہیں آتے تھے۔ یہ ہاتھ کسی ایک طرف کے نہیں تھے۔ سوم آنند نے اپنی کتاب کے صفحہ 53 پر لکھا ہے۔ "اس میں شک نہیں کہ ان فسادات کے پیچھے کسی کا ہاتھ تھا۔ لاہور کا سارا غنڈہ عنصر ان فسادات کے لئے منظم کیا گیا۔ فسادات کے پیچھے ان لوگوں کا ہاتھ تھا جو اس سے اپنے سیاسی مقاصد حاصل کرنا چاہتے تھے۔"

پاکستان کے سابق ایڈیٹر جنرل مشتاق احمد وجدی جو تقسیم ملک کے وقت محکمہ ریلوے میں تھے اپنی کتاب "ہنگاموں میں زندگی۔ صفحہ 144- میں لکھتے ہیں۔ "مسلم لیگ کی وزارت بنی۔ سردار شوکت حیات نے مجھے طلب کیا اور کہا کہ سخت فساد ہونے والے ہیں ان کے لئے ہتھیار جمع کرنے ہیں۔ یہ صوبہ سرحد سے آئیں گے۔ لیکن ریلوے سٹاف کی مدد ضروری ہے۔ میں نے لائن سٹاف کے مسلمانوں کو جمع کیا۔ سب نے انتہائی مستعدی کا اظہار کیا اور قسم کھائی کہ اس کام میں جیل جانا تو کیا جان بھی دینی پڑی تو ثابت قدم رہیں گے۔ کمیٹی بنی۔ فرائض تقسیم ہوگئے۔ میں نے حاضر ہو کر سردار شوکت حیات کو تفصیل بتائی۔ انہوں نے کہا فورا" دلی جاؤ اور لیاقت علی خان صاحب کو بتاؤ۔ میں دوسرے ہی دن دلی پہنچا۔ لیاقت علی خان اس وقت کانگریس اور مسلم لیگ کی مخلوط وزارت میں وزیر خزانہ تھے۔ غالبا" انہیں میرے آنے کی اطلاع پہلے سے تھی۔ کارڈ ملتے ہی فورا" طلب کر لیا۔ غور سے تفصیلات سنیں۔ مزید ہدایات کا وعدہ کیا اور اخفائے راز کی تاکید کی۔ اس زمانے میں وزارت خزانہ میں میرا تقرر بطور ڈپٹی سیکریٹری ہوگیا اور لاہور سے دلی چلا آیا۔ معلوم نہیں میری بنائی ہوئی تنظیم کہاں تک مفید رہی۔ بعد میں وسیع پیمانے پر کشت و خون ہوئے"

کچھ لوگ خوف سے مغلوب ہو کر یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ اگر بدلے کے طور پر جوابی کاروائی کی جائے تو اس سے فسادات رک جائیں گے۔ یا ان کے فرقے کی حفاظت ہو سکے گی۔ مگر اس طرح کے رجحانات نے فسادات کو مزید بھڑکا دیا۔ ہر طرف دہشت اور نفرت کے ماحول نے بڑوں کے ساتھ بچوں کے ذہنوں پر بھی منفی اثرات ڈالے اور فرقہ واریت کا زہر ان کے اندر بھی اتر گیا۔ اس کا اثر آج تک دونوں ملکوں میں موجود ہے۔

"میری بھانجی جس کی عمر پانچ سال تھی۔ یہ سمجھتی تھی کہ بندوق پستول کا مصرف یہ ہی ہے کہ ان سے مسلمان مارے جاتے ہیں" (سوم آنند صفحہ 54) فرخندہ لودھی ایسی افسوسناک صورت حال کی کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے اپنی درد مندی اور کرب کا

اظہار یوں کرتی ہیں۔

"اس خطے کی رومان پرور فضاء یکا یک ساز گاری سے منحرف ہوگئی۔ اپنے شہر' گلیاں' گاؤں بیک فیصلہ پرائے ہوگئے۔ رواداری یگانگت بہت پیچھے رہ گئی۔ نفرت کی آندھی نے سب کچھ تہس نہس کر دیا" (رومان کی موت صفحہ 18)

انگریز افسر جو اپنے اپنے اضلاع کے انچارج تھے مجرمانہ غفلت برت رہے تھے۔ انہیں امن و امان کی صورت حال سے کوئی سروکار نہ تھا۔ 5 ستمبر 1947ء کو جب پنجاب میں فسادات اپنے عروج پر تھے۔ مغربی پنجاب کے گورنر سر فرانسس موڈی نے جناح کو لکھا "میں ہر کسی کو بتا رہا ہوں کہ مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں کہ سکھ سرحد کس طرح عبور کرتے ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان سے جس قدر جلدی ہو سکے چھٹکارہ پایا جائے۔ ابھی تک لائل پور میں 3 لاکھ سکھوں کے موجود ہونے کے آثار ہیں۔ لیکن آخر کار انہیں جانا ہوگا۔ (خوفناک انتقام از جی ڈی کھوسلہ + جناح اور گاندھی صفحہ 365)

اس وقت مغربی پنجاب میں 18 لاکھ اور مشرقی پنجاب میں 22 لاکھ سکھ آباد تھے۔

مولانا آزاد نے اپنی کتاب "ہندوستان کا حصول آزادی صفحہ 198 پر لکھا ہے" میں نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے بھی کہا تھا کہ وہ ملک کی تقسیم کے ممکنہ مضمرات کو بھی سامنے رکھیں۔ حتیٰ کہ ملک کی تقسیم کے بغیر بھی کلکتے' نواکھلی' بہار' بمبئی اور پنجاب میں فسادات ہو رہے تھے۔ ہندو مسلمانوں پر اور مسلمان ہندوؤں پر حملے کر رہے تھے۔ اگر ان حالات میں ملک کو تقسیم کر دیا گیا تو اس کے مختلف حصوں میں خون کے دریا بہہ جائیں گے اور اس قتل عام کے ذمہ دار انگریز ہوں گے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے فورا" کہا کہ کم از کم اس معاملے پر میں آپ کو مکمل یقین دہانی کرواتا ہوں کہ میں خود نگرانی کروں گا کہ کہیں فسادات اور خونریزی نہ ہو۔ میں سویلین نہیں سپاہی ہوں۔ ایک مرتبہ تقسیم کو اصولی طور پر قبول کر لیا جائے تو میں احکامات جاری کردوں گا کہ ملک کے کسی حصے میں بھی فرقہ وارانہ گڑ بڑ نہیں ہونی چاہئے۔ اگر کہیں معمولی سا بھی مظاہرہ

ہوا تو میں اسے ابتداء ہی میں کچل دینے کیلئے سخت ترین ا ـ تیار کروں گا۔ میں پولیس کے مسلح دستے بھی استعمال نہیں کروں گا بلکہ بری اور فضائی فوج کو ایکشن لینے کا حکم دوں گا اور میں اس مقصد کیلئے ضروری ہوا تو ٹینک اور ہوائی ی استعمال کرو ں گا "

تے ہیں ا دنیا جانتی ہے لارڈ ماؤ ں کے ا ت مندانہ دعوے کا کیا حشر ہوا۔ جب تقسیم عملاً" وقوع پذیر ہوئی تو ملک کے وسیع حصو میں خون کے دریا بہہ گئے۔ بے گناہ مردوں' عورتوا ں کا قتل عام ہوا۔ افواج کو منقسم کر دیا گیا اور بے قصور ہندوؤں اور مسلمانوں کے قتل کو روکنے کیلئے کو ئی موثر اقدام نہ کیا گیا۔

شیخوپورہ میں ناقابل انداز قتل عام ہوا۔ دیگر اضلاع قتل و غارت اور املاک کی تباہی سے نہ بچ سکے۔ مغربی پنجاب میں ہونے والے قتل عام کا رد عمل مشرقی پنجاب میں ظاہر ہوا۔ بچ کر پہنچنے والے مہاجروں کے انبوہ اور ان کے رد ناک داستانوں نے وہاں کے لوگوں کو مرتب کیے۔ فضا بے سے بھر گئی۔ لاہور میں ہندوؤں کا قتل کیا گیا۔ ان کی املاک گئیں۔ اسی طرح مسلمانوں پر بھرپور حملے بولے گئے۔ فرقہ وارانہ جنون نے سرحد کے دونوں جانب ینے شکنجے میں لے لیا۔ جس وحشت پیما نے انسانی جانوں کا ضیاع ہوا اس کی مثال تاریخ میں کہیں ملتی۔

دہلی میں فساد وقت پھوٹ پڑے جب مغربی پاکستان سے مہاجر اپنے درد ناک مصائب بشمول قتل و غارت گری آتشزدگی اور ریزی کی داستانوں کے ساتھ دہلی میں وارد ہوئے۔ جو کچھ اب میں ہو چکا تھا۔ وہی کچھ دہلی اور گرد و نواح میں دہرایا جانے لگا۔ عورتوں بچوں اور بوڑھوں کو بھی نہیں بخشا گیا۔ لاہور ریلوے سٹیشن پر پہنچنے والی ٹرینیں، مسافروں کی لاشوں سے کھچا کھچ بھری ہوتی تھیں۔ کہ بوگیوں پر اس طرح ت لکھے ہوئے تھے "ہندوستان کی طرف سے تحفہ" اسی طرح مسلمانوں نے بھی ی سے قتل کئے گئے سکھ کی لاشیں

ٹرینوں میں اس پیغام کے ساتھ بھر کر بھیجیں۔

"پاکستان کی طرف سے تحفہ"

ایس کے موجمدار اپنی کتاب کے صفحہ 372 پر لکھتے ہیں۔

"وہ سرزمین جس نے گاندھی کی قیادت میں عدم تشدد کا قومی مذہب اختیار کیا تھا۔ وہاں قتل و غارت گری' آتشزنی' لوٹ مار اور آبروریزی اس طرح ہوئی جو دنیا نے چنگیز خان کے ایام کے بعد کبھی نہیں دیکھی تھی۔

مجموعی طور پر پنجاب کے دونوں حصوں میں 6 لاکھ افراد ہلاک اور ایک کروڑ 40 لاکھ بے گھر ہوگئے۔ ایک لاکھ لڑکیاں اغواء اور عصمت دری کا نشانہ بنیں"

اس قتل و غارت گری کی بڑی ذمہ داری سلطنت انگلشیہ کے ناعاقبت اندیش حکمرانوں پر عائد ہوتی ہے جو اپنی کم فہمی' بے رحم طبیعت' انسانیت سے عاری سوچ اور عجلت میں کئے گئے غلط فیصلوں کی بنا پر حالات کو بگاڑتے رہے اور خاموش تماشائی کا کردار ادا کرتے رہے۔

ہندوستان کی افواج کے برطانوی کمانڈر انچیف جنرل آکن لینڈ کے پہلے مسلمان پرائیویٹ سیکرٹری شاہد حامد اپنی کتاب "دنیا بدل گئی" میں لکھتے ہیں" جنرل آکن لینڈ نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو مشورہ دیا کہ وہ برطانوی دستوں کو شہری حکام کی مدد کیلئے مقرر کرنے کی اجازت دے دیں لیکن ماؤنٹ بیٹن نہ مانے۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح یہ تاثر پیدا ہوگا کہ برطانوی حکومت دوبارہ اپنا راج قائم کرنے اور طول دینے کی کوشش کر رہی ہے۔ دراصل یہ ہندوستان میں برطانوی راج دوبارہ قائم کرنے کا سوال نہیں بلکہ انسانی جانوں کو بچانا مقصود ہے۔ موجودہ صورت حال میں جبکہ قتل و غارت گری کا بازار گرم ہے۔ برطانوی فوجیں محض بیٹھی دیکھتی رہیں تو اس طرح کے برطانوی کردار پر بدنامی کا داغ لگ جائے گا۔ تاریخ ان کی اس غلطی کو محفوظ کرلے گی اور اس کے وہ بھیانک نتائج نکلیں گے کہ لوگ 1857ء کے واقعات بھول جائیں گے ان تمام لوگوں کا خون صرف اور صرف ماؤنٹ بیٹن کے سر ہوگا۔ انہیں ایک نہ ایک دن اپنی اس غلطی کی

سزا ضرور ملے گی۔ ان کی یہ کوتاہیاں برطانوی حکومت کی تاریخ پر سیاہ دھبہ بن جائیں گی۔"

5 جون کو گاندھی نے واضح الفاظ میں انگریزوں کی مذمت کی اور کہا کہ برصغیر میں اگر مصائب و آفات رونما ہوتے ہیں تو ہی اس کے ذمہ دار ہوں گے۔ 25 جولائی کو جناح نے وائسرائے سے ملاقات کی اور ان سے کہا کہ وہ لاہور اور امرتسر میں ہونے والی بدامنی کو کچلنے میں سختی سے کام لیں۔

شاہد حامد کے بقول پنجاب سے فرقہ وارانہ اطلاعات کے آنے کے باوجود ماؤنٹ بیٹن لاپرواہ اور خوشگوار موڈ میں نظر آتے تھے۔ مسلمان ہندو اور سکھ افسروں میں بھی تناؤ بہت بڑھ چکا تھا۔ مسلمان اپنے آپ کو بھارت میں محفوظ سمجھتے تھے۔ یہی کیفیت پاکستانی علاقوں میں بسنے والے ہندوؤں اور سکھوں کی تھی۔ اس وقت ساری توجہ برطانوی طرز عمل پر تھی۔ یہ ایک ایسی چال تھی جس نے ہندوؤں سکھوں اور مسلمانوں سب کو برطانوی حکومت کی دست نگر اور نجات دہندہ بنا دیا۔ اس کے تمام ظلم و نا انصافیاں سردست ذہنوں سے نکل گئیں۔ اب ہر ایک قوم اس کی طرف دیکھ رہی تھی کہ باؤنڈری کمشن کا فیصلہ کیا آتا ہے۔ کونسا کس کے پاس جائے گا۔ گاندھی جی کا یہ کہنا تھا کہ اگر ملک کو تقسیم ہونا ہی ہے تو یہ کام برطانوی حکومت کے ہاتھوں کیوں انجام پائے۔ اگر ایسا ہوا تو مستقبل میں اس کے نتائج اچھے ثابت نہیں ہوں گے۔

ماؤنٹ بیٹن نے ایک کیلنڈر سب کو بھیجا۔ جس کا ہر روز ایک صفحہ پھاڑا جاتا تھا۔ یہ بتانے کے لئے کہ اب تقسیم میں کتنے دن باقی رہ گئے۔ یہ طفلانہ حرکت تھی۔

ٹرینوں پر بلوائیوں کے حملوں کے مسلسل واقعات سے نہرو پریشان تھی۔ وہ اپنے بیانات میں یہ کہتے رہے کہ برطانوی حکومت فسادات کو روکنے میں ناکام رہی ہے۔ انہوں نے دریافت کیا کہ جب گاڑی پر فوجی حفاظتی دستہ موجود ہوتا ہے تو پھر یہ قتل و غارتگری کیوں ہو رہی ہے۔ انہیں کو بتایا گیا کہ بلوائی اپنے ہتھیار خفیہ طور پر لے کر

گاڑی میں سوار ہو جاتے ہیں اور ہیں بھی یکھ کر حملہ کر د۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے آدمی ریل گاڑی میں سوار ہوتا ب ایسی جگہ پر ریل گاڑی کی زنجیر کھینچ کر گاڑی روک لیتا ہے۔ جہاں بلو ا کردہ پہلے سے وہاں موجود اور منتظر ہوتا ہے۔ ریل گاڑی کا حفاظتی دستہ ان حالات میں کچھ نہیں کر سکتا۔

نہرو نے تجویز پیش کی کہ لاہور' امرتسر اور دوسرے علاقوں میں مارشل لاء لگا جائے اور معاملات نے کی ساری ذمہ داری فوج کے حوالے کر دی جائے۔ جو فسادیوں کو دیکھتے ہ ر دے۔ لیکن پنا کی یہ تجاویز رد کر دی گئیں۔ گورنر پنجاب کا خیال تھا ادات نہیں بلکہ چ ں اور چھرا گھونپنے کی وارداتیں۔ مارشل لاء سے کوئی فرق ے گا۔ وہ فوجی دستوں کو سرگرم بن کرنا چاہتے۔ وہ ا پس پردہ تنظیموں کا کھوج لگا کر انہیں گرفتار کر لیں گے۔

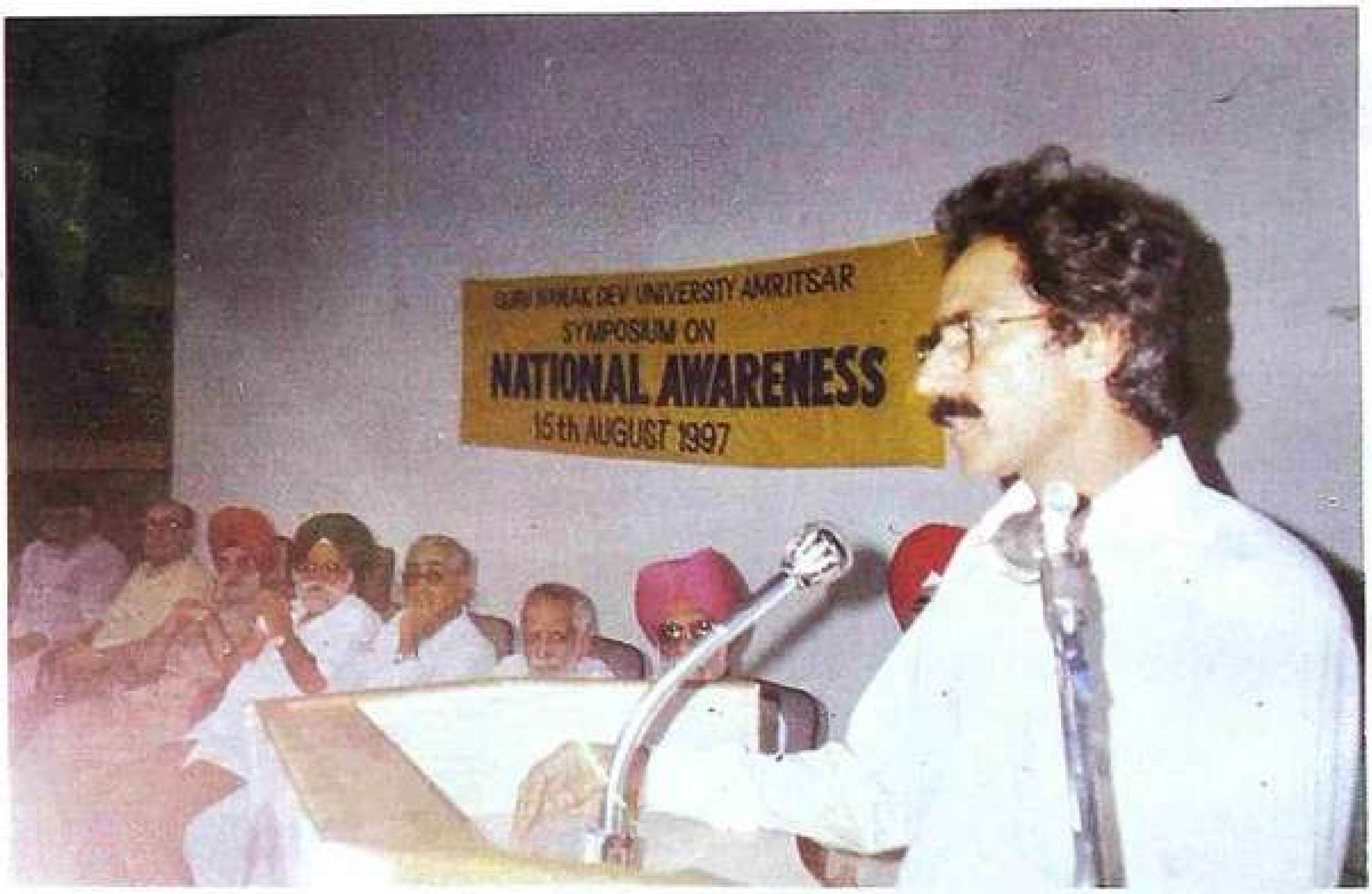
12 جولائی کو وائسرائے ومت برطانیہ سے پہلی بار یہ بیان دینے کی اجازت طلب کی کہ برطانوی افواج کسی اقدامی ضرورت کے لئے کام میں نہیں لائی جائیں گی اور 15 اگست کے بعد کسی اندرونی انتشار میں مداخلت ہوں گی

ہے کہ برطانوی اور سول باشندوں کو اس ع ہونی چاہئے۔ ہ کو دور کرنے میں معاون ہو گا کہ برطانیہ پ ار دوبارہ مسلط کر چاہتا ہے۔

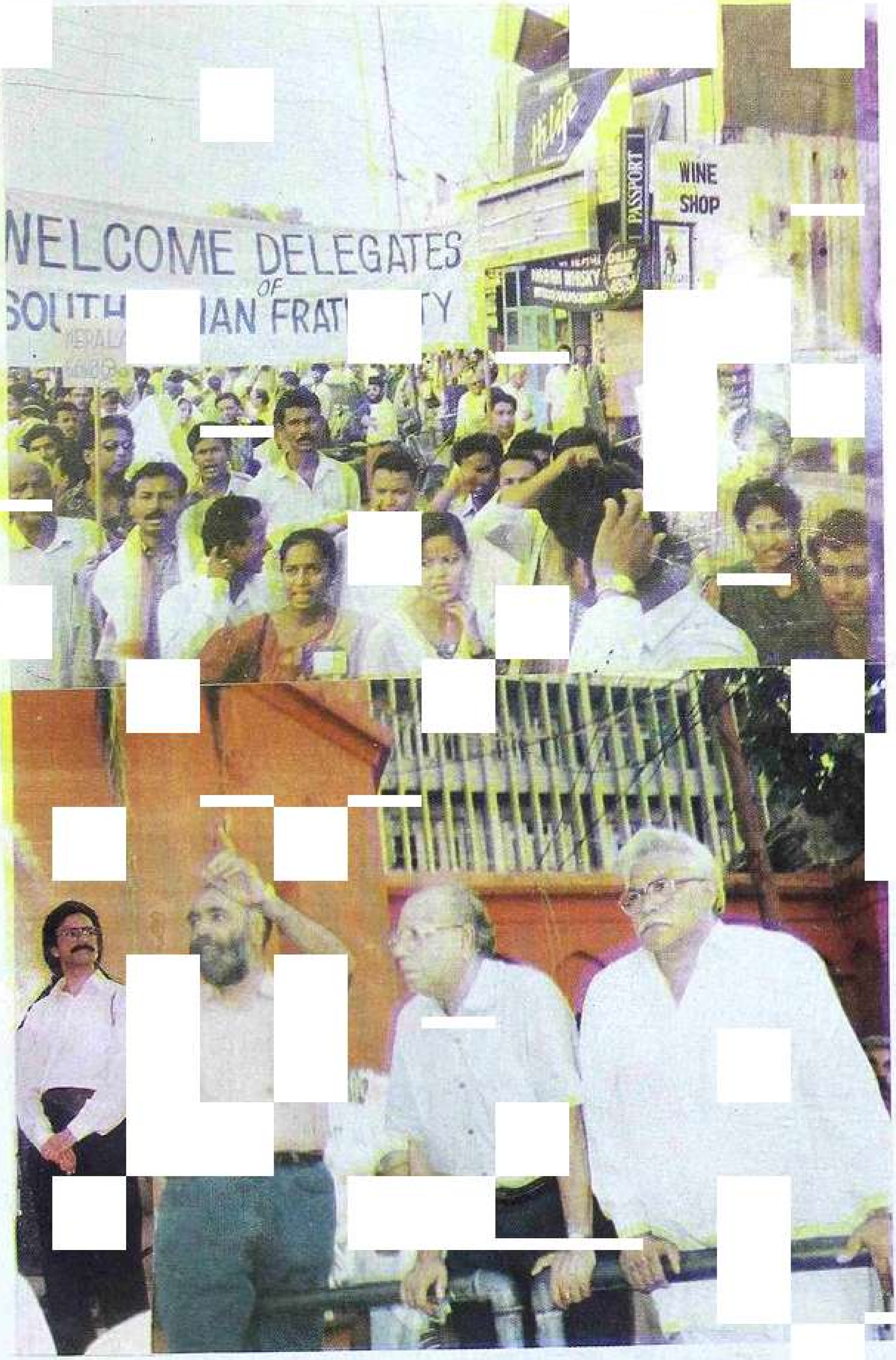
جون کے پہلے ہفتے میں بیٹن نے ایک پریس کانفرنس منعقد کی۔ جس میں تمام دنیا سے تین سو صحافی موجود تھے۔ ایک سکھ ان سے پوچھا کہ کیا انہیں اس بات کا ہے کہ انہوں نے اس کی برادری حصوں میں اس طرح تقسیم کہ اس کے بیشتر اثاثے اس سرزمین میں رہ جائیں گے جو اب پاکستان کے نام سے موسوم ہونے والی ہے۔ ماؤنٹ بیٹن اب دیا کی تقسیم سکھوں کی درخواست پر کی گئی اور انہوں نے اپنے رہماؤں کو اس کے نتائج سے آگاہ کر دیا



واہگہ بارڈر پر بھارتی میزبان اور پاکستانی وفد کے ارکان



امرتسر سیمینار بھارت کی آزادی کی گولڈن جوبلی۔ مصنف تقریر کر رہے ہیں


WINE
SHOP
WELCOME DELEGATES
OF

امرتسر۔ امن مارچ

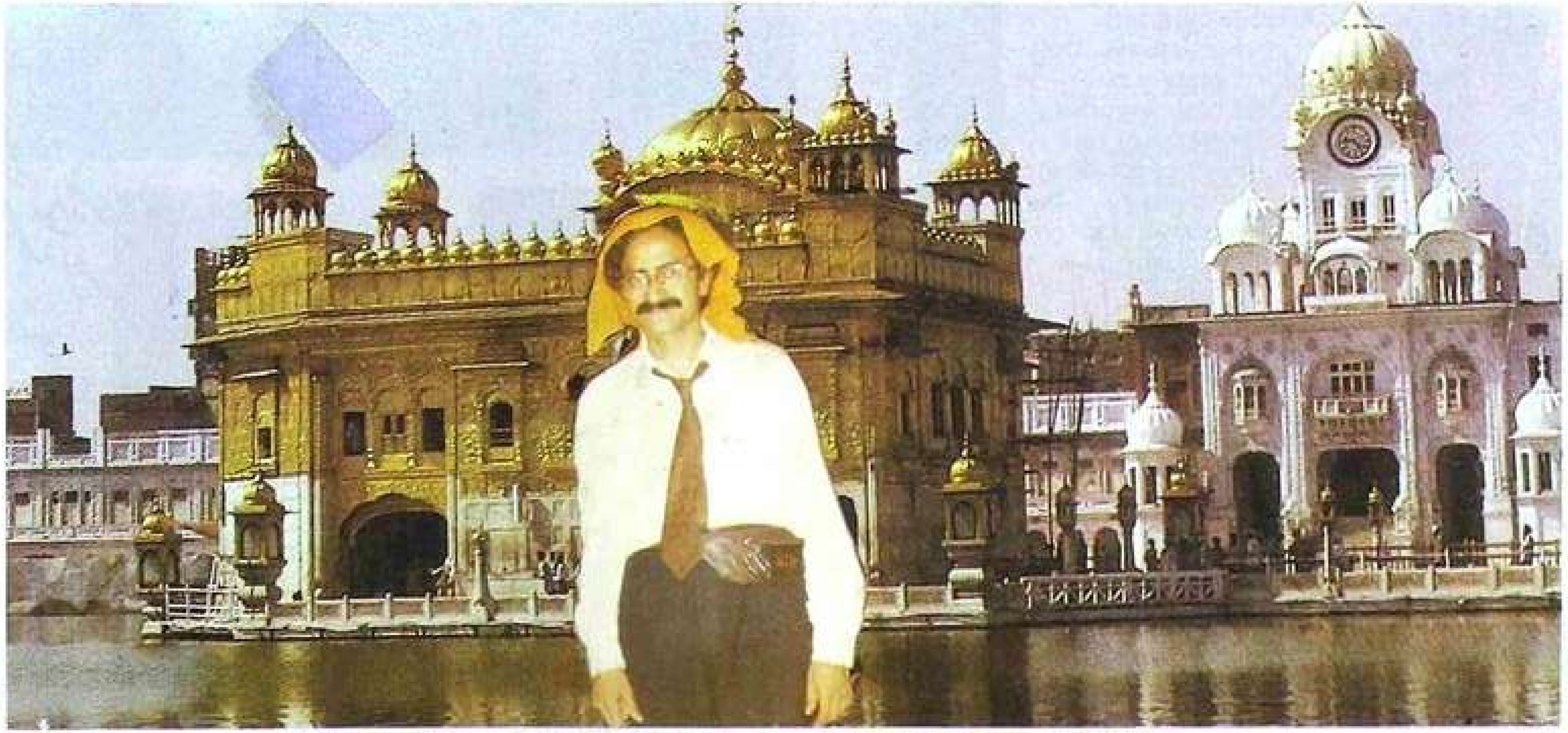




امرتسر سیمینار کے مقررین سٹیج پر



جلیانوالہ باغ کے اندر۔ دیوار پر گولیوں کے نشانات



گولڈن ٹمپل پر حاضری



کلکتہ میں امن مارچ



مہاتما گاندھی کی سمادھی پر حاضری



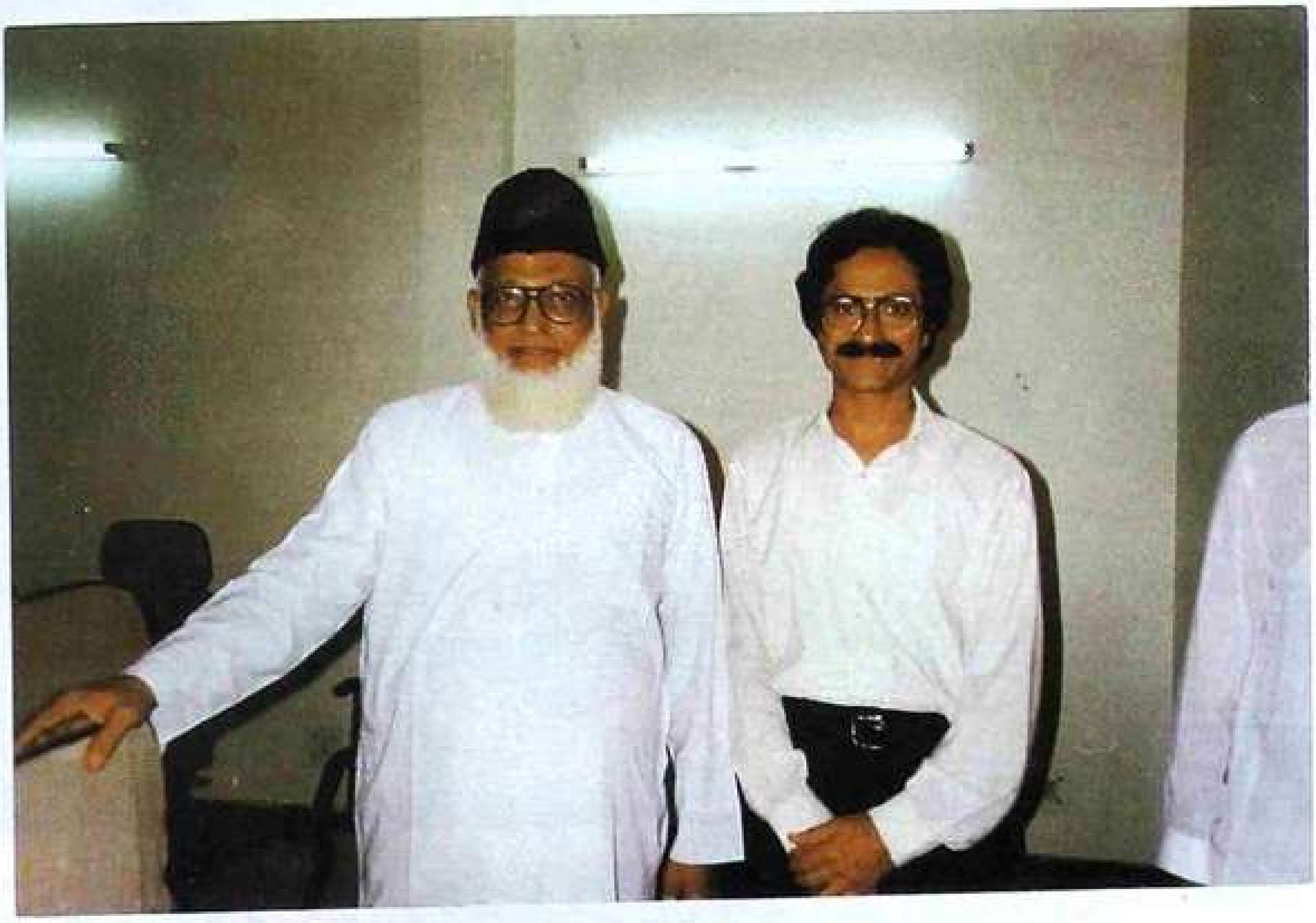
بھارت کے سابق وزیراعظم آئی کے گجرال۔ نائب ... ن کانت سٹیج پر بیٹھے ہیں
اویس شیخ تقریر کر رہے ہیں



بھارت کے نائب صدر کشن کانت سیکریٹری جنرل ساؤتھ ایشین فریٹرنٹی سیتا پال اور مصنف



جماعت اسلامی ہند کے اجتماع سے مصنف کا اظہار خیال



امیر جماعت اسلامی ہند اور مصنف



قائم مقام ہائی کمشنر خالد کھٹک اور پاکستان وفد کے ارکان

تھا۔ پھر صحافی نے پوچھا کہ کیا اس کا نتیجہ آبادی کے تبادلوں کی صورت میں برآمد ہوگا۔ ماؤنٹ بیٹن نے اس کا جواب نفی میں دیا۔ پھر ماؤنٹ بیٹن نے یہ اعلان کر کے وہاں [illegible] تمام افراد کو حیران کر دیا کہ 15 اگست انتقال اقتدار کی تاریخ مقرر کی گئی ہے۔ یہ ایک دھماکہ خیز اطلاع تھی "میں حیران ہوں کہ اس قدر عجلت میں یہ اعلان کیوں کیا گیا۔ کیا [illegible] اس کے نتائج کا احساس نہیں تھا۔ اس کی پشت پ[illegible]ج کارفرما کیا وہ حالات پر سے اپنی گرفت کھو رہے ہیں یا وہ اپنی ذمہ داریاں نبھانے کے قابل نہیں رہے۔ یوں لگتا ہے [illegible] منتقلی کو پرامن نہیں رہنے دینا چاہتے۔ کیا انہیں احساس [illegible] بے دھڑک [illegible] بن کئے گئے اقدامات افراتفری' ابتری اور قتل و غارت گری پر منتج ہوں گے۔ کیا ان میں دور اندیشی کی صلاحیت [illegible] ہے یا وہ ان قوتوں کی گرفت میں آچکے ہیں جن پر ان کا اختیار نہیں۔ ہر شخص آنے والے المیے کو ابھی سے دیکھ سکتا ہے۔ سخت حیرت ہے کہ ماؤنٹ بیٹن کو یہ المیہ نظر نہیں آتا۔ شاید وہ کوئی بڑا فساد رونما ہو۔ [illegible] پہلے خود صاف بچ نکلنا چاہتے ہیں۔ اس [illegible] تباہی کے لئے وہ تمام سیاستدانوں کو مورد الزام ٹھہرا سکتے ہیں۔ انہیں معلوم نہیں یہ ہندوستان ہے۔ جہاں معاملات عجلت میں طے نہیں کئے جا سکتے" (ایس کے موجمدار۔ جناح اور گاندھی)

یہ بات سب پر عیاں تھی کہ [illegible] تقسیم کا اصول طے ہوگیا بدامنی اور انتشار کو روکنے کیلئے فوج اور پولیس کی [illegible] پڑے گی۔ دونوں آزاد ممالک کی پولیس اور فوج کو از سر نو منظم کرنے اور انہیں علیحدہ اور موثر کاروائیوں کی حیثیت سے برسر پیکار لانے کیلئے کم از کم ایک سال کا عرصہ درکار تھا۔

[illegible] لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے پیش نظر سیاسی رہنماؤں کے یہ بیانات ہوں کہ برطانیہ کو اپنے اقتدار کو طول دینے کی کسی کوشش میں کامیاب نہیں ہو[illegible] گے۔ پنڈت نہرو کا بیان تھا "میں 15 اگست کے بعد برطانوی فوجوں کو روکنے پر ہندوستان کا ہر گاؤں جلا دینے کو ترجیح دوں گا۔ (دنیا بدل گئی ص 275)

اس سے پیشتر گاندھی یہ ا چکے تھے کہ انگریز ندوستان کو خدا کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں۔ ورنہ یہ خانہ جنگی کا شکار ہو جائے گا۔ جب انگریز ہندوستان یک تیسر کی حیثیت سے رہیں گے کوئی سیاسی حل ل سکے

آل انڈیا کمیٹی بھی "ہندوس ردو" قرا طور کر چکی تھی۔

ماؤنٹ بیٹ ہ نگاہ یہ تھا کہ پاکستان اقو ور پر ناقابل عمل اور فوجی لحاظ کمزور اور غیر محفوظ ہوگا۔ سیاسی منظم حذب اختلاف کی عدم ں میں یہ اور منقسم ہو جائے گا۔ انتشار ہوگا۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ سارا تجربہ بہت مختصر مدت کا ہوگا۔ اس کے برعک ں کی قیادت میں ایک آزاد اور جمہور ستان روز ضبوط تر ہوتا جا یہ ایک ت بن جائے گا اور اس قابل ہ ستان کو اپنے اندر مدغم کر سکے۔

اس کے برعکس دا کا ایک طبقہ رائے کا اظہار کر آیا ہے کہ برطانیہ ں جانے کا فیصلہ کر لیا ہوا تھا۔ واپس جانا ہی تھ وہ بھارت کو اتنے بڑے اور طاقتور ملک کی حیثیت میں نہیں دیکھنا چاہتے تھے انہوں نے پاکستان بنانے کا فیصلہ کر لیا اور کشمیر کا مسئلہ بھی جان بوجھ کر پیدا کیا گیا تاکہ والے وقت میں، دونوں ملکوں کے اخ نہیں ایک دوسرے کے ساتھ لڑتے رہیں۔ پاکستان فیصلہ پہلے ہوا اور پاکستان کی تحریک چلی۔ یوں پاکستان کے قیام کی اصل پشت پناہ حکومت برطانیہ تھی۔ میں کوئی کمال نہیں۔ انہیں صرف استعمال کیا گیا۔

اس سوچ کے دانشور پاکستان اور بھارت میں موجود ہیں۔ میں ذاتی طور سے اختلاف کرتا رہا ہوں۔ میں سمجھتا غیر کے مسلمانوں سمت رہنمائی کی۔ جہاں تک ماؤنٹ بیٹن ہے وہ ایسا کردار ادا کر گیا ہے جس کی تاریخ میں ہمیشہ مذمت ہوتی رہے گی۔ سے کبھی اچھے نام سے یاد نہیں کرے گی۔ جن

لوگوں کو تاریخ کا شعور ہوتا ہے وہ جہاں دیدہ اور صاحب فکر لوگ ہوتے ہیں۔ ان کی زندگی کا نقطہ نظر اپنی ذات تک محدود نہیں ہوتا۔ ان کی وسعت نظر اور خیال افروزی اپنی ذات کے خول سے نکل کر کائنات کی وسعتوں اور گہرائیوں میں غوط لگاتی ہے۔ ماؤنٹ بیٹن پتھر کی دیوار کی طرح بے حس تھا۔ پتھر کی دیوار کسی کا نقصان نہیں کرتی۔ ماؤنٹ بیٹن اس سے بھی آگے ایک بھیڑیا تھا جس نے انسانی لباس پہن لیا تھا۔ یونین جیک کو عزت کے ساتھ اسے تھمانا اور برطانوی راج کو عزت و احترام کے ساتھ رخصت کرنا دراصل وقت اور تاریخ کا جبر تھا۔ حالات اور وقت نے سب کے منہ بند کر دیئے تھے۔ برطانیہ اپنی ہر نو آبادی سے ذلیل ہو کر نکلا۔ برصغیر اس کی واحد نو آبادی تھی جہاں سے اسے عزت کے ساتھ رخصت کیا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ برصغیر کے بے گناہ انسانوں کا قتل عام کرنے کے جرم میں اسے پھانسی دی جانی چاہئے تھی اور برطانوی حکومت سے برصغیر کے عوام کو ایک سو سال تک غلام بنائے رکھنے کے جرم میں معافی کا مطالبہ کرنا چاہئے تھا۔

1940ء کی قرار داد کے بعد اکالیوں نے (جو ماسٹر تارا سنگھ اور گیانی کرتار سنگھ کی پارٹی تھی) خالصتان کا مطالبہ کر دیا۔ ان کا خیال تھا کہ اگر مسلمان اپنا علیحدہ وطن حاصل کر سکتے ہیں تو وہ کیوں محروم رہیں۔ یہ مطالبہ نیم دلانہ تھا کیونکہ انہیں اپنا الگ صوبہ حاصل کرنے کی امید نہ تھی۔ اگر سکھ مسلم لیگ کے ساتھ کسی تصفیے تک پہنچ جاتے تو ایک حد تک خون خرابے کو ٹالا جا سکتا تھا۔

مختلف مواقع پر قائداعظم نے سکھوں کو یقین دلایا کہ پاکستان میں ان کے حقوق کا تحفظ کیا جائے گا۔ انہیں کسی طرح کا خدشہ نہیں ہونا چاہئے۔ انہوں نے سکھوں کو مذاکرات کی دعوت دی۔ تاکہ وہ اختلافات کو دور کرلیں اور مسلمانوں کے ساتھ کسی سمجھوتے تک پہنچ جائیں۔ لیکن سکھ یہی سمجھتے رہے کہ مسلمان انہیں تباہ کرنا چاہتے ہیں۔ دوسری طرف خالصتا" کے قیام کے مطالبے پر انہیں کانگریس کی حمائت بھی حاصل نہ ہوئی۔ جناح اور لیاقت نے سکھ والیان ریاست سے بھی بات چیت کی تا کہ وہ

افہام و تفہیم کے ذریعے کسی نتیجے تک پہنچ سکیں۔ جناح پاکستان کی حدود میں سکھوں کو علیحدہ ہوم لینڈ دینے پر بھی آمادہ تھے۔ جہاں وہ ریاست کے روز مرہ کے معمولات اور انتظامی امور میں خود مختار رہ سکتے تھے۔ انہوں نے سکھوں کو ہر قسم کی دیگر مراعات دینے کا اعلان کیا۔ لیکن ان پر کوئی دلیل کارگر نہ ہوئی۔ سکھوں کی ضد کی وجہ سے مسلمانوں نے ان کی جانب اپنا رویہ سخت کر لیا۔ سکھ سیدھے سادھے بے تکلف لوگ ہیں جو کام پہلے کرتے اور سوچتے بعد میں ہیں۔ جب ماؤنٹ بیٹن نے اپنے منصوبے کا اعلان کیا تو سکھوں نے قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اپنے جنگجو طبقے کی رہنمائی اور اپنے لیڈروں کی معاونت سے انہوں نے اپنے آپ کو جتھوں کی شکل میں منظم کرنا شروع کر دیا۔ انہوں نے طاقت اور دہشت گردی کے طریقے اپنا لئے تھے۔

15 اپریل کو سکھ فرقے نے ایک پمفلٹ شائع کیا جس کا متن مندرجہ ذیل ہے۔

"او خالصہ جی! پنتھ کیلئے ایک سنگین صورت حال پیدا ہو گئی ہے۔ جو گذشتہ بڑے گھلوگھڑے (سکھوں کے قتل عام) کے بعد رونما ہوئی۔ یہ گھلوگھڑا جو خاص طور سے پوٹھوہار اور سرحد میں ہوا ناقابل بیان حد تک دردناک ہے۔ اور ابھی یہ نہیں معلوم کہ مستقبل کیا کچھ رنگ لائے گا۔ وقت بے انتہا نازک ہے اور صورت حال سنگین۔ اب ہمارے معاملات "تخت یا تختہ" کی حد تک پہنچ چکے ہیں۔ اس موقع پر پنتھ کے وجود کو برقرار رکھنے کے لئے ہر سکھ کو گرو کے پنتھ سے متعلق اپنا فرض ادا کرنا چاہئے۔ پنتھ سے وفاداری ہی میں سکھ کی زندگی مضمر ہے۔ اپنی طاقت کے بل بوتے پر مسلمان سکھوں ہندوؤں اور عیسائیوں پر پاکستان مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ وہ پاکستان کے طوفان کا ایک نمونہ ہمیں ابھی دکھا چکے ہیں۔ انہوں نے اپنے اکثریت والے علاقوں میں ایسے ظلم و تشدد کا ارتکاب کیا ہے۔ جو بیان سے باہر ہے۔ ہزاروں سکھ ہندو عورتیں اور بچے مار ڈالے گئے ہیں۔ سینکڑوں آدمیوں کے کیس اور داڑھیاں مونڈ ڈالی گئی ہیں اور ان کو مسلمان بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ سینکڑوں عورتیں اغوا کر لی گئی ہیں۔ گاؤں کے گاؤں جلا دیے گئے ہیں۔ سینکڑوں پاکیزہ خواتین نے کنوؤں میں چھلانگیں لگا دیں اور اپنی

عزت بچانے کیلئے کئی دوسرے طریقوں سے اپنی جانیں قربان کر دیں۔ پنتھ جو دوسروں کی لڑکیوں کو بچانے پر فخر کرتا تھا۔ آج اسی کی لڑکیاں ظالموں کے ہاتھوں میں ہیں۔ آپ لوگ یقین رکھیں کہ یہ تو پاکستان کا ایک چھوٹا سا نمونہ ہے۔ اس سے زیادہ دہشت ناک واقعات ابھی رونما ہونے ہیں۔ لیکن خالصہ جی! ہم اس گرو کے سکھ ہیں۔ جنہوں نے اپنے چار بیٹوں کے قتل ہو جانے پر کہا تھا "کیا ہوا اگر چار ختم ہوگئے۔ ابھی ہزاروں زندہ ہیں" ہمیں اس ظالم پاکستان سے لڑنا ہے اور پنتھ کی عصمت کو برقرار رکھنا ہے۔ ہر گھلو گھڑے کے بعد یہ پنتھ اور زیادہ پھلتا پھولتا رہا اور آپ مطمئن رہیں کہ پنتھ اب بھی پھلے پھولے گا۔ آپ مستعد رہئے اور اپنی طاقت کو دوبارہ بحال کیجئے۔ اس وقت ہمیں پاکستان سے لڑنے کے لئے جس میں ہماری موت مضمر ہے پچاس لاکھ روپے کی ضرورت ہے۔ ہر چند کہ ہماری قوم غریب ہے۔ لیکن دسویں گرو کے نام پر قربانیوں کے طفیل یہ مورچہ فتح کرتی رہی ہے۔ یہ ہماری پر زور اپیل ہے کہ ہر گھر، ہر محلّہ، ہر شہر اور ہر گاؤں سے روپیہ جمع کیا جائے تاکہ آئندہ تصادم میں فتح حاصل کی جا سکے۔ ایک روپیہ فی آدمی جمع کرو۔ ہر قصبے اور ہر گاؤں کا یہ مذہبی فریضہ ہے کہ وہ اپنے یہاں کی کمی کو پورا کریں۔ اس طرح پچاس لاکھ روپیہ بہت جلد جمع ہو جائے گا۔ اس بیساکھ کے مہینے سے خالصے کی نشاۃ الثانیہ کا آغاز ہونا چاہئے۔ اور تاریخ میں سکھوں کی حوصلہ افزائی کا سبب بننا چاہئے۔ علاوہ ازیں تمام سکھوں سے یہ درخواست کی جاتی ہے کہ وہ اپنی آمدنی کا دسواں حصہ اس کام کے لئے وقف کر دیں اور ہر گھر میں آٹا گوندھتے وقت ایک مٹھی بھر آٹا گرو کے فنڈ کیلئے علیحدہ رکھ دیا جائے۔

نوٹ:

اس رقم کو وصول کرنے کے لئے وزیر دفاع حکومت ہند سردار بلدیو سنگھ، سردار باغ سنگھ ایڈووکیٹ اور تیجا سنگھ ہال خزانچی مقرر ہوئے ہیں" اس عبارت کے نیچے دوسروں کے علاوہ ماسٹر تارا سنگھ اور کرتا سنگھ گیانی کے دستخط تھے۔ (دنیا بدل گئی صفحہ 237 - 238)

سکھ کہتے ہیں کہ انہوں نے جو کچھ کیا وہ مغربی پنجاب میں سکھوں کے ساتھ مسلمانوں کے سلوک کے رد عمل کے طور پر کیا۔ نواکھلی اور کلکتہ کے واقعات بھی انتقامی کاروائی کا نتیجہ بنے۔ اس طرح جوابا" دونوں طرف سے انتقامی کاروائیوں کا سلسلہ جاری رہا۔ یوں تشدد تشدد کو جنم دیتا رہا۔

لاہور میں تشدد کے واقعات مسلمانوں کی طرف سے ہوئے۔ اور کہا جاتا ہے کہ یہ امرتسر میں مسلمانوں کے قتل عام کا رد عمل تھا۔ یہاں بڑی وجہ پولیس کی فرائض سے غفلت تھی۔ مسلم لیگ نیشنل گارڈ بھی فسادات کی آگ کو ہوا دینے میں اپنا کردار ادا کرتی رہی۔ لاہور شہر کا دس فیصد حصہ آتش زنی کی نظر ہوگیا۔ سوم آنند نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ مسلمانوں کے لئے ہندوؤں کو مارنا اور شہر سے نکالنا اقتصادی وجوہ کی بنا پر بھی تھا۔ یہ تو صحیح ہے کہ پنجاب میں اکثریت مسلمانوں کی تھی۔ مگر صنعت و تجارت' زراعت' بڑی بڑی کوٹھیاں' اونچی اونچی عمارتیں اور اچھے اچھے کپڑے تو ہندوؤں کے پاس ہی تھے۔ اقتصادی حالت میں اتنا فرق عام مسلمانوں کے دلوں میں قدرتی طور پر حسد کی آگ بھڑکاتا رہا۔ فرقہ پرست تنظیمیں غریب مسلمانوں کی جھلاہٹ اور غم و غصے کا رخ مذہب کی طرف پھیر دیتیں۔ ان کے لئے یہ کام آسان تھا۔ کیونکہ کھاتے پیتے بیشتر لوگ غیر مسلم تھے۔ ان جذبات کا لاوا اندر ہی اندر برسوں سے سلگ رہا تھا 1947ء میں وہ پھوٹ پڑا۔ ایک ہندو نے بتایا کہ وہ تقسیم ہند سے پہلے لاہور کے ایک مسلمان محلے راج گڑھ میں رہتا تھا۔ فسادات کے دوران مار پیٹ میں شرکت کے لئے نچلے طبقے کے مسلمانوں کی رات دو دو بجے تک میٹنگیں ہوتیں ان میں بار بار یہی بات کہی جاتی کہ ہندوؤں کو مار بھگانے کے بعد ہم ان کی کوٹھیوں میں رہیں گے ان کے کپڑے پہنیں گے اور ان کی کاروں پر قبضہ کرلیں گے۔ اس لئے یہ کہنا غلط نہیں کہ مسلمانوں کی جارحانہ فرقہ پرستی کو بڑھاوا دینے میں ان کی اقتصادی پستی کا بڑا ہاتھ تھا۔

سابق امیر جماعت اسلامی پاکستان میاں طفیل محمد نے ہفت روزہ رسالے "زندگی" کو ایک انٹرویو دیا جو 4 - 10 اکتوبر 98ء کو چھپا۔ اس انٹرویو میں انہوں نے کہا۔ "مجاہدین

پاکستان تو اس وقت (پارٹیشن کے وقت) زیادہ سے زیادہ مال غنیمت سمیٹنے میں مصروف تھے۔ اس لئے کہ ہندوؤں اور سکھوں کے سارے مکانات اور املاک لوٹ مار کے لئے کھلے پڑے تھے۔" دوسری طرف ہندوؤں کی لیڈرشپ بھی اقتصادی طور پر مسلمانوں کو پست رکھنے کی شعوری کوششیں کرتی رہی۔ سر فضل حسین نے پنجاب میں جب اپنی وزارت بنائی اور سرکاری محکموں میں نوکریاں دینے کے لئے مسلمانوں کا کوٹہ مقرر کیا تو پنجاب کے کانگرسی لیڈروں نے اس پر سخت احتجاج کیا تھا۔

سوم آنند کے ان خیالات سے میں کلی طور پر متفق نہیں۔ کسی محلے میں اگر کوئی ایسی میٹنگ ہوئی ہے تو کون کہہ سکتا ہے کہ ہندوؤں اور سکھوں نے ایسی کوئی میٹنگ نہ کی ہوگی۔ جب وحشت اور درندگی کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا تو اس میں کئی طرح کے مفادات بھی لوگوں کی حرص و ہوس کو بڑھانے لگے ہوں گے۔ کسی محلے کی اس طرح کی ایک میٹنگ کو اس وقت کی عمومی نفسیات نہیں کہا جا سکتا۔ ہر شخص کو اپنا گھر پیارا ہوتا ہے۔ امرتسر کے مسلمان ہوں یا لاہور' راولپنڈی کے سکھ ہندو۔ کوئی بھی اپنا گھر چھوڑنے کو تیار نہ تھا۔ اصل مصیبت تو اتنی بڑی آبادیوں کی ایک جگہ سے دوسری جگہ پر منتقلی تھی۔ دنیا میں ملک تقسیم ہوئے ہیں لیکن اس طرح اتنی بڑی آبادیوں کا تبادلہ اور انخلاء شاید ہی کہیں ہوا ہو۔ پاکستان کے بزرگ دانشور عبدالحمید خان جنہوں نے تحریک پاکستان میں حصہ لیا۔اس وقت ان کی عمر 20 سال تھی۔ ان کا خیال ہے کہ اگر 1946ء کے الیکشن میں بھارت کے مسلمانوں کو یہ معلوم ہوتا کہ پاکستان بننے کی صورت میں انہیں اپنا گھربار چھوڑ کر دوسری جگہ منتقل ہونا پڑے گا۔ تو وہ مسلم لیگ کو ووٹ نہ دیتے۔

مسلمانوں کے اقتصادی حالات ہندوؤں اور سکھوں کے مقابلے میں واقعی خراب تھے۔ لیکن ہندوؤں کی مسلمانوں کے ساتھ سماجی ناانصافیاں اور انہیں کم تر انسان سمجھنے کا سماجی رویہ بھی مسلمانوں کو دکھتا تھا۔ ہندوؤں کے ہاں چھوت چھات کے نظام نے مسلمانوں کو ذہنی اور سماجی طور پر چھلنی کر دیا تھا۔ میری والدہ نے بتایا کہ عمومی طور پر

ہندو ہمسایوں کے ساتھ ہم امن اور سلوک سے رہتے تھے۔ ہمارا آنا جانا تھا تاہم کئی مرتبہ ان کی عورتوں کا رویہ تفریق پر مبنی ہوتا۔ وہ چھوت چھات پر یقین رکھتے تھے۔ میں نے لوگوں سے یہ سنا کہ مسلمان ہندوؤں کے پانی کے برتن استعمال نہیں کر سکتے تھے۔

اس تمام پس منظر میں یہ سمجھنے میں آسانی ہوگی کہ پارٹیشن کے عمل سے گزرتے وقت دونوں طرف سے غلطیاں سرزد ہوئیں۔ آبادیوں کے اتنے بڑے انخلاء کے غیر معمولی عمل میں بہت کوتاہیاں برتیں گئیں۔ تلخیوں' رنجشوں' نفرتوں' بداعتمادیوں' خوف اندیشوں اور ناامیدیوں کے اس سمندر سے گزرتے ہوئے خوفناک ٹکراؤ کا خدشہ موجود تھا۔ ایسے وقت میں برطانوی حکومت کی ذمہ داری تھی کہ وہ تدبر' حکمت و فراست جرات' معاملہ فہمی' سیاسی سوجھ بوجھ بصیرت اور انسان دوستی کے جذبوں کا مظاہرہ کرتی۔ اس کی چشم پوشی مجرمانہ فعل تھا۔ اتنی بڑی آبادی کے انخلاء کے وقت برطانوی سرکاری افسران اور مسلح افواج کے نمائندوں نے اپنی ذمہ داریاں پوری نہ کیں۔ پارٹیشن پلان کے اعلان میں بے حد تاخیر کی گئی۔ جس سے افواہوں نے جنم لیا اور سکھوں میں ابہام پھیل گیا۔ ماؤنٹ بیٹن اپنی ضد پر قائم رہے۔ انہوں نے کہا کہ انہیں ایوارڈ 13 اگست کو ملا اور انہوں نے 15 اگست کو اس پر دستخط کئے۔ ہر شخص جانتا ہے یہ سب جھوٹ تھا۔ ماؤنٹ بیٹن چاہتے تھے کہ یہ خون خرابا اس وقت ہو جب دونوں مملکتوں کا قیام عمل میں آجائے۔ تاکہ اس کی ذمہ داری ان پر نہ آئے۔ ماؤنٹ بیٹن ایک مغرور انسان تھا۔ جس کے ہاتھوں پر خون کے دھبے اور دامن پر بے رحمی کے داغ تھے۔ پنڈت نہرو' گاندھی' جناح اور دوسرے لیڈر برطانوی حکومت کو بہتر تجاویز دیتے رہے اور موقع بہ موقع صحیح اقدام کرنے کی ضرورت پر زور دیتے رہے۔ انہوں نے ہر چند فرقہ وارانہ فسادات روکنے کی اپنی اپنی مقدور بھر کوششیں کیں۔ لیکن تمام سیاسی جماعتیں فرقہ وارانہ فسادات روکنے میں بے بس ہو گئی تھیں۔

دراصل اس ماحول میں فرقہ وارانہ امن و آشتی کی گفتگو بے معنی تھی۔ لاہور جل

رہا تھا۔ امرتسر میں مسلمانوں، مغربی پنجاب میں ہندو سکھ اس فکر میں تھے کہ کسی طرح اپنی جان بچا کر بھاگ نکلیں۔ ایسے وقت میں اتحاد کی باتیں سننے کی کسے فرصت تھی۔ ہندوستان میں [illegible] آندھی چل [illegible] اور فرقہ وارانہ اتحاد کی باتیں کرنے والے تنکوں کی مانند تھے۔ جنہیں وہ آندھی اپنے ساتھ اڑا کر لے گئی۔ جناح مسلم لیگ کی قیادت کر رہے تھے۔ انہوں نے برطانوی حکومت کے سامنے اپنا مقدمہ [illegible] ور اسے کامیابی سے لڑا۔ وہ مسلمانوں کی سماجی سیاسی اقتصادی حالت کو بدلنا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ہندوستان کی آزادی کے بعد یہاں کے مسلمان [illegible] کے اقتصادی غلام بن کر [illegible] گے۔ [illegible] کوئی مذہبی جماعت نہ تھی نہ [illegible] ن کا حصول کوئی مذہبی لڑ [illegible] سلامی نظام کے قیام کی تحریک تھی۔ اس تحریک نے خالصتاً" مسلمانوں کی اقتصادی سماجی بدحالی اور سیاسی تشخص کی پامالی سے جنم [illegible] کا ثبوت جناح [illegible] یر ہیں جو پاکستان کے قیام کے بعد انہوں نے [illegible] س میں ریاستی امور کی [illegible] میں ہندوؤں، مسلمانوں، عیسائیوں، سکھوں کی [illegible] کو رد کر دیا تھا [illegible] دینے کی بات کی گئی تھی۔ قائداعظم نے مذہب کو انسان کا ذاتی [illegible] قرار دیا [illegible] لم لیگ میں جاگر [illegible] ے ہوئے تھے جو آستین کا سانپ تھے۔ وہ پاکستان بن جانے کے بعد انگریزوں سے حاصل جاگیروں [illegible] کر لینا چا [illegible] ۔ جس کے لئے [illegible] نے بعض ایسے مذ [illegible] اور علماء کی [illegible] حاصل کیں [illegible] اس تحریک کو زیادہ سے زیادہ مذہبی رنگ دینے میں کامیاب ہوگئے۔ انہوں نے اسلام خطرے میں ہے' کا نعرہ لگوا دیا۔ کانگریس نے جب [illegible] یہات کے مسلمان [illegible] عوامی را [illegible] یک مہم کا آغاز کیا [illegible] ریس کا ممبر [illegible] کے۔ تو [illegible] نے اس پر اپنے [illegible] کا اظہار کرتے ہوئے وا [illegible] غاظ [illegible] اسلام خطرے میں ہے۔ یہ نظریہ [illegible] ں سے مقبول [illegible] گ [illegible] ص 21)
[illegible] فرقہ وارانہ ہم آہنگی قائم کرنے کے لئے مختلف [illegible] نشیں کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ قانونی اور آئینی ذرائع اختیار کرنے کی ضرورت پر زور دیتے رہے۔

لاہور میں مسجد شہید گنج کی عمار ـــــ پر ہندوؤں مسلمانوں اور سکھوں کے
درمیان شدید فرقہ وارانہ کشیدگی پھیل گئی۔ مسجد کی پرانی عمارت پر مسلمانوں نے دعویٰ
س دعوے کو سکھوں نے مسترد کر دیا۔ صورت حال وگئی تو جناح
سے اس مسئلے ـ کے لئے انہوں نے لاہور ا ر ایک جلسے سے خطا
کرتے ہوئے کہا۔

"ہم شہید گنج پر اپنا دعویٰ ترک نہیں کریں گے۔ لیکن برادر مذہبی گروپ
کے ساتھ عزت مندانہ مفاہمت پیدا کرنے کے ـ لمن کوش گے۔
برادر مذہبی ـ کو خوفزدہ کرنے کا سوچ بھی نہیں سکھ ایک سیم کمیونٹی ہیں
اور ان ـ آبرو مندانہ معاہدے سے بڑھ کر ـ لئے کونسی بات خوش کن ہو
(جناح از ایم۔ ا صفحہ 37 - 532)

جناح کی پیش رفت پر ایک مضبوط مصالحتی کمیٹی قائم ہوئی۔ جس میں سردار بوٹا
سنگھ، راجہ نریندر ناتھ، سر محمد اقبال ، ہندو سکھ مسلمان رہنما شامل تھے۔
یہ جھگڑا خوش اسلوبی سے طے
گورنر نے کہا ورت حال میں اس بہتری سٹر جناح کی کوششوں کا تہہ
دل سے شکریہ ادا
پاکستان بن چکا ہے۔ ماؤنٹ بیٹن نے پاکستان ی میں اپنے خیالات
کا اظہار کیا اور ملکہ معظم کا پیغام پڑھ کر سنایا۔
عوام کی اکثریت نمائندوں کی جدوجہد میں معاون نہ ہوتی یا اس اپیل پر
کان نہ دھرتی جو مسٹر جناح ما گاندھی نے مشترکہ طور پر کی تھی اور جسے مستقبل
کی حکومت نے پار ٹیشن کے بیان کے ذریعے بار بار دہرایا تھا۔ تو اس وہ
خوفناک واقعات رو ہ تھے۔
ابھی ابھی دنیا کے اسی حصے میں ہماری مشکلوں نے پھگلانی ہے اور
بہت سی رکاوٹوں کو دور تار سے آگے بڑھا دیا ہے پیچھے مڑ کر

دیکھنے کا وقت نہیں ہے۔ صرف آگے دیکھنے کا وقت آن پہنچا ہے۔ کیا میں آپ کو یاد دلاؤں کہ صرف چار سو سال پہلے جب ایسٹ انڈیا کمپنی کو پروانہ تجارت ملا تو آپ کا عظیم شہنشاہ اکبر یہاں تخت نشین تھا۔ اس کے دور حکومت میں یہاں اتنی سیاسی و مذہبی رواداری تھی کہ جو نہ اس سے پہلے اور نہ کبھی اس کے بعد دیکھی گئی۔ میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہ ایسی مثال تھی جس سے ہمارے عوام اور انتظامیہ کی کئی نسلیں متاثر ہوتی رہی ہیں۔ میں دعا کرتا ہوں کہ ہم آنے والے برسوں میں اس عظیم بادشاہ کے سکھائے ہوئے اصولوں پر سختی سے عمل پیرا ہوں۔ خدا کرے کہ پاکستان ہمیشہ خوشحالی کی طرف گامزن رہے اور یہ ملک اپنے پڑوسیوں اور دنیا کی تمام اقوام کے ساتھ دوستی برقرار رکھے۔

جناح نے جوابی تقریر میں کہا۔ "میں بھی انہی جذبات و احساسات کا اعادہ کروں گا۔ جو برطانیہ کی ملکہ معظمہ نے کیا ہے۔ وہ خیر سگالی اور رواداری جس کا اظہار اکبر اعظم نے غیر مسلموں سے کیا کوئی حال کی بات نہیں ہے۔ اس کی ابتداء 15 ویں صدی پہلے ہوئی جب ہمارے پیغمبر نے صرف زبانی ہی نہیں بلکہ عملی طور پر یہودیوں اور عیسائیوں پر فتح پانے کے بعد ان سے حسن سلوک کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے ان کے دین اور عقیدوں کے بارے میں انتہائی رواداری' لحاظ اور احترام کا مظاہرہ کیا۔ مسلمانوں کی ساری تاریخ جہاں بھی انہوں نے حکومت کی شرافت اور انسان دوستی کے ان اصولوں سے بھری پڑی ہے۔ جن پر ہمیں عمل پیرا ہونا چاہئے۔

میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہم اپنے ہمسایہ ملکوں اور دنیا کی تمام اقوام کے ساتھ جذبہ دوستی و خیر سگالی کے اظہار میں دیر نہیں کریں گے۔"

حالات اور وقت نے آہستہ آہستہ سب کچھ بدل کر رکھ دیا۔ شعور نے وحشت پر غلبہ پا لیا۔ انسانی تہذیب اپنی فطرت کی طرف لوٹی۔ اس نے اپنی اصل کی طرف انگڑائی لی تو احساس ہونے لگا کہ ملک کی تقسیم کے وقت ہم ناحق ایک دوسرے کا گلا کاٹتے رہے۔ ہم غلطیاں کرتے رہے۔ ہم سب کا اپنا اپنا مذہب ہے۔ کوئی مذہب کسی

دوسرے مذہب دین دھرم کے افراد کو نقصان پہنچانے کا حق نہیں دیتا۔ اس کی عزت لوٹنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اس کا گھر بار جلانے اور اسے تباہ کرنے سے منع کرتا ہے۔ بچوں' بوڑھوں' عورتوں پر تشدد سے روکتا ہے۔ سعادت حسن منٹو نے کہا تھا یہ نہ کہو اتنے مسلمان قتل ہو گئے اتنے سکھ ہندو مارے گئے یہ کہو اتنے انسان قتل ہو گئے۔ ہمیں گاندھی اور جناح کی اس خواہش اور اپیل پر عمل کرنا ہوگا "بھارت اور پاکستان کے شہریوں کو پارٹیشن کی تلخیوں کو بھلا کر انسانی رشتوں کی تاریخ کا نیا باب رقم کرنا ہوگا اور پر امن بقائے باہمی کے اصولوں کی روشنی میں نئی زندگی ڈھونڈنا ہوگی"

1951ء میں امرتسر کا بارڈر کھلا تھا۔ لوگ لاہور آکر کرکٹ میچ دیکھتے تھے۔ مسلمان اور ہندو ایک دوسرے کو گلے ملتے تھے۔ دوکانداروں سے پھل کھانے کے پیسے نہیں لیتے تھے۔ ہوٹل والے فری کھانا کھلاتے۔ ٹانگے والے کرایہ نہ لیتے۔ لاہور کے مال روڈ پر ہندو' سکھ' عیسائی ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے چلے جاتے۔ اس وقت لاہور لاہور بن گیا تھا۔ مسلمان ہندوؤں کے جن گھروں میں آباد ہوگئے تھے۔ ان کو انہی گھروں میں لے گئے۔ اور اپنے پاس بٹھایا۔ جہاں ہندوؤں نے اپنے گھروں کے باہر کی مٹی کو چوما اور روئے۔ بقول بیگم طاہرہ مظہر علی مسلمانوں کو میں نے یہ کہتے سنا" لالہ جی۔ تسی اپنے گھر سوؤ۔ اسی باہر سوواں گے"

1996ء میں لاہور میں پاک بھارت کنونشن ہوا۔ جس میں دونوں ملکوں کے سو سو افراد نے شرکت کی۔ بھارتی وفد میں شامل ایک مندوب ایس کے۔ باندھو پدھایا میرے گھر مہمان بن کر ٹھہرے۔ وہ دہلی سے شائع ہونے والے انگریزی میگزین "سانتھا کل" کے ایڈیٹر اور بھارت کی مشہور سماجی و سیاسی شخصیت ہیں۔ بھارت واپس جا کر انہوں نے اپنے رسالے میں ایک مضمون لکھا جو انہوں نے لاہور میں کنونشن کے تمام شرکاء کو بھیجا۔ اس کا ایک اقتباس تھا "ہم لاہور میں اویس شیخ کے گھر مہمان تھے۔ وہاں ہمیں بے حد اپنائیت اور دوستی کا ماحول ملا۔ حتیٰ کہ ہم ان کے کچن میں بھی جا کر خواتین سے تبادلہ خیال کرتے رہتے تھے۔ پاکستانی بھائیوں کی یہ گھریلو مہمان نوازی میسر

نہ آتی تو ہم صرف کنونشن تک ہی محدود رہتے۔ اس طرح پاکستانیوں کی گرمجوشی اور مہمان نوازی کی اعلیٰ صفات کو دیکھنے سے محروم رہتے۔ میں نوجوان اویس شیخ ایڈووکیٹ ان کی بیوی اور بچوں کی محبت اور رواداری کو کبھی نہیں بھلا سکتا۔ ان کی بیٹی مہکار شیخ بیٹے ہارون اور شاہ رخ نے تو اپنا بیڈ روم اپنے بھارتی مہمانوں کے لئے خالی کر دیا۔ وہ ہمیں ہر سہولت مہیا کرنے کے لئے کھڑے رہتے۔ ان کی بیوی بھی ہماری مہمانداری میں پرجوش تھیں۔ انہوں نے ہمیں بڑے فخر سے بتایا کہ وہ آزادی ہند کے فریڈم فائٹر شریف متین کی بیٹی ہیں۔ شریف متین کا مریڈ بھگت سنگھ شہید کے ہمعصر اور قریبی دوست تھے۔ دونوں "بھارت نوجوان سبھا" تنظیم سے منسلک رہے۔ شریف متین بعد میں لاہور میں کانگریس لیڈر کے طور پر کام کرتے رہے۔ انہوں نے ایک موقع پر انگریزوں کے خلاف جدوجہد میں بھگت سنگھ کی شہادت پر پورے لاہور میں ہڑتال کروائی تھی۔ میں مختصر وقت میں جو کچھ سمجھ سکا ہوں وہ یہ ہے کہ دونوں ملک ایک دوسرے کی آزادی اور خود مختاری کا احترام کرتے ہوئے ایک دوسرے کے قریب آسکتے ہیں۔ ہمارا کلچر و ثقافت اور بود و باش صدیوں سے اکٹھی رہی ہے۔

سیاسی تقسیم کو ایک حقیقت تسلیم کرتے ہوئے ہم ابھی بھی ایک دوسرے کے ساتھ محبت پیار سے رہنے کی ابتداء کر سکتے ہیں۔

مجھے اویس شیخ کے گھر کے دروازے پر چاک کے ساتھ لکھے ہوئے یہ الفاظ ابھی تک یاد ہیں۔ جو اویس شیخ کے بچوں کے جذبہ حب الوطنی کی یاد دلاتے ہیں۔ "We love Pakistan." میں بھارت واپس جاتے ہوئے ان کو دہرا رہا ہوں۔

"We love Pakistan."

دو ملکوں کے درمیان جب لڑائی کی نوبت آجاتی ہے۔ تو انسانی خون بہنے کے علاوہ دماغوں کا توازن بھی بگڑ جاتا ہے۔ یورپ میں بھی یہی کچھ ہوا۔ دنیا نے دیکھا کہ پہلی جنگ عظیم کے دوران انگلستان میں اہل دانش کی پوری کھیپ جرمنی سے اور جرمنوں سے نفرت کرتی تھی۔ برصغیر میں اگر یہی کچھ ہوا تو تعجب نہیں کرنا چاہئے۔ فرق صرف

یہ ہے کہ ہمارے ہاں نفرت کے بیج پہلے بوئے گئے تھے۔

ہمیں یورپ سے، سبق سیکھنا چاہئے جنہوں نے عالمی جنگوں کی تلخیوں کو بھلا کر نئے معاہدے کر لئے۔ دوستی اور تعاون کے۔ آگے بڑھنے کے۔

پاکستان اور بھارت کے سیاستدان اور حکومتیں جنہوں نے ہند دشمنی اور پاکستان دشمنی کو حب الوطنی کا معیار بنا لیا ہے۔ ان کو اپنی سوچ اور پالیسیوں کو بدلنا ہوگا۔

دونوں ملک ایک دوسرے کی آزادی کا احترام کرتے ہوئے آپس میں امن اور دوستی سے رہنے کا سمجھوتہ کر لیں تاکہ زمانے کے بہاؤ میں اکھڑنے سے بچ جائیں۔

کلکتہ کا فٹ پاتھ

رات ساڑھے بارہ اَ تت ہوگا ہمارا وفد وزیراعلیٰ کی طرف سے عشائیہ کی دعوت سے فارغ اپس اپنے ہوٹل جا رہا تھا۔ سردی ہونے کی وجہ سے بس کھڑکیوں کے شیشے بند تھے۔ میں بس کی کھڑکی کی جانب بیٹھا تھا۔ اور باہر کے منظر ٥ جائزہ لے رہا تھا۔ چھوٹی بڑی عمارتیں' دَ رخت' ٠ سائیکل رکشہ' ٹیکسی' کاریں بلند و بالا عمارتیں فٹ پاتھ پر سوئے ہو۔ ' پیدل گ ' سب اپنا اپنا تاثر جا رہے تھے جو میری سوچ اور تانے بانے بن رہے تھے۔ سوچوں کا اَیک سمندر تھا جو ذہن میں ارتعاش پیدا کر رہا تھا۔ کیسا عجیب و غریب ملک ہے۔ غربت دیکھو تو کو آئے۔ مجبور اور بے بس لوگوں کا جم غفیر وقت کے تھپیڑوں میں ہچکولے کھا رہا ہے۔ مجبوری ہے۔ اداس چہرے' پھیکَ گال۔ مردہ بے جان جسم۔ اسی لمحے اسی ماحول ا میں شاندار عمارتوں کا پسیلاو ہ ریوں ی لمبی قطاروں میں امیر خوشحال کھاتے پیتے لوگ۔ یہ ایک شہر ہی نہیں پورا بھارت زندگی کے ان تضادات سے ہے۔ جدید زندگی کی سہولتوں سے آراستہ ترقی یافتہ زما ہر چیز میسر اور ا آس پاس پر پھیلائے غربت کے اندو نہاک سائے۔

یہ غریب اور امیر کی دو دنیائیں ہیں جو ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ ایک کی دنیا زندگی کی ہر سہولت سے محروم اور دوسرے کی دنیا ہر سہولت سے آراستہ۔ یہاں کی مڈل کلاس ھی بہت بڑی تعداد میں جو زندگی نہ کچھ سہولتیں حاصل کرنے میں مصروف عمل نظر آئے گی۔

زندگی کی ساری نعمتیں خوشیاں سہولیں سب میں تقسیم نہیں ہوئیں۔ خدا نے سب کو ایک جیسا پیدا کیا ہے تو پھر ان کا قصوروار کون ہے ان کے پاس بے کے لئے کچھ بھی نہیں۔ کہیں نہ کہیں گڑ بڑ ہوگئی۔ کسی نے کسی پر ظلم کیا ہوگا۔ ایک نے کے حق کو مار لیا ہوگا۔ تبھی تو چند لوگوں کے پاس اتنی نعمتیں جمع ہوگئیں اور زیادہ لوگ محروم رہ گئے۔ بھارت صنعت میں اتنی ترقی کی فٹ پاتھ پر بیٹھے

خاندانوں کو مکان نہیں دے سکا۔

ساری خرابی اس نظام کی ہے۔ یہ نظام ظالمانہ ہے۔ ہم دونوں ملک ایک ہی نظام کے ڈسے ہوئے ہیں۔ سرمایہ دار' وڈیرے' ملاں' پنڈت' بیوریوکریسی' پولیس' کمشنر' کلکٹر' تحصیلدار' اسٹیبلشمنٹ' سب ایک طبقے کے لئے بنائے گئے تھے۔ انگریز نے ان کے ذریعے عوام پر حکومت کی۔ انگریز کب کا جا چکا۔ لیکن ہم اس نظام کو بدل نہ سکے۔ عوام کو خوشحالی نہ دے سکے۔

مگر یہ بھارت دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت بھی ہے۔ یہاں کی ثقافتی دنیا کی اپنی تاریخ ہے۔ تعلیم ہنر تجربے اور لٹریچر میں وسعت دیکھی جا سکتی ہے۔ بھارت کی اپنی ایک دنیا ہے جس میں دکھ درد بھی ہیں اور دلچسپیاں بھی۔

اچانک بس ایک جھٹکے سے رکی اور میرے خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ بس کے آگے سائیکل رکشے والا آگیا تھا۔ بال بال بچ گیا۔

بس پھر چل پڑی تھی۔ میں نے کھڑکی کے شیشے کو تھوڑا سا کھول دیا تاکہ باہر کا منظر اچھی طرح دیکھ سکوں۔

اچانک میری نظر فٹ پاتھ پر لیٹے ایک خاندان پر پڑی۔ فٹ پاتھ پر پڑے اس طرح کے لوگوں کو تو میں دہلی میں بھی دیکھ چکا تھا۔ لیکن جو منظر میں نے یہاں چند لمحوں میں دیکھ لیا اس نے مجھے اندر سے ہلا دیا۔ یہ میاں بیوی اور ان کے تین بچے تھے۔ انتہائی سردی میں فٹ پاتھ پر لیٹے ان بچوں کے اوپر ایک میلی کچیلی چادر تھی جو کئی جگہ سے پھٹی ہوئی تھی۔ چادر اتنی چھوٹی تھی کہ ان کے پورے جسموں کو نہیں ڈھانپ سکتی تھی۔ وہ سردی سے ٹھٹھر رہے تھے۔ ان کی ماں اس چادر کو ان کے پاؤں پر ڈالتی تو وہ سر سے اتر جاتی اور جب سر پر ڈالتی تو پاؤں ننگے ہو جاتے۔ وہ اسی تگ و دو میں ہار گئی تھی۔ چادر کو جوں کا توں چھوڑ کر خود بھی لیٹ گئی۔ مگر اس کی اپنی چادر بھی کئی جگہ سے پھٹی ہوئی تھی اور اتنی چھوٹی تھی کہ دنوں میاں بیوی اس میں پوری طرح سما نہ سکتے تھے۔ ایک بےچینی تھی جو اس پورے خاندان کو لگی ہوئی تھی۔ وہ

تقدیر اور قسمت سے لڑ رہے تھے جو انہیں اس فٹ پاتھ سے بہتر جگہ نہیں لے جا سکتی تھی۔ اور نہیں کچھ تو انہیں ایک بڑی چادر ہی مل جاتی جس سے وہ اپنے بد قسمت بچوں کے جسموں کو ڈھانپ کر انہیں سردی سے بچا لیتے۔

مجھ سے یہ منظر دیکھا نہ گیا۔ میری روح بے چین ہو گئی۔ دل بے قرار ہو گیا اضطراب کی کیفیت میں میں نے چاہا کہ دوڑ کر جاؤں اور اپنے ہوٹل کے کمرے سے وہ سلیپنگ بیگ اٹھا لاؤں جو میں نے آتی دفعہ آٹھ سو روپے میں خریدا تھا اور اس بے بس مجبور خاندان کے اوپر ڈال کر انہیں اس مصیبت سے بچالوں۔ تب میری روح کو سکون اور دل کو چین میسر آئے۔

حقیقت یہ ہے کہ میں نے ایسا ہی کرنا تھا۔ لیکن اسی اثنا میں بس کافی دور جا چکی تھی۔ ہوٹل پہنچ کر اس جگہ واپسی کا راستہ بھی معلوم نہ تھا۔

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

اگلا دن بھارتی دانشوروں کے ساتھ ہمارے وفد کے مذاکرات میں گزرا۔ رات کو ڈنر کے بعد میں اپنے کمرے میں واپس آگیا۔

میرے برابر والے کمرے میں ہمارے ساتھ آئے ہوئے پاکستانی دوست تھے۔ وہ میرے کمرے میں آئے اور کہا کہ آج اسی ہوٹل میں نئے سال کی تقریب ہے۔ کیا آپ ہمارے ساتھ چلیں گے۔ میں نے معذرت کی اور کہا کہ ایک ہزار روپیہ ٹکٹ خریدنا میرے لئے مشکل ہے۔ میرے دوست نے مسکراتے ہوئے اپنی جیب سے ایک ٹکٹ مجھے دے دی اور کہا آیئے چلتے ہیں۔ پروگرام شروع ہونے والا ہے۔

تقریب اپنے عروج پر تھی پورا ہال خواتین و حضرات سے بھرا ہوا تھا۔ سٹیج پر موسیقی کی دھنیں رگ و پے میں ارتعاش پیدا کر رہی تھیں۔ بھارت کے مشہور کلا کار اپنے فن کا مظاہرہ کر رہے تھے۔

روشنیوں رنگوں کی لہروں میں زندگی رقصاں تھی۔ اسی سحر انگیز ماحول میں بتیاں

بجھ گئیں اور اسی لمحے دوبارہ جل اٹھیں۔ [illegible] چکے تھے۔

نیا سال اپنے دامن میں رنگ [illegible] روشنیاں لئے اس ہال میں وارد ہو چکا تھا۔

ہلکی نیوائر کی مدھ بھری لے میں ایک خاتون آواز کا جادو بکھیر رہی تھی۔ ہر طرف مستیاں ہی مستیاں تھیں۔ کچھ نوجوان جوڑے سٹیج پر رقص پیش کر رہے تھے۔ اپنے من میں ڈوب کر ناچ رہے [illegible]

ہوٹل کا منتظم ہال میں موجود ہر ٹیبل پر جا کر رسمی مہمان نوازی کرتا رہا۔ میں نے اسے بلا کر کہا کہ میں پاکستان سے آیا ہوں [illegible] نئے سال کیلئے Wish کرنا چاہتا ہوں۔ آپ مجھے سٹیج پر بلائیں۔ کچھ دیر بعد وہ میرے پاس آیا اور کہا کہ آپ کیا Wish کرنا [illegible]۔ میں نے اسے بتا دیا۔ کچھ دیر کے بعد وہ پھر آیا اور میرا نام پوچھا۔

میں نے اسے نام بتایا۔ اس نے سٹیج پر جا کر اعلان کیا کہ [illegible] ہال میں اس وقت ایک پاکستانی مہمان بھی موجود ہیں۔ وہ آپ سے مخاطب ہوں گے۔ میں نے حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

Happy new year to the people of Calcatta.
Happy new year to the people of India.
Happy new year to the people of Pak[illegible]
Happy new year to the people of the whole world.
Happy new year to those children
who are born on footpaths
either in Indi[illegible]akistan or
anywhere in t[illegible]rld.
I wish Presparity to them.

اس پر پورے ہال نے تالیاں بجائیں۔ سٹیج پر بہترین ڈانس کرنے والے جوڑے کو ہوٹل کی طرف سے میرے ذریعے انعام دیا گیا۔

میں نے دنیا کے کسی بھی حصے میں فٹ پاتھ پر پیدا ہونے [illegible] بچوں کو نئے سال کی مبارکباد دی تھی اور پاکستان کا نام بھی لیا۔ پاکستان میں فٹ پاتھ پر بچے پیدا نہیں

ہوتے لیکن میں نے پاکستان کا نام اس لئے لیا تھا کہ کہیں بھارت کے لوگ یہ نہ سمجھ لیں کہ میں نے بھارت کی غربت پر طنز کی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ پچھلی رات فٹ پاتھ پر جو منظر دیکھا تھا وہ میرے رگ و پے میں سرائت کر چکا تھا۔ جب نے سٹیج پر آکر فٹ پاتھ پر پیدا ہونے والے بچوں کو نئے سال کی مبارکباد دی اس وقت ... منظر میرے تھا اور یہ جذبات سچے تھے جو دل کی آواز بن کر نکلے تھے۔

مجھے ... کا چہرہ اداس دکھائی دیا۔ ... س بڑے ہوٹل کی تقریب ... ارں و یاں سمٹی اور سکڑی ہوئی تھیں۔ محدود، کھوکھلی، بے جان۔ ہوٹل سے پاتھ کی دنیا ہوں سسکیوں اور ... بھری دنیا ہے۔

کون آزاد ہوا؟

کس کے ہاتھ سے غلامی کی چھوٹی
میرے ابھی درد ہے ... می کا
مادر ہند کے چہرے پہ اداسی ہے وہی

کلکتہ کے فٹ ... پر زندگی نوحہ کرتی نظر آتی ہے۔ یہاں خاندان اپنی اپنی چند گز زمین سمیٹے تما ... رہیں بتا دیتے ہیں۔ یہیں بچے پیدا ہوتے ہیں یہیں شادیاں ہوتی ہیں ... مر جاتے ہیں۔ گندے پھٹے کپڑوں کو جوڑ کر چادر بنائی جاتی ہے۔ وہی چار دیواری ہے۔ جہاں کہیں چادر زیادہ پھٹی ہو اور کپڑا میسر نہ ہو پلاسٹک کے لفافے کو ... آسرا کر لیا جاتا ہے۔ فٹ پاتھ کے گھر کے ساتھ ہی گندے کپڑوں کو پانی میں ... دھونے کے لئے ... انا کنستر نما برتن کام چلانے کیلئے کافی ہوتا ہے ... ن کی جگہ ہاتھ یا ڈنڈے ... دھولئے جاتے ہیں۔ قریب ہی ننگے لاغر کمزور نحیف ... فٹ پاتھ کی زمین کے اوپر اخباری کاغذ بچھا کر لٹا دئے جاتے ہیں یوں لگتا ہے جیسے زندگی نے انہیں اتنی بڑی سزا دینے ... چن لیا ہے۔ جو بچے ذرا ... ے ہیں ان کے سر کے ... سرخی ہے جو سو ... تمازت کی وجہ سے پیدا ہوتی

ہے۔

یہاں زندگی پیدائش سے موت ہے اور بس۔ یہ پتہ نہیں چلتا کہ بچپن، لڑکپن اور جوانی کب آئی کب گئی۔ کارپوریشن کا ٹرک گاہے گاہے ان فٹ پاتھوں کے ساتھ ساتھ گزرتا رہتا ہے اور جو لاش پڑی ملے اسے اٹھالے جاتا ہے۔

اس سسکتی روتی انسانیت کی یہ کربناک تصویر کسی کو نظر بھی نہیں آتی۔ فٹ پاتھ پر پڑے ان خاندانوں کے سامنے روزانہ سینکڑوں کاریں گزر جاتی ہیں۔ کوئی انہیں دیکھتا بھی نہیں۔ زندگیوں میں کتنا بڑا تضاد ہے۔ کب تک یہ ظلم ہوتا رہے گا۔ کب تک اولاد آدم فٹ پاتھوں پر مرتی رہے گی۔ ہند کی آزادی کیلئے کتنی قربانیاں دیں اب غربت سے خاتمے کے لئے قربانیاں دینی ہیں

تجھ کو کتنوں کا لہو چاہئے اے ارض وطن
جو ترے عارض بے رنگ کو گلنار کرے
کتنی آہوں سے کلیجہ تیرا ٹھنڈا ہوگا
کتنے آنسو تیرے صحرا کو گلزار کریں گے

میرے محترم دوست حنیف رامے نے مجھے کہا کہ آپ نے صرف کلکتہ کا فٹ پاتھ دیکھا ہے۔ ممبئی جایئے اور وہاں کے فٹ پاتھ بھی دیکھئے۔

فٹ پاتھ پر پیدا ہونے والا ہر بچہ سماج کے منہ پر طمانچہ ہے اگر سماج پتھر کی دیوار بن جائے تو سوچ اور فکر کہاں سے آئے گی۔ انسانوں کا زندہ سماج ہی یہ خوبی رکھتا ہے کہ اس کے اندر سوچ اور فکر ہے جو اسے آگے لئے چلتی ہے اور منزل پر پہنچ کر اسے کسی نئی منزل کا پتہ دیتی ہے۔

میں نے اپنے بھارتی دوست سے پوچھا کہ کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ کی حکومت اور سب ادارے مل کر کوشش کر کے اور وسائل مہیا کر کے ان بیچارے لوگوں کو گھر دلوا دیں۔ کہیں کچے مکان ہی بنوا دیں۔ اس نے جواب دیا یہ کوئی معمولی مسئلہ نہیں۔ اس نے بتایا کہ ایک مرتبہ دہلی میں ایسا تجربہ کیا گیا اور فٹ پاتھ پر سونے والوں کو گھر بنانے

کے لئے مالی امداد دی گئی۔ لیکن وہ گھر بنانے کی بجائے پیسے کھا پی کر پھر اسی جگہ واپس لوٹ آئے۔

میں اپنے دوست کے جواب سے مطمئن نہ تھا۔ اگر خلوص نیت کے ساتھ بہتر منصوبہ بندی کی جائے اور تمام وسائل اکٹھے کر کے اس دردناک مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کی جائے تو بہتر نتائج نکل سکتے ہیں لیکن یہ مسئلہ جوں کا توں ہے بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا جا رہا ہے۔

ابھی گرانئ شب میں کمی نہیں آئی
نجات دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی

سائیکل رکشہ والے کلکتہ میں بہت بڑی تعداد میں ہیں۔ سائیکل رکشہ چلاتے چلاتے ان کے جسم لاغر اور کمزور ہو جاتے ہیں۔ اکثر ٹی بی کے مرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ سائیکل رکشہ سے ان کی دن بھر کی کمائی یہاں بکنے والی بئر کی بوتل سے زیادہ نہیں۔ سائیکل رکشہ کے علاوہ ہاتھ گاڑی بھی چلتی ہے۔ جو سائیکل رکشہ بنانے کی سکت نہیں رکھتے وہ سائیکل کی جگہ خود جت جاتے ہیں اور اسے ہاتھ سے کھینچ کر چلاتے ہیں۔ شروع شروع میں سائیکل رکشہ پر سواری کرتے ہوئے الجھن اور شرم محسوس کرتا تھا۔ جیسے میں کسی انسان کو غلام بنا کر اس کی پیٹھ پر سوار ہوں۔ مجھے لگتا کہ میں انسان کی توہین کر رہا ہوں۔ لیکن پھر کئی بار بھارت کے شہروں میں آنا ہوتا رہا اور سفر کی ضرورت، پیسے کی کمی سب نے مجبور کر دیا اور اب میں بھی بے شرموں کی طرح سائیکل رکشہ پر سواری کر لیتا ہوں۔ اگر جیب میں زیادہ پیسے ہوں تو انہیں مقررہ کرائے سے زیادہ دینے میں کنجوسی نہیں کرتا۔

کلکتہ کنونشن میں کشمیر کے مسئلے سمیت تمام اختلافی مسائل اور دیگر امور پر مذاکرات کے بعد متفقہ طور پر تجاویز مرتب کی گئیں اور قراردادیں منظور ہوئیں۔ دونوں ملکوں کی حکومتوں سے کہا گیا کہ دونوں ملکوں کے عوام کو جنگ کا راستہ قبول نہیں۔ جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کیا جائے۔ فوجی طاقت کو بڑھانے سے اجتناب کیا جائے۔

افواج میں بتدریج تین سالوا 259 کمی کی بجائے۔ ایٹمی اسلحہ ترک کر دیا جائے دونوں ملک بارڈر سے اپنی اپنی افواج مناسب حد تک ں۔ بیلسٹک میزائل بنانے اور زخیرہ کرنے پر پابندی لگائی جائے۔ بارڈر کے دونوں اطراف پر اکسی وار اور تخریبی کاروائیوں سے گریز کیا جائے۔ دو طرفہ تجارت کو فروغ دیا جائے۔ کتب و رسائل کی آزادانہ ترسیل ہو۔ ویزہ کی پابندیاں نرم کی جائیں۔ مذہبی رواداری قائم کی کشمیر میں بھارتی افواج کی طرف سے انسانی حقوق کی خلاف بندہوں' بھارتی افواج کشمیر سے واپس بیرکوں میں چلی جائیں۔ کشمیر کے مسئلے کو جمہوری طریقے سے حل کیا جائے۔

مذاکرات کا یہ نتیجہ دیکھ کر ہ سکتا ہے کہ دانشور مسائل حل کر سکتے۔ لیا دوسری جنگ عظیم کے بعد چرچل نے یہ اعتراف نہیں کیا واٹر لو کی جنگ میدانوں میں نہیں جیتی گئی۔ اس کا منبع اور مرکز انگلستان کے وہ جمہوری ادارے تھے جہاں سوچ اور فکر کی دانشوری زندہ تھی۔ عدالتیں اپنے فیصلے کرنے میں آزاد تھیں۔

پاک بھارت کشیدگی کے پچاس سالوں میں پہلی مرتبہ دونوں ملکوں کے عوام نے مل کر کلکتہ کی سڑکوں پر امن مارچ کیا۔ دونوں ملکوں کے عوام میں جوش اور ولولہ تھا۔ وہ امن کی طرف پیش رفت کر رہے تھے۔ ان کے حوصلے اور ہمتیں جوان تھیں۔ ان کے جذبوں کو حرارت ملی تھی۔ وہ تاریخ میں اپنا نام لکھوا رہے تھے نئی تاریخ بنا رہے تھے۔

ہم اپنے ہاتھوں میں بینر پکڑے سڑکوں پر نعرے لگا رہے تھے۔ سب سے آگے قطار میں تھا۔ میں نے اتنے نعرے لگائے کہ گلا بیٹھ ہوگیا۔ ہر پوری پر کسی اونچی جگہ کھڑا ہو جاتا اور نعرے لگاتا۔

"پاک بھارت دوستی ---- زندہ باد
امن کے دو نشان ---- بھارت اور پاکستان
تیری آن میری آن ---- بھارت اور پاکستان

سب لوگ ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے انسانی زنجیر بنائے آگے بڑھ رہے تھے۔

Deep in my heart.

I do believe

We Can Over Come

Some day.

کچھ بھارتی دوست میرے ساتھ ساتھ چل رہے تھے وہ علامہ اقبال کا یہ گیت گانے لگے۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا۔ ہمارا

سارے جہاں سے اچھا

میں نے انہیں کہا کہ دونوں ملکوں کی مناسبت سے کچھ کہو۔

اس پر وہ بولے آپ پہلے سن تو لیں ہماری بات۔

میں مزید ان کی بات کو نہ سن سکا تاہم مجھے اس بات پر افسوس ہوا کہ میں نے ناحق ان کو ٹوک دیا۔ شاید میری سوچ محدود ہو گئی تھی۔ یہ شعر تو خود اقبال نے ہی کہا تھا اور بھارت کی سرزمین تو وہ سرزمین ہے جہاں سے اخلاص کا ظہور ہوا۔

جیسا کہ آفتاب نکلتا ہے شرق سے
اخلاص کا ہوا ہے اسی ملک سے ظہور
ہے اصل تخم ہند سے اور اس زمین سے
پھیلا ہے سب جہاں میں یہ میوہ دور دور (غالب)

چورنگی پر جلوس کے اختتام کی جگہ ایک بڑا سٹیج بنایا گیا تھا۔ میں نے پہلے مقرر کے طور پر پر جوش انداز میں تقریر کی۔ میں نے کہا "سب دنیا دیکھ رہی ہے پاک و ہند کے عوام کیا چاہتے ہیں۔ ہم امن چاہتے ہیں۔ ہم اپنی اپنی حکومتوں سے درخواست کریں گے کہ وہ ہماری خواہشات کا احترام کریں اور پرامن طریقے سے مذاکرات کر کے اپنے اختلافات اور مسائل حل کریں۔

اب یہ امن مارچ یہیں تک نہیں رہے گا۔ بلکہ یہ یہاں سے پاکستان جائے گا اور جنوبی ایشیاء کے سب ملکوں تک بھی۔ دنیا بھر کے راستے امن کے راستے بنائیں گے۔ امن کو دنیا میں پھیلائیں گے۔ دشمنیوں کو دوستیوں سے اندھیروں کو روشنیوں سے بدل دیں گے۔

کلکتہ کے ساتھ غالب کی محبت وابستہ تھی۔ غالب نے کہا تھا۔

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر مرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

کلکتہ کے لوگ مہمان نواز' خوش اخلاق اور امن پسند ہیں۔ یہاں لسانی' مذہبی' گروہی اور علاقائی جھگڑے دیکھنے میں نہیں آتے۔ جب کبھی بھارت کے دوسرے شہروں میں مذہب اور نسل کی بنیاد پر جھگڑے ہو رہے ہوں تو کلکتہ میں امن رہتا ہے۔ یہاں مسلمان کافی بڑی تعداد میں رہتے ہیں۔ یہاں لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم کے بارے میں مسلمانوں کے نظریات فرسودہ ہیں۔

دفتروں میں لڑکیوں کی ملازمت کو پسند نہیں کیا جاتا۔ ان کا خیال ہے کہ عورت کا اصل مقام گھر ہے۔ شادی کے بعد خاوند کی عزت اور گھر کی دیکھ بھال۔ بچوں کی تربیت اور بس۔

کلکتہ کے لوگ اعلیٰ ذوق مطالعہ رکھتے ہیں۔ انہیں کتابیں پڑھنے کی عادت ہے ایشیاء میں کلکتہ بک فیئر سب سے بڑا ثقافتی و تعلیمی میلہ ہے جو یہاں ہر سال لگتا ہے۔ بھارت کی بڑی بڑی زبانوں میں لکھی گئی کتب یہاں رکھی جاتی ہیں۔ فرانس' جرمن' انگلینڈ اور ایشیاء کے دوسرے بڑے پبلشرز یہاں آتے ہیں۔ کلکتہ بھارت کا ثقافتی مرکز ہے۔ یہاں مشاعروں میں بڑی تعداد میں لوگ آتے ہیں۔ یہاں بہترین فلمیں بھی بنتی ہیں۔

یہاں کے لوگ اپنی تاریخ پر فخر کرتے ہیں۔ بک فیئر میں کئی ایسی کتابیں تھیں جو شہر کے بڑے آدمیوں کے بارے میں لکھی گئی تھیں۔

ان میں ایک ...اے کے ... سی۔ جنہوں نے پچھلی صدی
کے شروع میں ... ... کے لئے ...
... کے علاوہ راما کرشن اور سوامی ویو کناندہ (...e Kananda) ... کے نام تھے۔ جو
انیسویں صدی کے مذہبی سکالر تھے۔ سبھاش چندرا بو... ...سری جنگ عظیم میں
آزادی کی جنگ لڑنے والے ہیرو کا درجہ حاصل ہے۔ ... بارے ... کئی
جلدوں میں موجود تھیں۔ سب سے زیادہ نمایاں نام 13... ... نوبل انعام ... والے
رابندر ناتھ ٹیگور ... زیادہ تر بنگالی ٹیگور کو بھارت میں سب ... ایم رائٹر سمجھتے
ہیں۔ اس کی نظمیں، گیت اور ... ئے ایڈیشن کے طور پر شائع ہوتی رہتی
ہیں۔ جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ دنیائے لٹریچر میں اس کا ایک مقام ہے۔

ٹیگور کا انتقال 1941ء میں ہوا۔ ان کے بعد آنے والے کئی بنگالی لکھاریوں نے
ٹیگور کے انداز میں لکھنا شروع کیا۔ لیکن وہ کسی طرح بھی ٹیگور کے ... نہ پہنچ
سکے۔ اور اس سحر کو نہ توڑ سکے جو ٹیگور کی لاجواب نظموں اور ... نے بنگالی عوام
کے ذہن و قلب میں پیدا کر دیا تھا۔

کلکتہ میں ہر وقت لوگ ... متحرک نظر آئیں گے ... مزدور، کرتے ہوئے۔ لکھتے
پڑھتے ہوئے۔ محنت مزدوری کے بغیر تو ان کا ایک دن بھی نہیں گزرتا۔ اکثریت زندہ
رہنے کے لئے ... مزدور کا معاوضہ انتہائی کم ہے۔ سویڈن کے
ایک سیاح ٹامسن اینڈرسن نے کلکتہ کی سیاحت کے بعد اپنی کتاب ...ntasy
میں لکھا ہے کہ شاید بھارت دنیا کا سب ... ملک ہے۔ اس نے ... کا دورہ کئے بغیر لکھی تھی۔ کرپشن میں ... پیچھے نہیں۔ درا... ہی
کرپشن ... تی ہے۔ دنیا کے ... روٹی ... دم توڑ دیتے ہیں۔

کلکتہ میں گاڑی میں چلتے ہوئے آپ کو پولیس والا روک کر ... ٹائر گھسے ہوئے
ہیں یا سلنسر سے دھواں زیادہ اٹھتا ہے۔ تو اسے ... کے چند روپے دینے سے جان
چھوٹ ... ایک شخص فٹ پاتھ پر پوسٹ ... تا تھا جو کہ غیر قانونی ہے۔ اس

نے مجھے بتایا کہ میں نے خوانچہ فروش یونین کی ممبر شپ لی ہوئی ہے۔ اس لئے اب مجھے یہاں سے کوئی نہیں اٹھائے گا۔ میں پولیس کا حصہ یونین کے پاس جمع کروا دیتا ہوں جو ہر ماہ پولیس کو مل جاتا ہے۔

ایک شخص کا 15 ہیکڑ پر مشتمل فش فارم ہے۔ وہ 1962ء میں یہاں آیا تھا اور اس علاقے کی زرخیزی کو دیکھ کر اس نے فش فارم بنانے شروع کئے۔

اس نے کہا کہ آجکل وہ 2 ٹن فی ہیکٹر پیداوار حاصل کرتا ہے۔ لیکن اگر حالات سازگار رہتے تو میں اسے دس گنا بڑھا سکتا تھا۔ میں نے کہا کیا مطلب۔ اس نے کہا جب مچھلی نکالتے ہیں تو وہ صرف 6 انچ لمبی ہوتی ہے۔ اگر اسے پوری طرح بڑھنے کا موقع مل جائے تو وہ ڈیڑھ فٹ تک لمبی ہو سکتی ہے۔ لیکن ہم مجبور ہیں اتنا Risk نہیں لے سکتے۔

کیوں؟ میں نے حیرانی سے سوال کیا۔

اس نے بتایا کہ اس علاقے میں ڈاکوؤں اور لٹیروں کے گروہ ہیں ہم انہیں روک نہیں سکتے۔ ان کے ساتھ پولیس ملی ہوتی ہے ہم مجبوراً" تالاب سے جلد مچھلیوں کو نکال لیتے ہیں اور ہمیں بہت سا مالی نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے۔ کلکتہ کے ایک شہری نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کے ہاں بھارت کے "حوالہ سکینڈل" کی طرح کا کوئی سکینڈل ہوا ہے۔ میں نے کہا فکر نہ کرو اس میدان میں ہم کسی سے پیچھے نہیں۔ ایک مسلمان لڑکی نے پاکستان میں کرپشن کے بارے میں ذکر کرتے ہوئے کہا کہ آپ کے ہاں کرپشن کا یہ عالم ہے کہ اگر آپ کو رشوت دے کر یہ کہا جائے کہ مینار پاکستان دے دو تو آپ لوگ اس سے بھی گریز نہ کریں۔ آپ کے ہاں مسجدوں میں گولیاں چلتی ہیں تو ہم سہم جاتے ہیں۔

مجھے اس کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ بھارتی مسلمان پاکستان میں بڑھتی ہوئی دہشت گردی اور کرپشن سے پریشان ہیں۔

ہندو اور مسلمان ایک ہزار سال سے اکٹھے رہتے آئے ہیں ان کی تہذیب میں

مماثلت پائی جاتی ہے۔ پاک بھارت کے خاندانی نظام کی ہیئت ترکیبی اور سسٹم میں
رق نہیں۔ مشرقی معاشروں میں روایات اور موروثی حالات کا اپنا
ارے معاشروں میں موجود خاندانی نظام کی اچھائیاں برائیاں کمیاں خامیاں
چلتی رہتی ہیں۔ جن پر مکالمہ جاری رہتا ہے۔ خاندانی نظام میں حالات اور وقت کے
ساتھ ساتھ تبدیلیاں رونما ہورہی ہیں اور اجتماعی خاندانی نظام
Joint Fa System آہستہ آہستہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔ لیکن تماعی
ایک بڑی خا ہے کہ ماں باپ جب بوڑھے ہو جاتے ہیں تو وہ بے
کر دھکے نہیں کھ اجتماعی خاندانی بھرپور پذیرائی اور
عزت ملتی اولاد اپنے بوڑھے والدین کی عزت و احترام کو مذہبی اور انسانی فریضہ
سمجھتی ہے۔ جبکہ مغربی معاشرے میں بوڑھے ماں باپ اولاد کی محبت اور سے
محروم رہتے ہیں۔ میرے سویڈش نے کہا کہ یہ ٹھیک ہے ہم
Extended Families میں نہیں لیکن اس طرح ہمیں پر اعتماد اور
رنے کا ہے۔ ہم اپنی غلطیوں سے خود سبق سیکھتے بکہ آپ
وں کے سہاروں پر گزارہ ہے۔ ہمارے معاشرے کی معاشرے کی طرح
رسوں کا حصول آسان نہیں۔ جوان لڑکے اور لڑکیاں اپنی پسند کی شادی نہیں کر سکتے۔
اگرچہ شہروں میں بسنے والے تعلیم یافتہ گھرانوں میں برل ازم Libralism آرہا ہے
اشرے سے کٹ کر رہنا اتنا آسان بھی نہیں۔ اکثر جگہ رشتے کرانے
ادارے (Marriage Bureaue) قائم ہیں۔ جو فیس لے کر رشتے کرواتے ہیں۔ بے
روزگار اور کم تنخواہ والے مسائل کے اچھے رشتے آسانی سے نہیں ملتے۔
ہ میں را وں کی ا ور صوبائی حکومت نے مل کر اجتماعی شادیوں کا
پروگرام ایک جگہ لئے گئے۔ اسی جگہ شادیاں طے ہوئیں
ا تیاں ہوئیں۔ جہیز کا سامان بھی ساتھ بھیجا گیا۔ دلچسپ پہلو یہ ہے کہ
پڑیں۔ جس پر بکنے والے لڑکوں نے لڑکیوں پر سخت تنقید کی۔

بھارت میں سماجی اور معاشرتی زندگی کے تضادات بھی ملتے ہیں۔ ایک طرف تو بھارت اس بات پر فخر کرتا ہے کہ اس کے ملک کی تین دوشیزائیں مقابلۂ حسن میں ملکۂ حسن کا اعزاز حاصل کر چکی ہیں۔ جبکہ دوسری طرف خاندانی نظام کی خرابی یہ ہے کہ ایک بیوہ ہونے والی خاتون [redacted] اور بیچارگی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ بعض دیہاتی علاقوں میں تو پرانی فرسودہ روایات ابھی تک قائم ہیں۔ وہاں [redacted] عورت کو اپنا سر منڈوا کر رہنا پڑتا ہے۔

آندھرا پرادیش کی ایک بوڑھی عورت نے بتایا کہ وہ تیس سال کی تھی جب اس کا خاوند مر گیا۔ اس کے بعد سے خاندان کے باقی افراد کے برے سلوک کی بنا پر گھر سے نکل جانا پڑا۔ اور اب تک وہ بیوہ عورتوں کے لئے بنائے گئے آشرم میں رہتی ہیں۔ جہاں سے اسے روزانہ 3 روپے ملتے ہیں۔

اس طرح کے آشرم اور بھی بنائے گئے ہیں جہاں بیوہ عورتوں کی مدد کی جاتی ہے۔ کئی رفاحی ادارے آشرم کی مالی اعانت بھی کرتے ہیں۔ یہ آشرم بیوہ عورتوں کے نام پر بھاری فنڈز جمع کرتے ہیں۔ جن کا صحیح استعمال نہیں ہوتا۔ ذات پات کا بہت پرانا' فرسودہ اور ظالمانہ نظام بھارتی سماج کی جڑوں میں موجود ہے۔ اونچی اور نیچی ذاتوں کے اس الگ الگ [redacted] روں کو دیکھ کر انسانیت شرم سے جھک جاتی ہے۔ ابھی تک مشرقی بھارت کے صوبہ بہار میں دو ہزار پانچ سو سال پرانا ذات پات کا نظام موجود ہے۔ اونچی ذات کے زمیندار اچھوت خواتین پر دست درازی بھی کرتے رہتے ہیں۔ نچلی ذات کے لوگوں کو قریب نہیں بٹھاتے۔ ان کے پانی کے کنویں اور روزمرہ کے استعما [redacted] یاء الگ الگ ہیں۔ آئے دن ذات پات کی بنیاد پر جھگڑے ہوتے رہتے ہیں۔ تاہم بھارت میں اب سیاسی و سماجی تبدیلیاں آ رہی ہیں۔ صوبہ بہار میں نچلی ذات اور کیمونسٹ پارٹی کے لیڈر لوگوں کو اکسا رہے ہیں کہ وہ اونچی ذات کے لوگوں کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر بات کریں۔ بچوں کو ہدایات دی جاتی ہیں کہ وہ سکولوں میں اونچی ذات کے لڑکوں کے برابر بیٹھیں۔ ایک ماہر عمرانیات نے بتایا کہ کافی عرصہ سے اونچی ذات کا

ر کر سا توقع ہے کہ ریاست میں اور پھر پورے انڈیا میں یہ
سسٹم خ س مقصد کے لئے نچلی ذات کی خواتین سیلف ڈیفنس تربیت
حاصل کر رہی ہیں تاکہ وہ ٹھاکروں کے حملوں سے محفوظ رہیں۔

کلکتہ عصمت فروشی کے اڈے اس شہر کی بدنمائی کا داغ ہے۔ یہاں عورتوں کی
بڑی تعداد دھندے میں مصروف ہے۔ کلکتہ کے بازار حسن میں عورت
تیس سال کے بعد بوڑھی ہے۔ حوا کی بیٹی کا یہ رخ معاشرے کی ذلت کا تماشا
ہے۔ سارا منظر سماج کی بے حسی پر دل کڑھتا ہے۔ انسانی جسموں کی
تجارت کا یہ سلسلہ کہاں کہاں پھیلا ہوا ہے۔ معیار کا فرق ہے۔ کوئی ڈومنی، اگر
غالب کی توجہ کا مرکز بن جائے تو اس کا درجہ ڈومنی کا ہی رہے گا وجہ شہرت چاہے
جائے۔ ڈومنی کو رسوائی کی جگہ سے نکال کر لائے گا عزت کا تاج
گا۔ ہم میں سے اکثر تو تمدن کی روشنی میں شرفاء اور تاریکی
ام بین۔ یہاں کہ ان کے صدر کا کہنا ہے کہ شریف معاشرہ
باعزت لوگ راہ تاریکی میں آکر حوا کی بیٹی کی عزتوں سے کھیلے اور ان
کے رقص محفوظ ہوتے ہیں۔ وہی لوگ دن کے اجالے میں ہمیں پتھر مارتے ہیں۔

پورے بھارتی بنگال میں ہزاروں عورتیں عصمت فروشی پر مجبور ہیں دھندے
مصروف گروہ بھارت کے مضافات اور دوسرے علاقوں سے عورتوں کو بہت سے
کا جھانسہ دیکر اپنے چنگل میں پھنسا لیتے ہیں پھر چھوڑنے کے
عورتیں کلکتہ یا دوسرے بڑے شہروں کے "ان بازاروں" میں پہنچ جائیں تو وہیں
جاتی ہیں۔ ان کی اپنی گھر کو واپسی نہیں رہتی۔ حکومت اور
پالیسیاں اور دخل کرنے میں ذرا دلچسپی نہیں لیتیں۔ اب بازار حسن میں
والیوں نے اپنی باقاعدہ تنظیم بنالی ہے اور وہ اپنے آپ کو سیکس ورکرز کا نام دیتی ہیں
پچھلے سال 6000 کے قریب ان انڈین سیکس ورکرز نے کلکتہ میں ایک بہت بڑی
کنونشن کیا جو تین دن جاری رہی اس کنونشن میں 48 سیکس ورکرز یونینوں

نے نمائندگی کی۔ اس میں مطالبہ کیا گیا کہ اس قدیم ترین پیشے کو جائز اور قانونی قرار دیا جائے۔ انہیں ٹریڈ یونینوں کے حقوق دئے جائیں اور ان کے بچوں کو سکولوں میں داخلے اور ملازمتیں مہیا کی جائیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ہمیں قانونی تحفظ ملنے سے ایڈز سے بچاؤ کے طریقوں کو لاگوں کرنے میں آسانی ہوگی۔ ہماری اور ہمارے بچوں کی صحت ایک اہم مسئلہ ہے جس پر توجہ نہیں دی جاتی۔

بھارت میں عصمت فروشی غیر قانونی ہے۔ لیکن اسے برداشت کیا جاتا ہے۔ اس وقت بھارت میں 35 شہروں میں نو ہزار کے قریب سیکس ورکرز موجود ہیں۔ بمبئی میں ایک لاکھ سے زائد طوائفیں اپنا کاروبار کر رہی ہیں۔ چالیس ہزار طوائفیں 16 سال یا اس سے کم عمر کی ہیں۔ یہ اعداد و شمار ایک انٹرنیشنل کانفرنس میں بتائے گئے جس میں کہا گیا کہ جبری مشقت، جنسی تشدد اور طوائفوں کی بہبود کے لئے علیحدہ وزارت بننی چاہئے۔

ایک بھارتی دانشور نے مجھے بتایا کہ ہائی کورٹ میں ایک مقدمہ دائر کیا گیا۔ جس میں یہ موقف اختیار کیا گیا کہ بچے کی پیدائش کا فارم پر کرتے وقت ولدیت کے خانے میں باپ کا نام درج کرنے کی پابندی ختم کی جائے۔ یہ اختیار ملنا چاہئے کہ بچے کی ماں یا باپ دونوں میں سے کسی ایک کا نام فارم میں درج کر دیا جائے اور یہی اصول آئندہ کسی بھی مقصد کے لئے فارم پر کرتے وقت اپنایا جائے۔ کیونکہ جو بچہ کسی طوائف کے گھر پیدا ہوتا ہے۔ اسے معلوم نہیں ہوتا کہ اس کا باپ کون ہے۔ اس میں اس کا کیا قصور۔ اسے اس ناکردہ گناہ کی سزا کیوں ملے۔

ہائیکورٹ نے درخواست گزار کے حق میں فیصلہ دیا۔

پاکستان میں عصمت فروشی کا مرکز ایک تاریخی مسجد کے زیر سایہ ہے اس بازار حسن میں 2 ہزار کے قریب طوائفیں ہیں۔ جسم فروشی کے دھندے شہر بھر میں مختلف جگہوں پر پھیل گئے ہیں۔ اسلام آباد میں افغان عورتوں کی بڑی تعداد اس میں ملوث ہے۔ جنوبی ایشیاء کی سب سے بڑی ہیرا منڈی بنگلہ دیش میں ہے۔ جو ایک مسلمان ملک ہے۔ یہاں جسم فروشی کو قانونی تحفظ حاصل ہے۔ ڈھاکہ کے قریب اس بازار حسن میں

ہزاروں کم عمر طوائفیں ہیں۔ یہاں منشیات شراب اور سٹے بازی عروج پر ہوتی ہے۔ بازار حسن کی مجبور خواتین جاگیرداروں کی عیاشی کا ذریعہ ہیں۔ انہیں کے دم قدم سے یہ بازار آباد ہیں۔ جاگیردارانہ ذہنیت رکھنے والے سیاستدان اسے قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ جاگیرداروں کے ہاں شادی بیاہ کے موقعوں پر طوائفوں سے مجرا کرانے کی رسم بہت پرانی ہے۔ جاگیرداری نظام کا خاتمہ کئے بغیر بازار حسن ختم نہیں ہو سکتے۔ کارل مارکس کی تحقیق کے مطابق جسم فروشی عورت کی انتہائی تذلیل کی ایک ایسی شکل ہے جو اس انسان دشمن نظام کی عکاسی کرتی ہے جس میں جنس جیسی مسرت افروز انسان کی ذاتی چیز بھی پرائی بن جاتی ہے۔

عصمت فروشی کے دھندے میں ملوث قوانین کو مفید شہری بنانے اور باعزت روزگار فراہم کرنے کے لئے حکومتی سطح پر کوششوں سے بہتر نتائج نکل سکتے ہیں۔ ویتنام کے حکام نے طوائفوں کو مختلف کاموں پر لگا دیا ہے۔ ایک تعلیمی سنٹر میں 61 طوائفوں کو مختلف ذمہ داریاں سونپی گئی ہیں۔ ان خواتین سے کاشتکاری کا کام لیا جاتا ہے۔ اصلاحی سنٹرز میں انہیں 3 سال تک رکھا جاتا ہے۔ فرار کی کوشش کرنے والی طوائفوں کو سزا کے طور پر زیادہ عرصہ سینٹر میں رہنا پڑتا ہے۔ یہاں انہیں تعلیم و تربیت دی جاتی ہے۔ گھریلو صنعت کے شعبے میں مختلف کام سکھائے جاتے ہیں۔ اخلاقیات' شہری ذمہ داریوں اور سیاسیات کی تعلیم دینے کے علاوہ صنعتی خاندانی اور فوجداری قوانین بھی پڑھائے جاتے ہیں۔ تاکہ یہاں سے واپسی پر وہ مفید شہری کا درجہ حاصل کر سکیں۔

ویتنام میں اس طرح کے فلاحی سنٹروں میں 3 ہزار کے قریب خواتین مختلف ہنر سیکھ رہی ہیں۔ ویتنام کی طرز پر دوسرے ممالک میں بھی اس طرح کے رفاحی ادارے اور سینٹر بنا کر انسانی خدمت کا یہ کام کیا جانا چاہئے۔ سماجی ناانصافی کی وجہ سے بازار حسن کی خواتین جسم فروشی کا دھندہ کرنے پر مجبور ہیں۔ تاہم ایک اسی سالہ طوائف کا کہنا ہے کہ چاہے کچھ بھی کرلو۔ زمانہ لاکھ بدل جائے مگر طوائف نہیں بدلتی۔

کلکتہ میں ایشیا کی واحد زیر زمین ٹرین چلتی ہے۔ مجھے اس میں سفر کا موقع نہ مل سکتا۔ بھارت کے سفر کا لطف اٹھانا ہو اور سیاحت کے تجربات حاصل کرنے ہوں تو ریل کا سفر ہی موزوں ہے۔ بھارت کا ریلوے دنیا بھر میں سب سے بڑا نیٹ ورک ہے۔ ہر روز تقریباً" ایک کروڑ افراد ٹرین کے ذریعے سفر کرتے ہیں۔ راجستھان کے صحرا دیکھنے ہوں' ویسٹ بنگال کے قصبوں میں چائے کے باغات والے علاقوں کا نظارہ کرنا ہو یا آسام کے بارشوں والے جنگلات سے گزرنا ہو آپ کو ٹرین ہی سے جانا ہو گا۔

بھارت کے ریلوے میں دس لاکھ افراد ملازم ہیں جو اپنے اپنے خاندان کی کفالت کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ریلوے سٹیشنوں پر دوکاندار' خوانچہ فروش' قلعی وغیرہ بھی اپنا روزگار یہیں سے حاصل کرتے ہیں۔ اس طرح بھارت میں ریلوے سے وابستہ روزگار حاصل کرنے والوں کی تعداد دنیا میں سب سے زیادہ ہے۔

ریلوے کا تمام شیڈیول کمپیوٹر بناتا ہے۔ تمام نظام اور اوقات کار کمپیوٹر سے منسلک ہے۔ سفر کے لئے پیشگی بکنگ کرانا پڑتی ہے۔ اگر سیٹ پہلے سے بک نہ کرائی ہو تو سخت مشکل پیش آتی ہے۔ پھر قسمت کی بات ہے کہ کہیں جگہ مل جائے۔ ٹرینیں پاکستان کی نسبت بہتر ہیں۔ فرسٹ کلاس اور ائر کنڈیشنڈ میں آرام دہ اور کشادہ سیٹیں ہیں جو رات کو سونے کے لئے سلیپر کا کام دیتی ہیں۔

ٹرین کے سفر میں بھارت کے معاشروں کے کلچر کا رنگ ڈھنگ دیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ مختلف رنگ نسل اور علاقوں کے لوگ اپنی اپنی زبان' لباس' وضع قطع اور بود و باش سے اپنی اپنی تہذیبی اور معاشرتی زندگی کی عکاسی کرتے نظر آتے ہیں۔

ٹرین کے سفر کی دلچسپیوں اور رنگینیوں پر کسی نے کہا ہے۔

پیت ہے جو دل میں وہ تیر کھینچتا ہوں
آگ ریل کے سفر کی تصویر کھینچتا ہوں
گاڑی میں گنگناتا مسرور جا رہا تھا
اجمیر کی طرف سے پور جا رہا تھا

کچھ دور پر تھا پانی موجیں رکی ہوئی تھیں
تالاب کے کنارے شاخیں جھکی ہوئی تھیں
خورشید چھپ رہا تھا رنگین پہاڑیوں میں
طاؤس پر سمیٹے بیٹھے تھے جھاڑیوں میں
لہروں میں جیسے کوئی دل ڈوبو رہا تھا
میں سو رہا ہوں ایسے محسوس ہو رہا تھا
تیزی سے جنگلوں میں یوں ریل جا رہی تھی
لیلیٰ ستار اپنا گویا بجا رہی تھی

جناح اور گاندھی

بیسوی صدی کے پہلے نصف میں دو عظیم انسانوں موہن داس کرم چند گاندھی اور محمد علی جناح نے ہندوستان کے سیاسی منظر نامے کو اپنی طاقتور شخصیات سے پر کیا۔ دونوں عوام کے عظیم رہنما اور ہندوستان کی جدوجہد آزادی کے علمبردار تھے۔ سیاسی سرگرمیوں میں دونوں کے محرک عظیم مقاصد تھے۔ دونوں کی سوچ اور فکر اجتماعی ہونے کے ساتھ ساتھ ان میں قیادت کی بہترین صلاحیتیں موجود تھیں۔ البتہ دونوں کے درمیان بقائے باہمی کی گنجائش زیادہ نہ تھی۔ ان کے نظریات اور سیاسی افکار میں تضاد اور ٹکراؤ تھا۔

بھارت میں قائداعظم کو تقسیم ہند کا واحد ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے جنہوں نے دو قومی نظریہ دے کر ہندو مسلم اتحاد کو پارہ پارہ کیا۔ عام تاثر یہ ہے کہ انہوں نے مذہب کی بنیاد پر لوگوں میں تشدد کی آگ بھڑکائی اور برصغیر کو خون میں نہلا دیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ دو قومی نظرئے کی بنیاد سب سے پہلے سر سید احمد خان نے رکھی۔ یہ انگریز کی سیاست تھی۔ جو بہت دور اندیش تھا۔ جبکہ گاندھی کی تصویر کشی اس طرح کی جاتی ہے کہ وہ عقل و خرد' اخلاق اور محبت کا مجسمہ نظر آتے ہیں آہنسا اور عدم تشدد جیسے ان کے نظریات کے حوالے سے انہیں بدھ کا اوتار بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ باد النظر میں دیکھا جائے تو یہ دونوں تصویریں اعتدال سے ہٹی ہوئی نظر آتی ہیں۔ میں یہاں دونوں رہنماؤں کا تقابلی جائزہ پیش نہیں کر رہا نہ ہی اس وقت میرا یہ موضوع ہے۔ میں ان دونوں شخصیات کو دو انتہاؤں میں دکھانے کی بجائے ان کے اچھے پہلوؤں اور عظیم خیالات کو اجاگر کرنا چاہتا ہوں۔ جس کے لئے میں نے مختصر طور پر چند ایک تاریخی واقعات' کتابوں کے حوالے اور ان کے بارے میں اہل الرائے اصحاب کی تحریروں کے اقتباسات پیش کئے ہیں۔ جن سے ان کی شخصیات کے خدو خال' سوچ و فکر اور فلسفہ نمایاں ہو سکے۔

گاندھی ایک عظیم لیڈر تھے۔ انہوں نے اپنا رشتہ ہمیشہ عام لوگوں سے جوڑے رکھا۔ غریب مزدور کسان اور محنت کش ان کی اصل پارٹی اور اصل طاقت تھے۔ ان کی

ساری عمر کی جدوجہد اسی نچلے طبقے کی زندگی بہتر بنانے کی کوششوں میں صرف ہوئی۔ وہ انسانی حقوق کے علمبردار تھے اور انسانوں کے درمیان اونچ نیچ ذات پات کے فرق اور رنگ و نسل کی بنیاد پر کسی تفریق کے قائل نہ تھے۔

جنوبی افریقہ میں گوری اقلیت کے ہاتھوں کالوں کی اکثریت پر ظلم اور ناانصافیوں نے ان کے اندر طوفان کھڑا کر دیا تھا چنانچہ انہوں نے ایسے ظالمانہ قوانین بدلنے کیلئے بھرپور جدوجہد کی جن سے انسانی تذلیل کے پہلو نکلتے تھے۔ اس جدوجہد نے گاندھی کی شخصیت کو نمایاں کیا اور انہیں بھارتی معاشرے میں عزت و احترام کا درجہ دلا دیا۔

جنوبی افریقہ سے بھارت واپسی پر گاندھی نے بھارت کی سیاسی آزادی اور عوام کے جمہوری حقوق کی بازیابی کے لئے بھرپور جدوجہد شروع کی اور کانگریس کے ساتھ وابستہ ہوگئے۔ تحریک آزادی ہند کی جدوجہد میں وہ روح رواں رہے اور بھارت کے سیاسی منظر نامے پر چھائے رہے۔ اس دوران انہیں کئی بار جیل بھی جانا پڑا۔

گاندھی کی فکر دوسرے سیاسی لیڈروں کے ساتھ مطابقت نہ رکھتی تھی کیونکہ وہ روائتی اور گھسے پٹے نظریات سے چمٹے رہنے کے قائل نہ تھے۔ ان کی شخصیت کا نمایاں پہلو عمل تھا۔ وہ عام سیاستدانوں کی طرح بیان دینے اور جلسے جلوس کی قیادت کر کے سیاسی لیڈر کا درجہ پا لینے پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ ان کی جدوجہد عام آدمی کی زندگی کا محور تھی۔ انہوں نے اپنے آپ کو غریب مزدور کسان سے کبھی دور نہیں کیا۔

ان کے نظریات کا سب سے اہم پہلو جس نے انہیں عالمی شہرت کا حامل بنا دیا وہ فلسفہ عدم تشدد یا اہنسا تھا۔ وہ خود اپنی کتاب میں لکھتے ہیں۔

"میرا انکسار مجھے اس بات کی اجازت نہیں دیتا ورنہ میں علی الاعلان کہتا کہ میرا پیغام عدم تشدد عالمگیر اور آفاقی حیثیت کا حامل ہے۔ اگر اس نے اپنی مادر مٹی میں پھل نہ پایا تو پھر یہ یقیناً" پوری دنیا میں بھی ختم ہو جائے گا۔" (از ایس کے موجمعدار جناح اور گاندھی صفحہ 107)

گاندھی کا فلسفہ عدم تشدد اپنی بے مثال اچھائیوں کے باوجود عملی طور پر اعلیٰ مقاصد

حاصل نہ کر سکا۔ ایک برطانوی مصنف Michal-H-Hart نے اپنی تصنیف The 100 میں ایک سو ایسی شخصیات کا انتخاب کیا جنہوں نے دنیا کی تاریخ میں متاثر کن کردار ادا کیا۔ اس نے ان شخصیات کی مختصر تاریخ اور وجہ شہرت بھی لکھی۔ ان سو شخصیات کے علاوہ اس نے کچھ اہم لوگوں کے ناموں کی فہرست بھی دی اور ان میں سے دس افراد چنے جن کا ذکر اس نے تفصیل کے ساتھ کیا۔ جنہیں Honourable Mentions and interesting Misses کا عنوان دیا گیا۔ اس میں مہاتما گاندھی کا نام بھی ہے۔

اس نے لکھا کہ گاندھی تحریک آزادی ہند کے نمایاں اور غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک لیڈر تھے۔ اس بنا پر کئی دوستوں نے مجھے مشورہ دیا کہ 100 افراد کی فہرست میں انہیں بھی شامل کر لوں۔ لیکن ان کو شامل نہ کرنے کی کئی وجوہات تھیں۔ ہندوستان سے برطانیہ نے جانا ہی تھا۔ جلد یا بدیر۔ خواہ گاندھی نہ بھی ہوتے۔ کیونکہ کالونیاں قائم رکھنے کا نظام دم توڑ رہا تھا۔ دوسری بات یہ کہ گاندھی جی تحریک آزادی کے بانی نہیں تھے۔ انڈین نیشنل کانگریس 1885ء میں قائم ہو چکی تھی۔ نہ ہی وہ واحد ایسے لیڈر تھے جو اس تحریک کے قائد تھے۔ البتہ ان کی تحریک عدم تشدد بنیادی توجہ اور اہمیت کی حامل ہے۔ گاندھی کی یہ پالیسی دنیا بھر کے لئے بہترین ثابت ہوتی لیکن بدقسمتی سے خود ہندوستان میں بھی اسے عملی طور پر عمومی پذیرائی نہ مل سکی۔

مصنف کے بقول گاندھی کی ٹیکنیکس (Techniques) 1954-55ء میں گووا (GOA) سے پرتگیز کا کنٹرول ختم کرنے کے لئے استعمال کی گئی لیکن کامیابی نہ ہوئی اور پھر بھارت نے طاقت کے استعمال سے اس پر قبضہ کر لیا۔ پاکستان کے قیام کے بعد بھارت اور پاکستان کی تین جنگیں ہو چکی ہیں۔ اسی طرح چین کے ساتھ بھی سرحدی جنگ ہو چکی ہے۔ دوسرے ممالک بھی گاندھی کی (Techneques) اپنانے سے کتراتے ہیں۔

تقریباً" اسی سالوں کے دوران جب سے انہوں نے یہ فلسفہ اپنایا دنیا دو بڑی جنگیں

دیکھ چکی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ فلاسفر ہونے کے ناطے گاندھی ناکام تھے۔ پیارے لال نے گاندھی جی کے بارے میں لکھا "گاندھی جی اس بوڑھے آدمی کی طرح تھے جسے بلند مقام پر فائز کیا جائے۔ جسے اس کی دانشمندی اور غلطی سے مبرا فہم کے لئے سراہا جائے' جس سے مشاورت طلب کی جائے' جس کی بات مودبانہ توجہ سے سنی جائے اور پھر اسے چھوڑ کر چلا جایا جائے۔" لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ آنے والے وقت میں تاریخ انہیں کیا حیثیت اور مقام دے گی۔ جیسے 450 قبل مسیح میں کون کہہ سکتا تھا کہ چین کا فلاسفر Confucius آنے والے وقت میں اتنی اہمیت اختیار کر لے گا۔

گاندھی سمجھتے تھے کہ وہ اپنے فلسفہ عدم تشدد کی ضرب کاری سے برطانوی سرکار کو سرنگوں کر لیں گے اور انہیں بھارت سے چلے جانے پر مجبور کر دیں گے۔ گاندھی نے کہا۔

"میرا یہ یقین روز بروز گہرا ہوتا جا رہا ہے کہ صرف اور صرف خالص فلسفہ عدم تشدد سرکار برطانیہ کے منظم تشدد کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ اس عدم تشدد کا اظہار سول نافرمانی کی تحریک کے ذریعے کیا جائے گا۔ میں جانتا ہوں کہ عدم تشدد کی تحریک شروع کر کے میں ایک دیوانہ وار اور خطرناک بازی کھیل رہا ہوں۔ میں قوم کے عقائد میں تبدیلی لانا چاہتا ہوں۔ یہ تحریک بہت بڑا داؤ ہے۔" (مہاتما از تندولکر جلد سوم صفحہ 14)

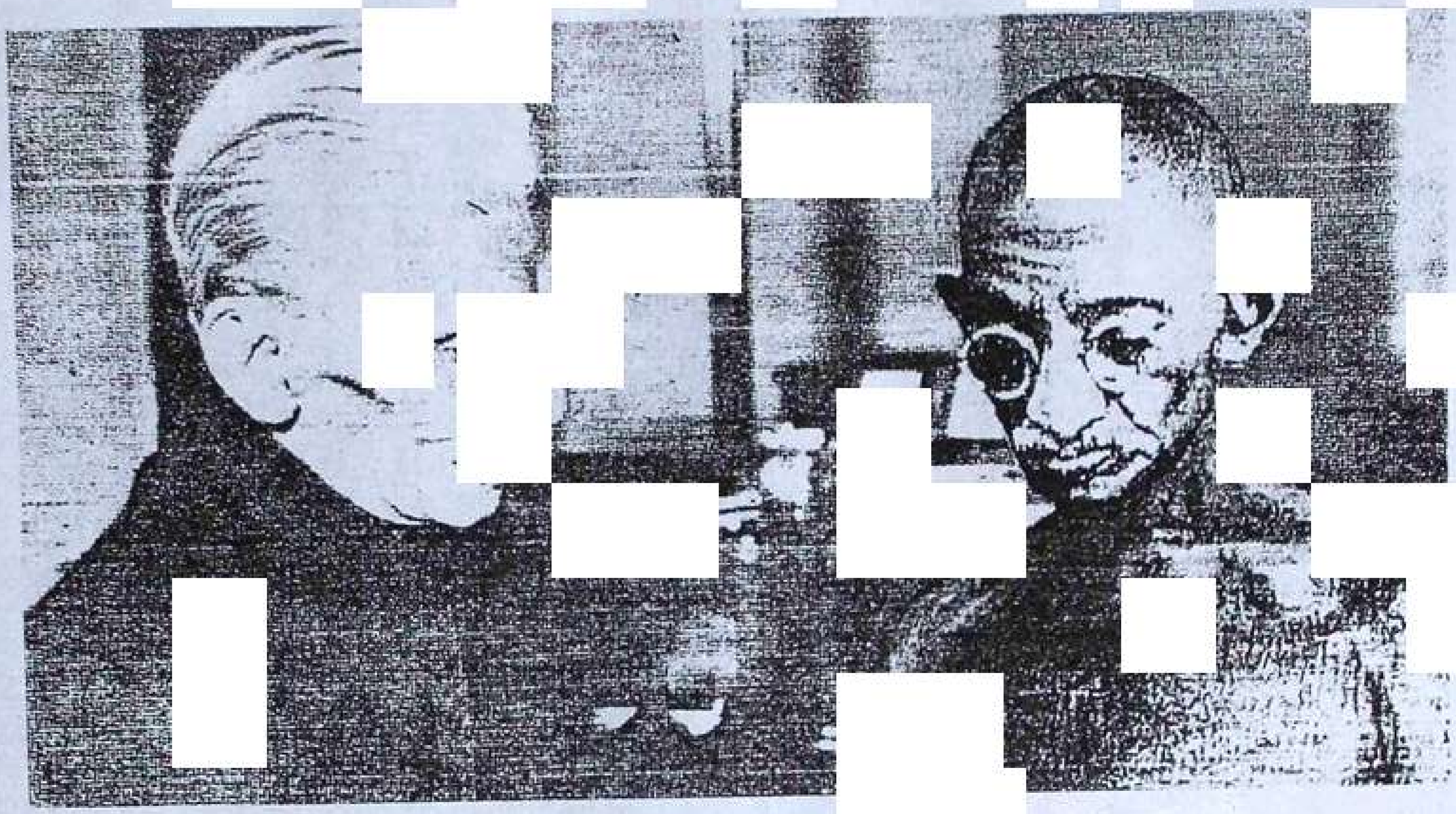
آئین سٹائین نے ایک مرتبہ گاندھی کے بارے میں کہا کہ ڈیڑھ سو سال گزر جانے پر بھی لوگ اس بات کو ماننے پر تیار نہ ہوں گے کہ ان کی سرزمین پر گاندھی جیسا شخص رہتا تھا۔ جو اتنی اعلیٰ صفات اور نظریات کا حامل تھا لیکن 150 سال کی بات کیوں کریں ہم 50 سالوں کا ذکر ہی کر لیں۔ آج بھارت میں گاندھی کے نظریات پر عمل کرنے والا کون موجود ہے۔ گاندھی جی کے فلسفے نظرئے اور اقدار کی کوئی پرواہ نہیں کرتا۔ 1947ء میں انسانی قتل عام پر گاندھی نے سخت احتجاج کیا۔ اور ہندو مسلم اتحاد پر زور دینے والا شخص جسے خود انگیرزوں نے تو برداشت کر لیا۔ لیکن اس کے

اپنے لوگ اسے صرف ایک سال کے لئے بھی برداشت نہ کر سکے۔

نوبل انعام دینے والی کمیٹی نے 1947ء میں مہاتما گاندھی کے لئے امن کا نوبل انعام اس اعتراض پر روک لیا تھا کہ وہ ایک قوم پرست لیڈر ہیں۔ پانچ رکنی کمیٹی کے دو ارکان گاندھی کے عدم مذاہمت کے فلسفہ پر ان کو ایوارڈ دینے کے حق میں تھے جبکہ کمیٹی کے سربراہ گنر جان نے اس تجویز کی مخالفت کی۔ اس کا کہنا تھا کہ بلاشبہ گاندھی ایک بڑی شخصیت ہیں لیکن وہ امن کے پیامبر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک قوم پرست بھی ہیں۔ ایک دوسرے مخالف ٹرینائل کا خیال تھا کہ انڈیا اور پاکستان کے جھگڑوں کو پہلے حل کیا جائے۔

گاندھی کے نظریات پر انتہا پسندی کا غلبہ بھی موجود نظر آتا ہے۔ وہ جدید طبی علوم کو بالکل اہمیت نہیں دیتے تھے بلکہ انہیں کلی طور پر رد کرنے کا مشورہ دیتے۔ وہ کہتے تھے۔ ”میڈیکل سائنس پر میں عطائیت کو آج بھی ترجیح دیتا ہوں۔ ہمارے دور کے ہسپتال شیطان کے کارخانے ہیں۔ جن کے ذریعے وہ اپنی سیاہ سلطنت پر اپنی عملداری قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ ہسپتال برائی' غلامی' بدکاری اور مصائب کے اڈے ہیں۔ اگر ان ہسپتالوں میں ٹی بی یا جنسی امراض کا علاج نہ کیا جائے تو مجھے یقین ہے کہ ان بیماریوں ہی کا خاتمہ ہو جائے۔ ان کے بقول ہندوستان کی نجات ہر اس چیز کو بھلا دینے میں مضمر ہے جو اس نے گذشتہ پچاس سالوں میں سیکھی۔ ہندوستان کو اپنی بقا کیلئے ریلوے' ٹیلی گراف' ہسپتالوں' ڈاکٹروں' وکیلوں' الغرض ہر ایسی چیز سے اپنا دامن پاک کرنا ہوگا (ایس کے' موجمدار جناح اور گاندھی صفحہ 116)

گاندھی جی نے جناح سے بھی تحریک عدم تعاون کی حمائت حاصل کرنے کی درخواست کی۔ جسے جناح نے یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ آپ کے خیالات سے مجھے اتفاق نہیں۔ میں آپ کے انتہا پسندانہ خیالات کی وجہ سے آپ کے منصوبے کے لئے ناکامی کا باعث بن سکتا ہوں۔ (جناح از ایم ایچ ایس صفحہ 225)



قائداعظم محمد علی جناح اور مہ[illegible]

گاندھی نے مذہب کی زرہ بکتر نہیں پہنی اور اپنے آپ کو مذہبی لیڈر کا روپ نہیں دیا۔ ان کے پیش نظر انسان کی بھلائی تھی۔ انہوں نے ہٹلر کو لکھا کہ وہ تمام بنی نوع انسان کو بلا لحاظ رنگ و نسل اور قومیت قبول کر لے۔ انہوں نے اکثر یہ دعویٰ کیا کہ وہ بیک وقت ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی۔ وہ عبادت کے وقت بھگوت گیتا پڑھنے کے ساتھ ساتھ قرآن پاک کی تلاوت کا اہتمام بھی کرتے تھے۔ گاندھی جی مسلمانوں کے جلسوں میں بھی شرکت کر لیتے۔ جماعت اسلامی ہند نے بہار کے ریلیف کیمپ میں شرکت کے لئے پٹنہ میں گاندھی کو ایک اجتماع میں شرکت کی دعوت دی۔ گاندھی اس میں شریک ہوئے اور انہوں نے عام سامعین کے ساتھ دریوں پر بیٹھ کر مولانا اصلاحی کی تقریر سنی۔

ہندو عوام میں گاندھی کی کشش میں کبھی کوئی فرق نہیں پڑا۔ حقیقتاً" وہ ہندو ہی تھے۔ وہ برت رکھتے۔ چپ کا روزہ رکھتے اور بکری کا دودھ پیتے۔

"دنیا بدل گئی" کے مصنف شاہد حامد اور "جناح اور گاندھی" کے بھارتی مصنف ایس کے موجمدار اپنی کتاب میں ایک ہی موقف اختیار کرتے ہیں کہ گاندھی خود فریبی میں مبتلا رہتے اور خوابوں کو حقائق پر ترجیح دیتے رہے۔ ان کی سیاسی غلطیوں اور زمینی حقائق سے ہٹ کر فیصلے کرنے کی وجہ سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں خلیج اور دوری پیدا ہوتی گئی۔ جو بالاخر ہندوؤں اور مسلمانوں کی سیاسی علیحدگی کا سبب بنی۔

ایس کے موجمدار کے بقول پاکستان گاندھی کی غلط سوچ اور جناح کے ساتھ غیر حقیقت پسندانہ اور معاندانہ رویہ رکھنے کی وجہ سے قائم ہوا۔ کانگریس اور مسلم لیگ میں دوری کا سبب بھی گاندھی کی ذات تھی۔

گاندھی قائداعظم کے بارے میں زیادہ اچھی رائے نہ رکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جناح کو عوام کی حمایت حاصل نہیں ہے۔ دوسری طرف جناح بھی گاندھی کے اقدامات اور سرگرمیوں کو مشکوک سمجھتے تھے اور ان سے شاکی رہتے تھے۔ تاہم دونوں لیڈروں کا موقف انگریز سے آزادی حاصل کرنے کی حد تک ایک تھا اور وہ اہم قومی معاملات میں ایک دوسرے سے مشورہ کرتے رہتے۔ 17 فروری 1944ء کو گاندھی جیل

سے رہا ہوئے تو انہوں نے ہندوستان کی فوری آزادی کا مطالبہ کر دیا۔ انہوں نے جناح سے ملاقات کی اور دونوں نے مل کر ایک فارمولا تیار کیا۔ گاندھی [redacted] قومی نظ[redacted] تسلیم نہیں کیا اور اس پر اصرار کیا کہ جنگ کے بعد ایک کمشن قائم کیا جائے جو ملی جلی آبادی والے علاقوں کی نشاندہی کر کے وہاں کے لوگوں کی رائے ووٹ کے ذریعے معلوم کرے۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہو سکے گا۔ کہ دو مختلف ریاستوں کے قیام پر [redacted] یا جائے۔ انہوں نے یہ بھی تجویز کیا کہ دونوں ریاستوں کے درمیان مشترکہ مفادات پر ایک معاہدہ کر لیا جائے۔ ا[redacted]نے کہا کہ [redacted]ہ نظر نہیں آتی کہ دو قومیں کیوں امن و آشتی کے ساتھ [redacted] سکتیں۔ یہ [redacted]لا بے سود رہا اور کوئی خاص نتائج برآمد نہ ہو سکے۔ بعد میں گاندھی نے قیام پاکستان کو غیر حقیقت پسندی سے تعبیر کیا۔

گاندھی کی مخالفت [redacted] چاہنے کے باوجود پاکستان معرض وجود میں آگیا تو گاندھی کی فطری صلح جوئی [redacted] عدم تشدد کے فلسفے میں کوئی جھول نہ آئی۔ انہوں نے اس سیاسی گرما گرمی اور مخالفت سے پر ماحول میں بھی جرات و ہمت سے کام لیا۔ پاکستان کے وجود کو اپنی سیاسی شکست اور انا کا [redacted]نے کی بجائے انسانی جانوں کے ضیاع پر اندر ہی اندر کڑھتے رہے اور پاکستان کے خلاف بیان دینے سے قطع نظر صلح جوئی، امن اور باہمی رقابت کو دور کرنے کی ضرورت کا احساس دلایا۔ انہوں نے کہا "میں پاکستان کو تسلیم کرتے ہوئے آپس کے جھگڑوں کو ختم کرنے اور امن قائم کرنے کی بات کرتا ہوں۔ میں دونوں مملکتوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ ملکی اور بین الاقوامی ذمہ داریوں کا احساس کریں اور ماضی کی تلخیوں کو بھلا کر اچھے ہمسایوں کی طرح رہنا شروع کریں۔ انہوں نے کہا میں بغیر ویزے کے ننگے پاؤں پاکستان جانے کو تیار ہوں۔ گاندھی نے دوسرے بھارتی لیڈروں کی [redacted]ئے بغیر اعلان کیا کہ پاکستان کو اس کے حصے کا 69 کروڑ روپیہ ضرور ملنا چاہئے۔ گاندھی کی یہ فراخدلی اور فلسفہ عدم تشدد خود بھارت میں پامال ہو گیا۔ بھارت کے ایک شہری ناتھورام گوڈسے نے گاندھی جی کو قتل

کر دیا۔ بھارت کے ایک محقق اور گاندھی کی فلاسفی کے پیروکار اچاریہ رام مورتی نے ماؤنٹ ابو کی کیمپ میٹنگ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ گاندھی کو اسی بنا پر قتل کیا گیا کہ اس نے رواداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے پاکستان کو اس کے حصے کا روپیہ دینے کا اعلان کیا تھا۔ بھارتیہ جنتا پارٹی کا کہنا ہے کہ مہاتما گاندھی کو برطانیہ کی خفیہ ایجنسی نے قتل کروایا تھا۔ تاکہ گاندھی کو دورۂ پاکستان سے روکا جا سکے اور دونوں ممالک کے درمیان کشیدہ تعلقات برقرار رہیں اور اس طرح برطانیہ دونوں کے درمیان ثالث کا کردار ادا کر سکے۔ گاندھی کے قتل کے موقع پر دو برطانوی کونسلر موقع پر اپنے اپنے کیمرے لئے تصاویر لینے کے لئے موجود تھے۔ برطانوی ہائی کمشنر نے دونوں برطانوی باشندوں کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ دونوں افراد رات کو برطانیہ روانہ ہوگئے تھے۔ BJP کے ترجمان رسالے India Today کے مطابق عدم تشدد پر یقین رکھنے والے گاندھی کے دورۂ پاکستان سے دونوں آزاد ممالک کے آپس کے تعلقات میں بہتری آسکتی تھی۔ گاندھی کی وفات پر پاکستان میں سرکاری طور پر سوگ منایا گیا اور پاکستانی پرچم سرنگوں کر دیا گیا۔

فیض احمد فیض نے اپنے اخبار پاکستان ٹائمز میں ادارتی مضمون میں گاندھی کو شاندار الفاظ میں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا "ہم میں سے بہت کم لوگ پاکستان اور انڈیا کی سیاست کے پس پردہ محرکات کو جان سکتے تھے جن کا ادراک گاندھی کو تھا۔ وہ اس قتل و غارت گری بلڈ شیڈ لوگوں کی محرومیوں' مجبوریوں' بے چارگیوں اور انسان کے ہاتھوں انسان کی تذلیل پر نوحہ کناں تھے۔

گاندھی کی طرح کے کم ہی لوگ تھے جو نئی نئی آزادی حاصل کرنے والے ان دونوں ملکوں کی سیاست' کلچر' تہذیب و ثقافت اور ان کی قومی آزادیوں پر آئندہ رد پذیر ہونے والے خطرناک اثرات کا شعور رکھتے تھے۔ گاندھی نے بے خوفی اور جرات کے ساتھ اس کی بروقت نشاندہی کی اور نفرتوں کو ختم کرنے کے لئے آواز اٹھائی۔ آج وہ گاندھی جا چکا ہے۔ بھارت کے عوام اور بلاواسطہ طور پر پاکستان کے عوام گاندھی کو

وچکے ہیں۔ بھی دونوں ملکوں کے عوام گاندھی لے میں آزادی ہند کے لئے
ٹھے لڑتے تھے۔ ہم توقع کریں گے کہ دونوں ملکوں دم متحد ہو کر دو آزاد ملکوں
کے جھنڈے تلے اپنی شخصی آزادیوں کو قائم رکھتے ہوئے امن اور بھائی چارے کے
غ کیلئے ں گے" بھارت کے ایک انگریزی ماہنامے Mainstream میں
مندرجہ بالا اقتباس مظہر علی خان سے منسوب کیا گیا ہے۔

گاندھی کا اصل کارنامہ اور کارہائے نمایاں ں جدوجہد میں ں کیا جا سکتا ہے جو
انہوں نے نچلی سطح تک عوام کو اقتدار میں شرکت کرنے اور پیداوار میں اس کی
راکت کو یقین بنانے کیلئے کیا یعنی پنچائت راج۔ یہ پروگرام بھارت ے اری کے
خاتے کو یقینی بنانے کے لئے تھا۔ اس پروگرام کا مقصد یہ تھا کہ ہر دیہات ایک مکمل
یونٹ ہو جس میں تعلیم، کھیل، ک، پانی، چھوٹی صنعت، کپڑا اور تھیٹر کی سہولیات
میسر صفائی کا اچھا انتظا نچویں کلاس تک ت کے ۔ لیم لازمی
۔ گاندھی نے جاگیرداروں کو قائل کیا کہ وہ اپنی زمینیں ے کاشتکاروں کو دے
دیں۔ تاکہ ہر دیہات کو ایک یونٹ بنا کر اجتماعی کاشتکاری کر ے عمل کی جا
سکے۔ ان کا پیغام تھا "فطرت کی طرف مراجعت۔ شہروں کو ر کی جانب
لوٹیں" گاندھی نے کہا "میں آزادی کا مطلب صرف انتقال اقتدار نہیں لیتا کہ برطانوی
سامراج چلا جائے اور اسکی جگہ چند جاگیردار سرمایہ دار ہم پر حکمران بن بیٹھیں۔ میں
آزادی اسے سمجھتا ہوں کہ ہر بھارتی باشندہ محسوس کرے اور تجربہ کر کے جان جائے کہ
آزاد ہے۔ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائے اور اقتصادی خود انحصاری حاصل کرے۔"
اسی جدوجہد کا نتیجہ تھا کہ ہندوستان میں آزادی کے ایک سال کے اندر ہی تنسیخ
زمینداری ہو گئی تھی اور 650 کے لگ بھگ ریاستیں بہ یک جنبش قلم ختم کر دی گئیں
تھی۔ گاندھی نے اس نظریے کی افادیت محسوس کرتے ہو ء میں کہا تھا "
بھارت کی آزادی کی ابتداء انتہائی نچلی سطح سے ہونی چاہیے کہ اس حتنے
اختیارات ہوں گے عام لوگوں کے حق میں بہتر ہو گا۔" چنا



پاکستانی اور بھارتی طلباء



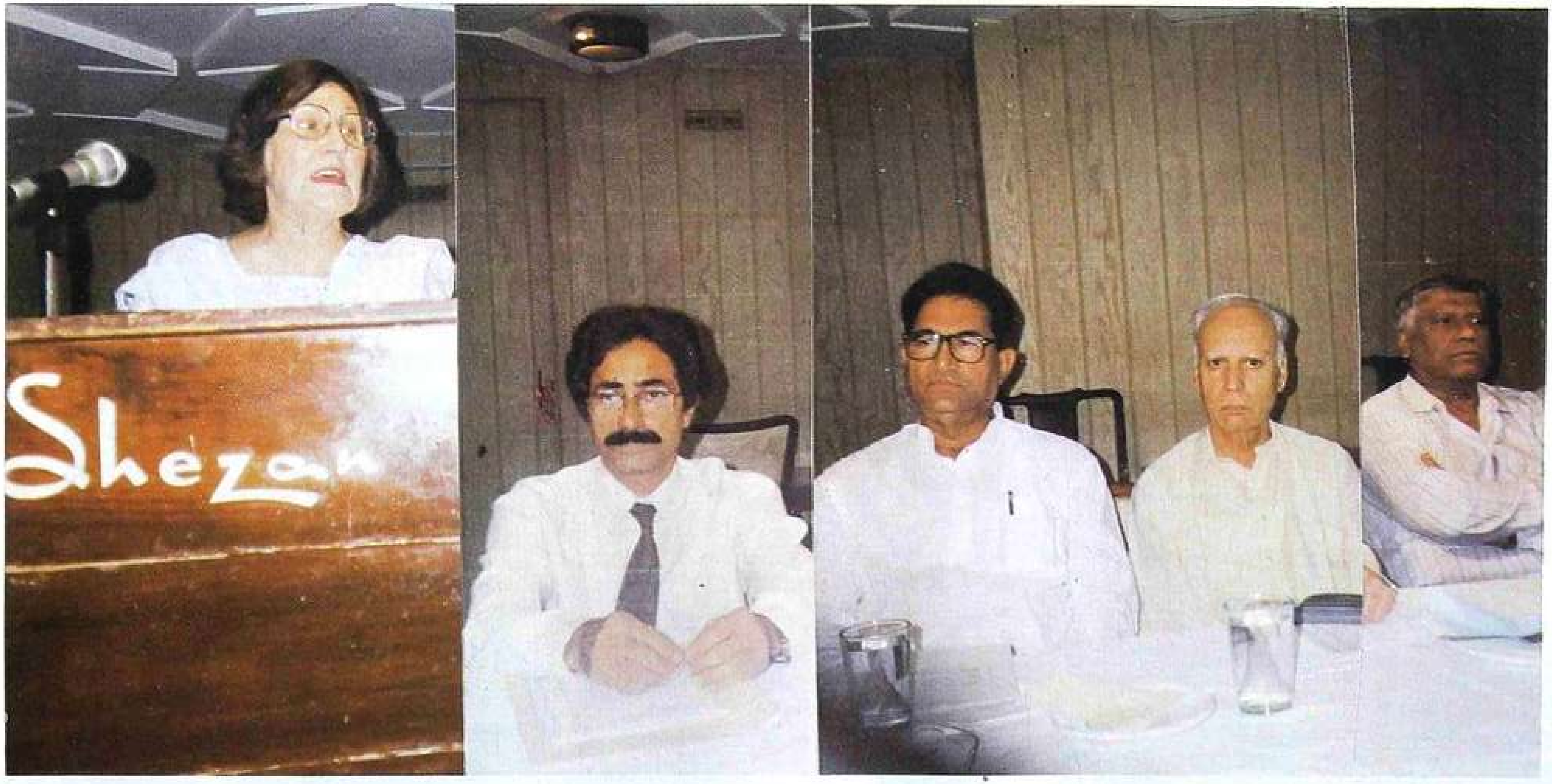
سینٹ سٹیفنز کالج دہلی کے پرنسپل اور پاکستانی طلباء



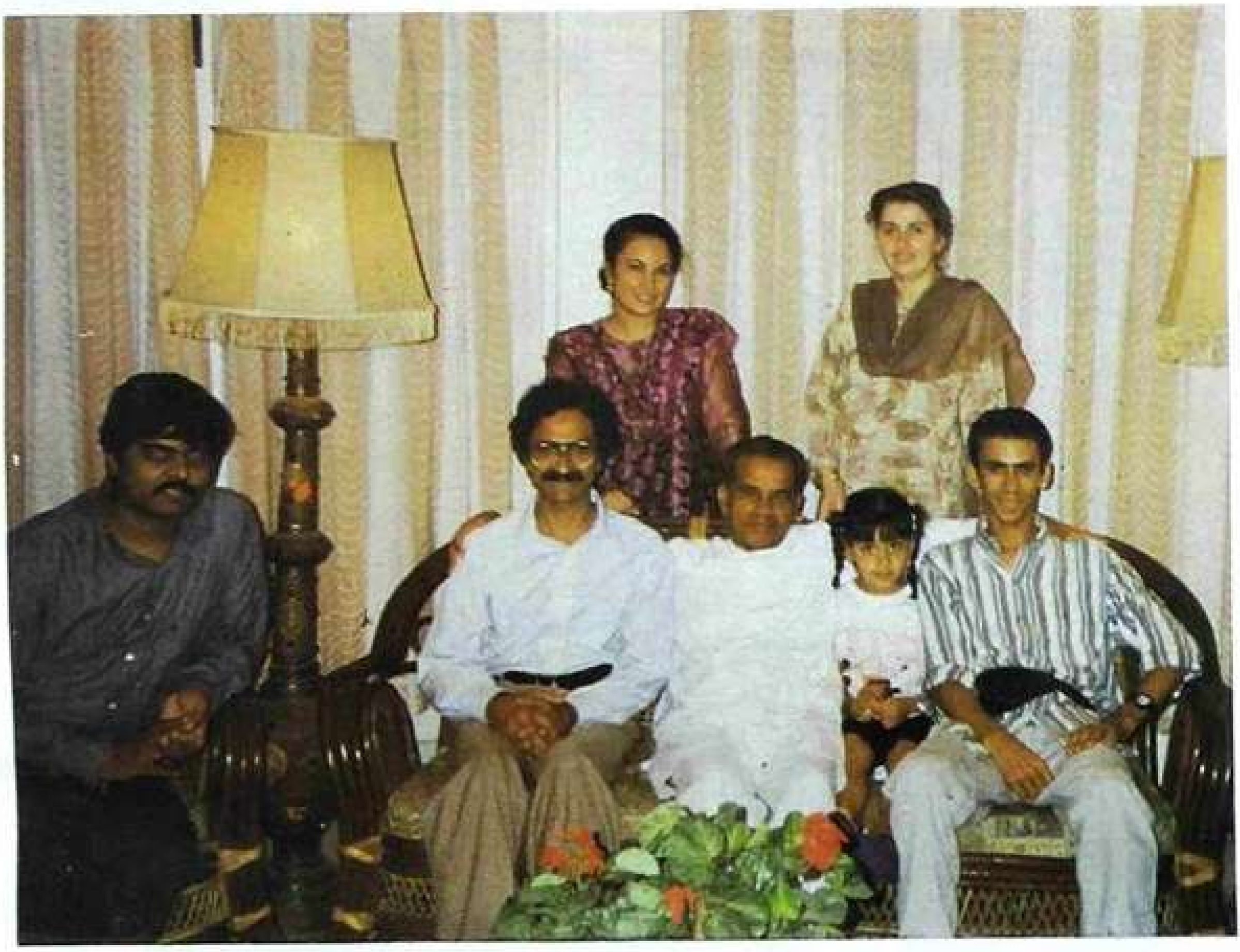
مہاتما گاندھی کی پڑپوتی سپریا گاندھی (انتہائی دائیں) میزبان سہاس بورکر، کے اہل خانہ اور پاکستانی طلباء



مرزا غالب کا مزار



لاہور کنونشن۔ پاکستان گولڈن جوبلی کی تقریب



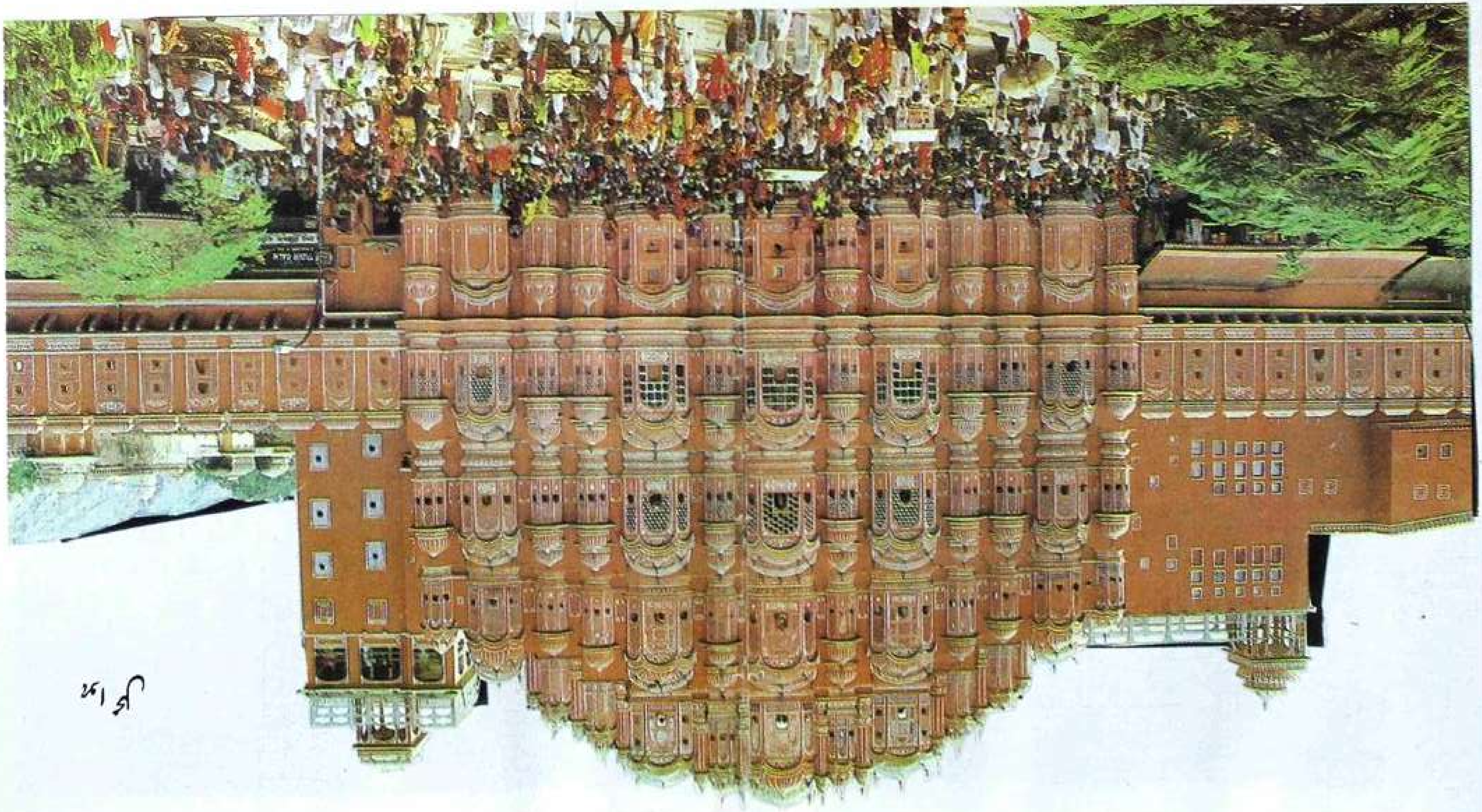
کانگرس آئی کے سیکرٹری بی بی موہریہ ان کی بہو تبسم اور پاکستانی وفد کے ارکان



کشمیر کمیٹی کے ارکان کملا پرشاد (بھارت) میری کھیم چند (بھارت) اویس شیخ

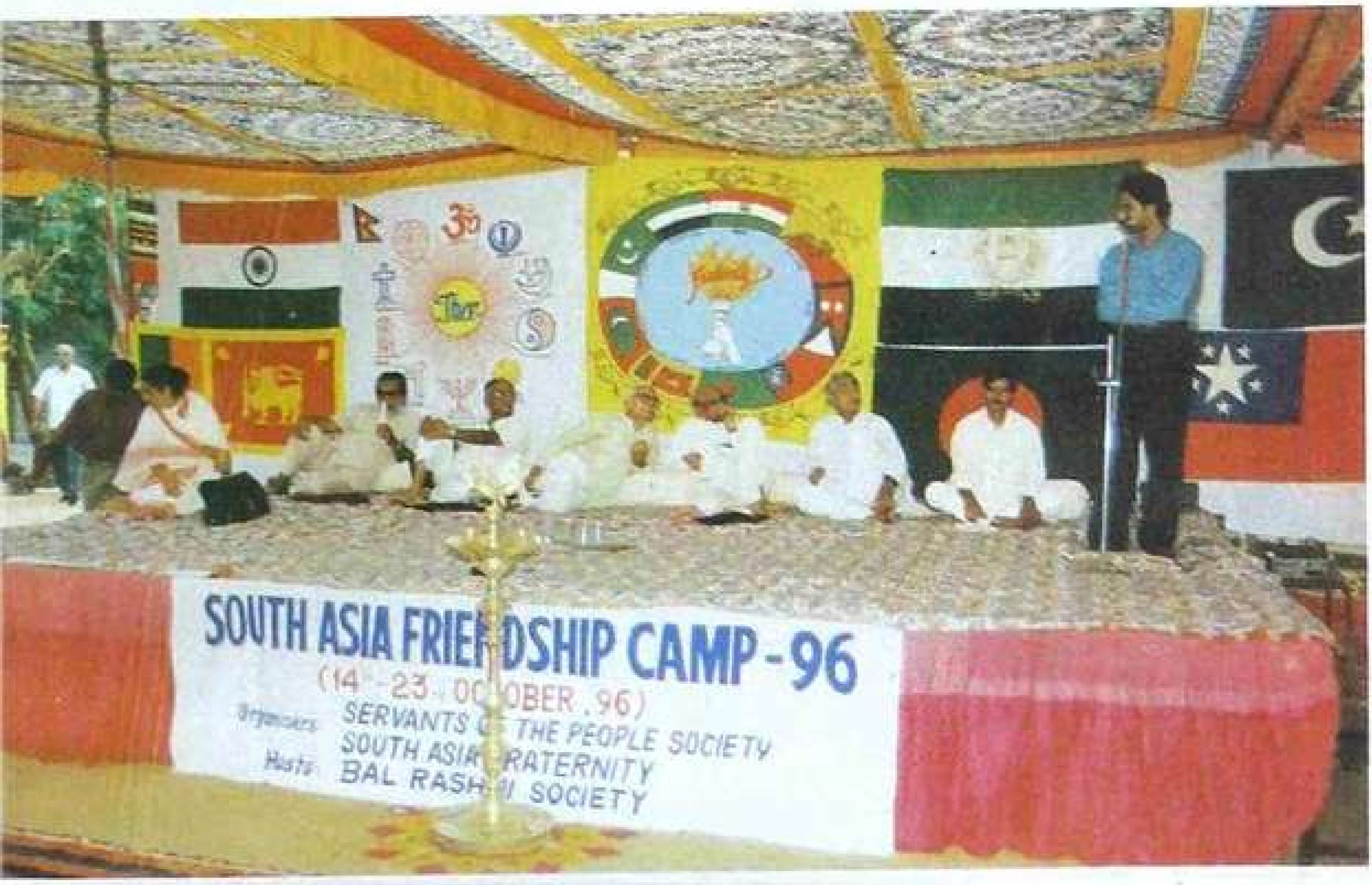


پاک بھارت تجارت سیمینار





دلواڑہ ٹمپل



کھیڑی کیمپ۔ مصنف اظہار خیال کر رہے ہیں



آئی جی پولیس جے پور، سیکرٹری بال رشمی سوسائٹی مسز ایلس گارگ،
انٹرنیشنل اوڈیسی ڈانسر کویتا دیوبی، اویس شیخ، سیکرٹری سیف سیتاپال

سازوں نے گاندھی کی خواہشات کے احترام میں پنچائت کو باقاعدہ آئنی تحفظ فراہم کیا اور بھارتی آئین کے آرٹیکل 40 کے تحت قرار دیا کہ حکومت پنچائتیں قائم کرنے کی پابند ہوگی اور انہیں وہ تمام اختیارات دئے جائیں گے جن کی بدولت وہ موثر طور پر کام کر سکیں۔ یوں بھارت کے تمام صوبوں میں 1954ء تک باقاعدہ پنچائت سسٹم قائم ہو گیا۔ بھارت کے صوبہ پنجاب میں سولہ ہزار دیہات میں نو ہزار پنچائتیں ہیں۔ ایک انگریز مورخ نے لکھا تھا "پنچائت میں جدید ریاست کی تمام خصوصیات موجود ہیں اور یہ ایک ایسا عدالتی ادارہ ہے جو انقلابات زمانہ اور بادشاہوں کے تغیر و تبدل کے باوجود بڑی حد تک اپنی اصل شکل میں محفوظ رہا۔

پاکستان میں صورت حال مختلف رہی ہے۔ یہاں بہت سے جاگیردار سیاستدانوں کے روپ میں اسمبلیوں پر قبضہ جمائے بیٹھے ہیں۔ وہ عوام کو اپنی سیاست کا سرچشمہ قرار دیتے ہیں اور جلسہ عام میں ہاریوں' مزارعوں اور مزدوروں کے حقوق دلانے کے لئے اپنی جان کی بازی لگانے کی بات کرتے ہیں۔ انہیں ہندوستان سے مقابلے کی اتنی خواہش ہے کہ اس کے ایٹمی دھماکوں کی خبر سن کر یہ دعوے کرتے ہیں کہ اگر ہم برسراقتدار آئے ہوتے تو جوابی دھماکوں میں گھنٹہ بھر کی دیر نہ لگاتے۔ لیکن اس بارے میں انہیں ہندوستان کی پیروی کرنے کا خیال ہی نہیں آیا کہ وہاں آزادی کے فوراً" بعد جاگیرداری کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ پاکستان میں جو وقتاً" فوقتاً" زرعی اصلاحات کی گئیں وہ عملاً" ناکام بنادی گئیں کیونکہ ان اصلاحات پر عملی جامہ پہنانے والے خود جاگیردار تھے۔ انہوں نے زمینوں کو فرضی ناموں سے تقسیم کر کے ان پر اپنا قبضہ برقرار رکھا۔ گاندھی کی طرح قائداعظم بھی جاگیرداری نظام کا خاتمہ چاہتے تھے۔ اور اس ظالمانہ نظام کے اندر جکڑے ہوئے غریب اور بے بس لوگوں کے شعور کو بیدار کرنے کے لئے انہوں نے دور دراز دیہاتوں کا دورہ کیا اور مزارعوں' کاشتکاروں' کسانوں سے ملاقاتیں کیں۔ ان کے مسائل کو سنا دیکھا اور سمجھا۔ انہوں نے اپنی ایک تقریر میں جاگیرداری نظام کو ناقص استحصال زدہ اور ظالمانہ قرار دیا اور اس عزم کا اظہار کیا کہ وہ پاکستان بننے کے بعد جاگیرداری

نظام کو ختم کریں گے۔ انہوں نے کہا "پاکستان کی حکومت عوام کی حکومت ہوگی اور میں جاگیرداروں' سرمایہ داروں کو انتباہ کرتا ہوں۔ جنہوں نے ہمارے عوام کے پیدا کردہ وسائل سے ایک ایسے نظام کو تشکیل دیا ہے جو فرسودہ' ظالمانہ' ناقص اور استحصال پر مبنی ہے۔ اس نظام نے انہیں اتنا خود غرض بنا دیا ہے کہ اب ان سے اس مسئلے پر بات کرنا بھی فضول لگتا ہے۔ انسانوں کا استحصال کرنا ان کے خون میں رچ بس گیا ہے۔ وہ اسلام کا سبق بھول گئے ہیں۔ لالچ اور حرص نے انہیں اندھا کر دیا ہے اور وہ دولت کے انبار لگا لینا چاہتے ہیں۔ میں بہت سے دیہاتوں اور قصبوں میں گیا ہوں۔ لاکھوں لوگ ایسے ہیں جنہیں پیٹ بھر کر روٹی بھی میسر نہیں۔ کیا اسے ہی تہذیب اور تمدن کہیں گے۔ کیا یہ پاکستان بنانے کا مقصد ہے اگر پاکستان بنانے کا مقصد یہ ہے تو میں نے ایسا نہیں سوچا۔" آج کی حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کی اتنی زرخیز مٹی کا پھل غریب کے پیٹ میں نہیں جاتا۔ تحریک پاکستان کے وقت جاگیرداروں نے قائداعظم کے ان خیالات اور ان کے آئندہ کے پروگرام دیکھتے ہوئے یہ اندازہ کر لیا تھا کہ اگر پاکستان بن گیا تو قائداعظم جاگیرداری نظام کو ختم کر دیں گے۔ جس کی وجہ سے ان کی وہ زمینیں چھن جائیں گی جو انہوں نے انگریزوں کی کاسہ لسی اور درباری پن کے ذریعے وفاداری کا دم بھر کے حاصل کی تھیں۔ چنانچہ انہوں نے تحریک پاکستان کا رخ موڑنے کے لئے اسے اسلامی رنگ دے کر کفر و اسلام کی جنگ بنانے کی کوشش کی اور اسلام خطرے میں ہے کا نعرہ لگوا دیا۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے علماء کی خدمات حاصل کیں۔ جنہوں نے زمین کی حد ملکیت قائم کرنے کو غیر اسلامی قرار دینا شروع کر دیا۔ حالانکہ اسلامی نقطہ نگاہ سے زمین کا پھل بھی اسی کا حق ہے جس نے اس پر محنت کی۔ قیام پاکستان کے فوراً" بعد قائداعظم نے صاف کہہ دیا تھا کہ مذہب انسان کا ذاتی معاملہ ہے۔ ریاست مذہب کے حوالے سے کسی کی تخصیص نہیں کرے گی۔ جناح کے گرد جاگیرداروں اور ان کے حواریوں نے اپنا جال بن رکھا تھا۔ خود جناح کہتے تھے کہ میری جیب میں کھوٹے سکے ہیں۔ وہ اپنی پیرانہ سالی اور گرتی ہوئی صحت کی وجہ سے اس محاذ پر کام نہ کر سکے

اور ا ن وقت موت ی وجہ سے ائندہ أنے والے وقت لیرداری نظام کو پر
پھلنے پھولنے کا موقع مل گیا۔

ماتی نظام میں کسان مزار محنت کش ہاری بڑے زمیندارو ر
کے قبضے میں ہیں۔ ان کے غلام ہیں۔ ان کے بچے اور خاندان بھی اس غلامی کے چنگل
سے نہیں نکل سکتے۔ بڑے زمینداروں اور سرمایہ داروں وڈیروں کے بگڑے ہوئے بچے
اکثر اپنے ماتحت کام کرنے والے لوگوں کے ساتھ ظلم و زیادتیاں کرتے رہتے ہیں۔ ان
کی ہیں۔ ان کی لڑکیوں سے زبرد رہتے ہیں اور جب کبھی
ایسا ہو کہ ان کے ہا ٹھہر جائے یا بھ لبر بچہ پیدا ہو جائے تو و
مارے اپنی عزت اور جان لے خوف سے اسے ی لوڑے کرکٹ میں پھنکوا دیتی ہیں۔
جو اسی جگہ مرجاتا ہے۔

جناح کی سوچ ا ں جمہوریت کا ف نظام کا خاتمہ اور
حکومت کا قیـ مسلمانوں کی حکومت سیکولر بنیادوں پر قائ ا۔ تحریک پاکستان
کو مذہبی تحریک ثابت کرنے والوں نے یہاں اسلامی نظام حکومت قائم کرنے کی مہم
چلائے رکھی جس کی وجہ سے فرقہ وارانہ فسادات بڑھتے رہے او مسجدیں بھی محفوظ نہ
رہیں۔ جناح نے تو کبھی نظریہ پاکستان کی بات بھی نہیں ک نظریہ پاکستان کی
اصطا ب سے 196ء ی ن بنے۔ سال بعد قومی اسمبلی میں
استعمال ی ئی۔ قرار داد لاہو یک پاکستان کی بنیادی دستاویز سمجھی جاتی ہے۔ اس
میں لفظ اسلام کا ذکر تک نہیں ۔ناح ہ کہتے کہ ہم اسلامی نظام قائم کرنے کے لئے
پاکستان بنانا چاہتے ہیں۔ تو یہ مسئلہ اٹھ تاکہ کس فرقے کی فقہ نافذ ہوگی۔
کس کے مسلک پر عمل ہوگا۔ شیعہ، سنی، ث، بریلو یبندی، پھر آگے
شیعوں کے کئی مسلک یوں یہ کر ا م نہ ہوتی او روئی جھگڑ
الجھ کر رہ جاتی۔ جناح ل کی با۔ ں۔
تمنا ہے کہ ہماری قوم اپنی روح قی، تمدنی، اقتصاد ترقی اور

سیاسی زندگی کو اپنے ڈھب سے ترتیب دیا اور اس کے لئے وہ طریقہ اختیار کرے جو
اس کے [illegible] تر ہو۔ انہوں نے

"The [illegible]titution ai [illegible]overn
vill be wh[illegible] the people will
decide."

اگست 1947ء کو پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی میں انہوں [illegible] تقریر کی
یں کہیں اسلامی آئین کا تذکرہ نہیں تھا۔ تمام شہریوں کے مساوی حقوق اور ترقی
یکساں مواقع فراہ[illegible] کا وعدہ لیا لیا اور یہ بھی کہا کہ پاکستان میں ہندو اور مسلمان
سیاسی نقطہ نگاہ سے [illegible] قوم کے افراد کے برابر کا درجہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے کہا

"You wi[illegible]d in the course [illegible]ne Hindus would cease
be Hindus and Muslims would cease to be Muslims, not
the [illegible]ous [illegible] as that is the personal faith
each [illegible]dividu[illegible]'n the palitical sense as
zens o[illegible] state."

اس تقریر [illegible] کو انسان کا ذاتی معاملہ قرار دیا گیا۔ جناح نے پاکستان کی پہلی
[illegible]از اسمبلی [illegible]رت ایک غیر مسلم جوگندر ناتھ مینڈل سے کروائی۔ انہوں نے
[illegible]دہ میں، ما[illegible] نمائندگی کے لئے سر ظفر اللہ خاں کو بھیجا جو کہ احمدیہ تھے۔

جنا[illegible]ی صلاحیتیں مسلم [illegible] ایک قوم ثابت کرنے میں صرف کیں اور یہی
مقدمہ انگریز کے سامنے پیش کیا۔ وہ یہ ثابت کر[illegible]ہے کہ تمدنی، معاشرتی، تہذیبی،
سیاسی، تاریخی اور مذہبی حوالوں سے مسلمان ایک الگ قوم کا درجہ رکھتے [illegible]ں
نے مسلم قومیت کے تصور کو اجاگر کیا۔ جواہر لال نہرو یونیورسٹی دہلی کی ایک پر[illegible]نے
ریڈیو میں کہا کہ قا[illegible] کا مسلمانوں کے لئے علیحدہ وطن کا مطالبہ اور اس کے
لئے اسلام اور قو[illegible] تصور سب کچھ سوچی سمجھی سکیم [illegible]وں نے سوال کیا کہ

قرار داد پاکستان 1940ء میں پاس ہوئی تو اس کے بعد 1947ء تک کے سات سالوں میں ہی جناح صاحب کو اسلام اور مسلم قومیت یاد آگئی۔ اس سے پہلے ان کے دل میں ایسا خیال کیوں نہ آیا جبکہ وہ ایک لمبے عرصے تک کانگرس سے وابستہ رہے اور کانگرس کو ہندو مسلم اتحاد کا واحد ذریعہ سمجھتے رہے۔

قائداعظم پاکستان کو ایک سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے۔ جسٹس منیر نے علامہ اقبال کے فرزند جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال کی کتاب کا ایک اقتباس پیش کیا ہے جس میں انہوں نے لکھا

"The spiritual and temporal obligations are not only connected with each other but it is in combant on every Muslim to constantly endeavour to realize the spiritual values while performing the temporal obligations, hence, secularism is an integral part of Islam and it is for this reason that the Islamic state assimilates the qualities of an ideal secular state."

جمہوریت کے قیام کیلئے جناح صاحب کی کوششوں پر بھی پانی پھر گیا اور مختلف وقتوں میں فوجی حکومتیں اور آمر جمہوریت پر شب خون مارتے رہے۔ یحییٰ خان اور ضیاء الحق فوجی حکمرانی کی سیاہ تاریخ بن گئے اور جمہوری اداروں کو تباہ کرنے میں انہوں نے کوئی کسر نہ چھوڑی۔ جناح کی اس خواہش کا تانا بانا بکھرتا رہا۔

"پاکستان کی منتخب حکومت ایک سویلین حکومت ہوگی اور کوئی شخص جو جمہوری اصولوں کے خلاف سوچتا ہے اسے اپنے لئے پاکستان کا انتخاب نہیں کرنا چاہئے۔" ایک اجتماع میں قائداعظم کے حق میں شہنشاہ پاکستان کا نعرہ لگ گیا۔ تو تقریب کو روکتے ہوئے یہ بات کہی گئی کہ یاد رکھو پاکستان میں کوئی بادشاہت نہیں ہوگی۔

پاکستان کے عوام کے صبر' استقامت اور جمہوریت کے لئے ان کی گرانقدر خدمات

کی بدولت آج پارلیمنٹ جمہوری ، عدلیہ سب موجود ہیں۔ رلیمنٹ اندر جاگیرداروں کے کنٹرول کے خاتمے تک جمہوریت کو پاکستان میں خطرات لاحق رہیں گے۔

گاندھی اور جناح کی تربیت الگ الگ ماحول میں ہوئی۔ ان کی سیاسی تربیت کا دائرہ منظر بھی مختلف تھا۔ قومی کے حل کے لئے ان کے نقطہ نظر میں بھی اختلافات رہے۔ لیکن دونوں میں قدر مشترک انسان دوستی اور سوچ اور فکر میں وسعت خیال تھی۔ دونوں میں قائدانہ صلاحیتیں تھیں اور ان کا vision اور پھیلا ہوا تھا۔ دونوں ایماندار لیڈر ہونے کے درجے پر فائز تھے۔

دونوں لیڈروں نے انگریزوں سے ہندوستان کی سرزمین کو آزادی دلانے کیلئے اہم کردار ادا کیا۔

گاندھی اور جناح انگریز کے بنائے ہوئے فرسودہ نظا کو بدلنے کی بات کرتے رہے۔ دونوں لیڈر ایسے جمہوری نظام کی تشکیل کی رکھتے تھے جس میں عوام کی زیادہ سے زیادہ شرکت ہو۔ اس کے لئے اختیارات کی نچلی سطح م کو منتقلی تھی۔ ڈاکٹر مبشر حسن نے انگریز کے بنائے ہوئے اس ریاستی ڈھانچے کا بہت اچھا تجزیہ کیا ہے۔ "انگریز نے یہ نظام عوام کو اپنے شکنجے میں مضبوطی سے جکڑے رکھنے کے لئے تشکیل دیا تھا۔ ریاستی نظام کے تمام کل پرزے اس طرح بنائے گئے تھے کہ کسی کو نے کی جرات نہ ہو۔ انگریز نے تنخواہ دار ملازمین کا ایک طبقہ بنایا تھا جس کے ذریعے وہ حکومت کرتا تھا۔ سول حکومت کا سربراہ جنرل تھا اور فوج کا سربراہ کمانڈر انچیف۔ کمانڈر انچیف گورنر جنرل کے ماتحت نہیں تھا۔ البتہ سول معاملات میں کمانڈر انچیف کو جنرل کی ایگزیکٹیو کونسل کا ممبر دفاع بنایا گیا تھا۔ یوں مل کر اور الگ الگ بھی دونوں برطانوی حکومت کے ماتحت رہے۔ ضلع کا انتظامی اور سیاسی سربراہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور ڈپٹی کمشنر کو بنایا۔ پولیس اس کے ماتحت کر دی۔ ڈ اور فوجی کمانڈر کے آپس میں تعلقات کے لئے کچھ قانون نافذ کئے۔ مختلف سطحوں پر جو

ادارے بنائے گئے ان کو اقتدار سے محروم رکھا گیا۔ ان اداروں کو ڈپٹی کمشنر، کمشنر اور گورنر جنرل کے ماتحت رکھا۔ ان سرکاری افسروں کو یہ اختیارات دئے کہ وہ جب چاہیں ان اداروں کے فیصلوں کو رد کردیں۔ یہ ایک ایسا تضاد تھا جو آئی اور قانونی ڈھانچہ میں افسر شاہی اور ہندوستانی رعایا کے درمیان تعمیر کیا گیا تھا۔ افسری اور ماتحتی کا رشتہ یہیں سے وجود میں آیا۔ ملک کو ضلعوں میں تقسیم کر کے ڈپٹی کمشنر کو ضلع کا سربراہ بنا کر مختار کل بنا دیا اور اسے وسیع فوجداری، دیوانی اور ترقیاتی کاموں کے جملہ اختیارات دے دئے۔ ضلع کا ہر ادارہ خواہ وہ منتخب ہو یا عدلیہ سے متعلق ہو سماجی ہو یا کوئی اور اہم شعبہ سب کی سرپرستی ڈپٹی کمشنر کے ذمہ تھی۔ اس کے علاوہ تحصیلدار، مال افسر، کلکٹر، ایس۔ ایچ۔ او، سپرنٹنڈنٹ پولیس، مجسٹریٹ کے وسیع اختیارات بھی انگریز نے بنائے تھے۔

یہ فوجی اور افسر شاہی کی عوام الناس پر گرفت تھی۔ جو اس طرح قائم کی گئی کہ انگریز آسانی کے ساتھ ان افسروں کو ہدایات اور احکامات دے سکے۔ تاکہ وہ عوام پر موثر طریقے سے قابل عمل ہو جائیں۔ انگریز ان افسروں کے لاؤ لشکر پر حاکم تھا اور یہ افسر عوام پر حکومت کرتے تھے"

آزادی کے بعد سے دونوں ملکوں کی حکومتوں نے اس نظام سے چھٹکارا حاصل نہیں کیا۔ بھارت اور پاکستان دونوں ملکوں میں بیوریو کریسی اور اسٹیبلشمنٹ کا راج ہے۔ حکومتی پالیسیاں انہیں کے ذریعے کنٹرول ہوتی ہیں۔ پاکستان کے حوالے سے دیکھیں تو فوجی بیوریو کریسی کا غالب اثر رسوخ نظر آئے گا۔ حاکم اور محکوم کا رشتہ جیسا آزادی سے پہلے تھا ویسا ہی اب ہے۔ بیوریو کریسی کا نظام اوپر سے نیچے تک اپنا جال بچھائے ہوئے ہے۔ مجھے یقین ہے گاندھی اور جناح دیر تک زندہ رہتے تو پاک بھارت حکومتیں انگریز کے اس فرسودہ نظام حکومت سے چھٹکارہ پانے کی طرف قابل قدر پیش رفت کر چکی ہوتیں اور عوام کی اقتدار میں شراکت اور اقتصادی خوشحالی کا خواب کافی حد تک شرمندۂ تعبیر ہو چکا ہوتا اور وہ اپنے وسائل کو آپس کی جنگوں میں ضائع کرنے کی بجائے

عوام پر صرف کر رہے ہوتے۔

پاکستان اور بھارت کے عوام کو اب یہ ذمہ داری سنبھالنی ہے کہ وہ 21 ویں صدی میں داخل ہوتے ہوئے ان دو عظیم لیڈروں کے افکار و عمل کے اندر قیادت کے اس جوہر کو تلاش کریں جو نئی روشنی اور نئی زندگی کی طرف لے جانے والا تھا۔

آج بھارت میں گاندھی کی تعلیمات کو بھلا دیا گیا ہے۔ اور پاکستان میں جناح کے نظریات پر توجہ نہیں دی گئی۔ ان دونوں لیڈروں نے افہام و تفہیم اور باہمی بقائے امن کے لئے اپنی اپنی بہترین کوششیں کیں۔

یہ دیکھنا ابھی باقی ہے کہ آج کا پاکستان اور آج کا بھارت گاندھی اور جناح کی اس خواہش کو عملی جامہ پہنا سکتا ہے!!

"بھارت اور پاکستان کی حکومتوں اور شہریوں کو پارٹیشن کی تلخیوں کو بھلا کر انسانی رشتوں کی تاریخ کا نیا باب رقم کرنا ہوگا اور پر امن بقائے باہمی کے اصولوں کی روشنی میں نئی زندگی ڈھونڈنا ہوگی"

آئی کے گجرال سے مکالمہ

بھارت کے وزیراعظم آئی کے گجرال پاکستان کے شہر جہلم میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ایف سی کالج سے بی۔ اے کیا۔ انہیں ادب خاص شغف ہے۔ ار دل لیتے ہیں۔ لاہور میں کیمونسٹ سوویت ورکر کی حیثیت سے انہ کا آغاز کیا اور کیمونسٹ پارٹی آف انڈیا ۔ ولیت اختیار کی م کے بعد پہلے جالندھر اور پھر دہلی منتقل ہو گئے۔ 1940ء میں آزا میں ان کے تمام اہل خانہ کو جیل جانا پڑا۔ ان کے والد لالہ اوتار نارائن گجرال ہندو لیڈروں میں شامل تھے۔ جنہوں نے قیا راد پاکستان پر دستخط کئے تھے۔ کے بعد وہ قانون ساز اسمبلی کے رکن ۔ کانگریس کے ایک رہنما تھے۔ جہلم میں اجتماعی جلوسوں کی قیادت وہی کیا کرتے تھے۔ اور پولیس کی لاٹھیاں بھی انہی کے ں زیادہ آتی تھیں۔ وہ ن دان تھے۔ کھدر کا لباس پہنتے تھے۔ بقول ب بعفر الہ اوتار ا پے گھر کے اندر ہندو ہوں تو ہوا گ کے باہر مسلمان نارے مکان بھی بنوایا تو ایسی جگہ ب میں سارا محلہ مسلمانوں کا تھا اور سا محلے ملاحاں کی مسجد کی اذان سیدھی ان کے گھر میں گونجتی تھی۔

نومبر 1996ء کو نئے دہلی میں منعقد ہونے والے اورین ٹیشن ک میں شرکت ی دعوت ینار کا موضوع تھا۔ "جنوبی ایشیا میں ترقی کے مو ئزہ" اس میں سری لن یش' نیپا سے مندو شرکت کی۔ صبح کے آندھرا پردیش' لشن کانت (مو:) اور شام کے ا میں ان کے بارے میں اظہار خیال کیا ان دونوں ا میں میں نے بھ کیا۔ میں نے لاہور سے چھپنے والی دو کتابیں مولا اور گاندھی کی خ کے گجرا نے میں دیں جس پر انہوں نے شکریہ ادا کیا۔

میں نے اپنے اظہار خیال میں کیمپ میں ش دعوت پر اپنے میزبان جناب ستیا پال کا شکریہ ادا کیا۔ ایک موقع پر میں نے گجرال کو مخاطب کرتے ہو

کہ ہمیں خوشی ہے کہ آپ پاکستان کے شہر گجرات سے تعلق رکھتے ہیں اور آپ نے گورنمنٹ کالج لاہور سے تعلیم حاصل کی۔ اس پر گجرال نے وضاحت کی کہ وہ گورنمنٹ کالج لاہور سے نہیں پڑھے بلکہ انہوں نے ایف سی کالج لاہور سے بی۔ اے کیا۔

میں نے کہا "ایسی تنظیمیں جو جنوبی ایشیاء کے ملکوں کے درمیان عوامی رابطوں کو بڑھانے اور اس خطے میں بسنے والے کروڑوں عوام کو قریب تر لانے اور ان کے مسائل حل کرنے کے لئے مشترکہ کوششیں کرنے کے لئے کام کررہی ہیں۔ انہیں عوامی رابطوں کو بڑھانے کیلئے ہر سطح پر تعاون کی فضاء پیدا کرنے کی کوشش تیز تر کرنی چاہئے تاکہ ہم جنوبی ایشیاء کے ممالک جو ترقی میں بہت پیچھے رہ گئے ہیں اپنی رفتار کو آگے بڑھا سکیں اور ان مسائل کو حل کرنے میں مدد دے سکیں جو ہماری ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ جنوبی ایشیاء کے سات ممالک مشترکہ ثقافتی ورثہ اور تاریخ کی ہم آہنگی رکھتے ہیں۔ ان ممالک کو غربت بیروزگاری' مہنگائی' کرپشن' جہالت' ماحولیاتی آلودگی اور صحت کے مسائل نے جکڑ رکھا ہے۔ ہم باہم مربوط ہو کر اور مشترکہ جدوجہد سے ہی ان پر قابو پا سکتے ہیں۔ ہمیں سائنس' تعلیم' ٹیکنالوجی اور معاشرتی بہبود کے شعبوں میں ایک دوسرے سے تعاون کرنا اور تجربات سے فائدہ اٹھانا ہوگا۔ پاکستان کے عوام کی خواہش ہے کہ وہ جنوبی ایشیا کے عوام سے قریبی روابط رکھیں اور انہیں آگے بڑھائیں۔ ہماری موجودہ جمہوری حکومت نے اس سلسلے میں عوامی رابطوں پر کوئی پابندی نہیں لگائی۔ ہم جنوبی ایشیا کے عوام کے ساتھ قدم بہ قدم چلنا چاہتے ہیں۔ پاکستانی عوام جنوبی ایشیا میں امن بھائی چارے اور خوشحالی کے لئے اپنا بھرپور کردار ادا کرنا چاہتے ہیں۔

ہمارے عوام اس خطے میں پر امن بقائے باہمی کے اصولوں کو پسند کرتے ہیں۔ ہم جمہوریت پسند ہیں اور انسان دوستی کے اصولوں کو قائم رکھنے اور ان پر عمل کرنے پر یقین رکھتے ہیں۔ ہم انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں پر اپنا اصولی اختلاف رکھتے ہیں خواہ

یہ خلاف ورزیاں دنیا کے کسی خطے میں ہوں۔"

آئی کے گجرال نے اپنی تقریر میں پاک بھارت تجارت اور دیگر سارک ممالک کے ساتھ بھارت کے تجارتی و سیاسی روابط کا ذکر کیا۔ پاک بھارت سیاسی کشیدگی کے پس منظر میں ان کی بعض باتیں اہم تھیں جو گجرال ڈاکٹرین کے حوالے سے کہی گئیں۔ جن سے بھارت کی خارجہ پالیسی کے نئے رخ اور زاویئے بھی نظر آئے۔ گجرال نے کہا "سارک کے وہ ملک جو کبھی بھارت کا حصہ تھے آج نہیں ہیں آج وہ سات خود مختار آزاد ملک ہیں۔ ہم کسی بھی حالت میں یہ نہیں چاہیں گے کہ جو کچھ 1947ء میں ہوا اسے منسوخ کر دیا جائے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ساتوں کے ساتوں ممالک اپنی آزادی اور خود مختاری کو برقرار رکھیں۔ لیکن یہ تمام ممالک غیر ضروری طور پر ایک دوسرے کے دشمن یا مخالف نہیں بننے چاہئیں۔

سرد جنگ کے خاتمے کے بعد ہر طرف باہمی تعاون اور اقتصادی اشتراک عمل کی آواز بلکہ پکار اٹھ رہی ہے۔ اس پورے خطے میں تعاون کو بڑھاوا دینا ہماری پالیسی کا حصہ ہے۔ پاکستان سالانہ 200 کروڑ روپے کا مال دوبئی یا ہانگ کانگ سے منگواتا ہے۔ نقصان کس کا ہو رہا ہے۔ حکومت ٹیکسوں میں نقصان میں رہتی ہے اور خریدار کو بھی زیادہ قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔ گذشتہ سال ہم دونوں ممالک نے ہوشمندی سے کام لیا۔ پاکستان نے بھارت سے چالیس ہزار ٹن چینی خریدی۔ اس سے پیشتر پاکستان یہ چینی ساؤتھ امریکہ یا کیوبا سے خریدتا تھا۔ جبکہ ہمارے ملک کی چینی سستی ہے۔ اس سال پاکستان ایک لاکھ بیس ہزار ٹن چینی ہم سے خرید رہا ہے۔ بدقسمتی سے اس سال پاکستان میں گندم کی فصل اچھی نہیں ہوئی اس لئے وہ دو یا ڈھائی لاکھ ٹن گندم بھارت سے خریدے گا۔ یہ ضرورت تھی۔ سو ٹھیک ہے۔ اس میں کوئی سیاست نہیں۔ پاکستان کی حکومت کی طرف سے پیغام ملا کہ یہ گندم واہگہ بارڈر سے بھیجیں۔ کیونکہ اس کی ضرورت لاہور میں ہے اور کراچی کے راستے آنے میں زیادہ خرچہ ہے میں نے کہا ٹھیک ہے۔ اصل میں نہ ہم غلط ہیں نہ پاکستان بلکہ معاشیات کے اصولوں کو غلط طریقے

سے استعمال کیا جاتا ہے یا انہیں سمجھا نہیں جاتا۔ ہمیں معاشیات کے اصول کو سمجھ کر آگے بڑھنا ہوگا۔ معاشیات کے قانون کو اپنا کام کرنے دینا چاہئے۔

سارک ممالک کی معاشیات آپس میں تعاون سے ہی سدھر سکتی ہے۔ ساتوں کے ساتوں ممالک آپس کے تعلقات کو فروغ دیں۔ آپس میں ہر سطح پر تعاون کو آگے بڑھائیں۔ ہم کیا کر رہے ہیں پچھلے سال ملائیشیا کے سابق وزیر خارجہ نے مجھے ایک سیمینار میں شرکت کیلئے راولپنڈی بلایا۔ اس نے کہا ہم ایشیائی ممالک شاید اپنے تمام مسائل حل نہ کر سکیں۔ لیکن ایک سادہ سا اصول اپنایا ہے کہ اگر ہم نجی سطح پر اختلافات رکھیں تو پبلک میں ایسا تاثر نہ دیں بلکہ ایک دوسرے سے تعاون کریں۔ ہم کیا کر رہے ہیں ہم اس کے الٹ کام کرتے ہیں۔ یعنی ہم نجی اجلاسوں میں ایک دوسرے سے اتفاق کرتے ہیں لیکن جب پبلک میں جاتے ہیں تو ایک دوسرے کے دشمن کا روپ دھار لیتے ہیں۔ یہ سارک Mantality ہے۔ خاص طور پر اس طرح کی صورت حال پاک بھارت تعلقات میں دیکھنے میں آتی ہے۔

ہمسایہ ممالک کے ساتھ تعلقات کی بہتری ہماری اولین ترجیح ہے۔ خاص طور پر پاکستان کے ساتھ۔ آپ نے دیکھا ہوگا گذشتہ چھ ماہ کے دوران ہم نے پاکستان کے خلاف کوئی بیان نہیں دیا۔ بعض اوقات میری مخالفت بھی کی جاتی ہے۔ بے نظیر نے اقوام متحدہ میں ہمارے خلاف بے حد تندو تیز لہجے میں بات کی تھی لیکن میں نے اپنے اظہار خیال میں ایک لفظ بھی نہیں کہا۔

ہمارے ایک اخبار Pioneer نے تو اداریہ لکھ دیا۔ اس نے مجھے سخت سست اور نالائق کہا۔ اس نے لکھا۔ ”تم بھارت کے وزیر خارجہ ہو یا پاکستان کے۔ وہ تمہارے منہ پر تھپڑ مار رہے ہیں اور تم دوسرا گال بھی آگے کرتے جا رہے ہو۔ تمہیں عزت نفس کا پاس نہیں۔“

لیکن بنیادی اصول جو ہم نے اپنایا وہ نہ صرف پاکستان بلکہ اپنے تمام ہمسایہ ملکوں کے لئے ہے یعنی سب سے تعاون اور سمجھوتہ کر کے چلنا۔

بعض اوقات Provocation ہوتی ہے۔ ذاتی طور پر بے نظیر بھٹو میری بہترین دوست ہیں۔ ہمارے ایک دوسرے کے ہاں آنے جانے کے روابط ہیں۔ جب وہ بھارت آتی ہیں تو میرے گھر ٹھہرتی ہیں۔ جب میں پاکستان جاتا ہوں تو ان کے ہاں ٹھہرتا ہوں۔ ذاتی زندگی میں ہم ایک دوسرے سے مسلسل رابطہ رکھتے ہیں۔ میرا اپنا فلسفہ ہے جو ان اصولوں پر مبنی ہے۔

(1) اپنے ہمسایہ ملکوں کے ساتھ تعلقات کو بہتر رکھو۔ ہم ایک بڑا ملک ہیں۔ ہماری معیشت وسیع ہے۔ ہمیں اپنے ہمسایوں کی نسبت زیادہ فراخدلی دکھانا ہوگی۔ زیادہ برداشت پیدا کرنا ہوگی۔

(2) کسی بھی حالت میں ہندوستان کی افواج اپنے ہمسایہ ملکوں کے خلاف استعمال نہیں ہوں گی۔ میں فوج کو طاقت نہیں سمجھتا۔ جب میں طاقت کی بات کرتا ہوں تو اس سے میری مراد فوجی طاقت نہیں ہوتی۔ آج کے دور میں فوج طاقت نہیں ہوتی۔ طاقت معیشت ہوتی ہے اور میں اسی طاقت کا ذکر کر رہا ہوتا ہوں۔ ہم کبھی بھی اپنے ملک سے کسی ہمسایہ ملک میں فوج کے ذریعے یا تخریب کار بھیج کر انتشار پیدا کرنے کی کوشش نہیں کریں گے۔

یہ بنیادی اصول ہیں جن کی بنا پر ہم اچھی ہمسائیگی کو فروغ دے سکتے ہیں۔ آج کی دنیا میں ہمسائے کے مفہوم بدل گئے ہیں۔ ان میں وسعت اور ہمہ گیریت آگئی ہے۔ ہمارا معاشی تعاون یا تجارت کا فروغ ایسا نہیں ہوگا جس سے اس کے کسی ہمسایہ ملک کی معیشت یا تجارت کو نقصان پہنچے۔ میں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ فلاں مال کی خرید بھارت سے ہی کرو۔ نہیں۔ جہاں آپ کو بہتر اور سہولت کی سرمایہ کاری کے حالات نظر آئیں وہاں رجوع کرو۔ خواہ بنگلہ دیش ہو پاکستان ہو سری لنکا ہو۔

دو چیزیں اہم ہیں۔

آپس کے اختلافات ختم کرو۔ مخالفت دشمنی چپقلش ختم کرو۔ ذہنی کھچاؤ بری چیز ہے۔ بداعتمادی رہے تو مسائل حل نہیں ہوں گے۔

گذشتہ 50 سالوں میں ہم نے کیا کیا۔ ہم نے اپنے سرمائے اور معیشت کا بڑا حصہ اسلحہ جمع کرنے اور فوجوں کو بڑھانے میں جھونک دیا۔ ہمارا ملک تو پھر بھی خوش قسمت ہے کہ یہاں کبھی فوجوں نے ڈیرے نہیں جمائے۔ لیکن ہمسایہ ملکوں میں فوجوں نے مداخلت کی۔ سول حکومتوں کا راستہ روکا۔ آمریت قائم کی۔"

ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا افغانستان کا بحران ہمسایہ ملکوں کیلئے بے چینی کا باعث ہے۔ ہندوستان نے اس میں عدم مداخلت کی پالیسی اپنائی ہے۔ جبکہ پاکستان افغانستان میں مداخلت کرتا آیا ہے۔ آج پاکستان میں لاکھوں مہاجرین ڈیرے جمائے بیٹھے ہیں۔ صوبہ سرحد کی ٹرانسپورٹ پر ان کا قبضہ ہے۔ افغانستان سے اسلحہ اور منشیات سمگل ہو کر پاکستان بھارت اور دوسرے ممالک میں جا رہی ہیں۔ ہم افغانستان میں استحکام چاہتے ہیں۔ اگر کبھی افغانستان نے ہم سے مدد طلب کی تو ہم اسے مالی امداد دیں گے۔ لیکن اسلحہ خریدنے کے لئے نہیں بلکہ ملکی ترقی اور معیشت کی بحالی کے لئے۔

آئی۔ کے گجرال کی اس تقریر میں تضاد بھی نظر آتا ہے۔ وہ ہمسایہ ملک افغانستان کو تو مشورہ دیتے ہیں کہ وہ اسلحہ کی خرید کیلئے مالی امداد طلب نہ کرے۔ لیکن خود ان کا اپنا ملک دنیا کا سب سے بڑا اسلحہ کا خریدار ہے۔ آئی۔ کے گجرال نے پڑوسی ملکوں سے بہتر تعلقات قائم کرنے اور جنوبی ایشیاء میں امن کیلئے کوششوں کو آگے بڑھانے میں مقبولیت اور شہرت حاصل کی۔ انہیں پاکستان کے ساتھ امن مذاکرات شروع کرنے کے لئے بہترین وزیراعظم تصور کیا گیا۔ تاہم ان کی اپنی حیثیت ایک کمزور وزیراعظم کی رہی۔ جو 14 پارٹیوں کی مخلوط حکومت چلاتے رہے۔ ان پر جب اسٹیبلشمنٹ' بیوریوکریسی فوج اور ہندو قوم پرستوں کا دباؤ بڑھتا تو وہ ڈپلومیسی سے اپنا بیان بدل بھی لیتے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ گجرال کی شخصیت سفارتکاری میں مہارت اور پاکستان کے ساتھ ان کے کسی حد تک جذباتی لگاؤ کی وجہ سے ان کے دور

اقتدار میں پاک بھارت تعلقات میں بہتری دیکھنے میں آئی۔ انہیں بنگلہ دیش' سری لنکا' چین اور دیگر ہمسایہ ممالک کے ساتھ اختلافات کم کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی۔

گجرال نے بھارت کے دانشوروں اور کڑ قوم پرستوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ پاکستان ایک حقیقت ہے۔ وہ خود مختار اور آزاد رہے گا۔ پاکستان اور بھارت اب دوبارہ ایک ملک نہیں بن سکتے۔ ان کے بارڈر ختم نہیں ہو سکتے۔

اس فکر اور احساس نے اہل پاکستان میں اعتماد کو بڑھایا اور ایک دوسرے کو قریب ہو کر سننے اور سمجھنے کا شوق پیدا ہو گیا۔

دہلی میں بھارتی دانشوروں کے ساتھ گفت و شنید میں میں نے محسوس کیا کہ بھارتی دانشور اور دیگر حلقے پاکستان کی خود مختاری کا ذکر اب زور دے کر کرنے لگے ہیں۔ سوچ کی اس تبدیلی میں گجرال نے اہم کردار ادا کیا۔ انہوں نے ایک بیان میں کہا تھا۔ "تاریخ کا رخ مڑ چکا ہے اب دونوں ملک ایک نہیں ہو سکتے۔" پاکستان کے وزیراعظم نواز شریف بھارت کے عوام میں مقبول ہوئے۔ آئی۔ کے گجرال کو پاکستانی عوام میں مقبولیت حاصل ہوئی۔ ایک بھارتی دوست نے کہا ہم نے آپ کو ایک وزیراعظم دیا (نواز شریف بھارت کے شہر امرتسر میں پیدا ہوئے) آپ نے ہمیں ایک وزیراعظم دیا (گجرال پاکستان کے شہر جہلم میں پیدا ہوئے)

مسئلہ کشمیر کو حل کرنے کیلئے انہی کے دور میں خارجہ سطح پر مذاکرات کے دور کا آغاز ہوا۔ بھارت نے گجرال جیسا ذہین معاملہ فہم سفاتکاری میں ماہر اور ادبی ذوق رکھنے والا وزیراعظم کھو دیا ہے۔

امیر جماعت اسلامی

ہند سے مذاکرات

جماعت اسلامی کی بڑی اور خوبصورت جیپ ہمارے وفد کو لینے کیلئے لا جپت بھون کے گیسٹ ہاؤس میں پہنچ گئی تھی۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ بھارت میں بھی پاکستان کی طرح جماعت اسلامی خاصی امیر ہے۔

ابو الفضل انکلیو جامع نگر میں امیر جماعت اسلامی ہند محمد سراج الحسن اور ان کے بہت سے رفقاء عہدیدار گیٹ پر ہمارے استقبال کیلئے موجود تھے۔ ہم سب ایک دوسرے سے بڑی گرمجوشی کے ساتھ بغل گیر ہوئے۔ ہمیں ایک بڑے ہال کمرے میں بٹھایا گیا جہاں ہمیں پر تکلف چائے پیش کی گئی۔ جماعت اسلامی کا یہ مرکزی دفتر ایک بڑی اور کشادہ عمارت پر مشتمل ہے۔ جہاں بڑے بڑے کمرے' ہال' کانفرنس روم' لائبریری اور ریڈنگ روم ہے۔ عمارت کے باہر ایک بڑا لان ہے جہاں خوش نما پھول' پودے اور درخت اس جگہ کی خوبصورتی میں اضافہ کر رہے ہیں۔ گارڈن کے ساتھ ہی ذرا فاصلے پر ایک خوبصورت مسجد ہے۔ ہم سب نے مغرب کی نماز وہاں ادا کی جبکہ ہمارے ہندو دوست کمرے کے اندر ہی بیٹھے رہے۔ سراج الحسن صاحب کی امامت میں نماز کی ادائیگی کے بعد ہم کانفرنس روم میں واپس آگئے۔

جماعت اسلامی کے شرکاء کا ہم سے تعارف کرایا گیا۔ ان میں جماعت کے سیکرٹری جنرل عبدالقیوم بھی تھے۔ جن سے میرا تعارف امرتسر سیمینار میں ہوا تھا۔ اس کے بعد میں نے اپنے وفد کے تمام افراد کا تعارف کروایا۔ اس مختصر تقریب میں امیر جماعت سراج الحسن' نائب صدر اور سیکرٹری جنرل نے اظہار خیال کیا۔ پاکستانی وفد کی نمائندگی کرتے ہوئے میں نے کہا "ہم اس عزت افزائی پر آپ کا اور آپ کے رفقاء کا بے حد شکریہ ادا کرتے ہیں۔ آپ نے ہمیں یہ موقع بھی فراہم کیا کہ ہم آپ کے ساتھ مل بیٹھ کر تبادلہ خیال کر سکیں اور ایک دوسرے کا نقطہ نظر جان سکیں۔ جب امرتسر کے سیمینار میں جنرل سیکرٹری مسٹر عبدالقیوم سے میری ملاقات ہوئی اور ان کی تقریر سنی تو مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ میں جماعت اسلامی ہند کے اس فعال کردار کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں جو وہ بھارت کی سماجی تہذیبی اور سیاسی زندگی میں ادا کر رہی ہے۔ بھارت

میں 16 کروڑ مسلمانوں کے اندر مجھے لیڈر شپ کا فقدان نظر آیا ہے یہاں مسلمانوں کے اندر مرکزیت نظر نہیں آتی۔ کہیں سے ایسی آواز جو مسلمانوں کی اجتماعی قیادت کا درجہ رکھتی ہو نہ تو کسی جماعت اور نہ فرد کی صورت میں کہیں نمایاں دکھائی دیتی ہے۔

دنیا کی اس سب سے بڑی اقلیت کی نمائندگی کیلئے مضبوط اور فعال قیادت کی ضرورت ہے۔ بھارت کے مسلمانوں کو فکری' سیاسی' معاشرتی' میدانوں میں بھرپور کردار ادا کرنا چاہئے اور زندگی کے ہر میدان میں متحرک اور سرگرم نظر آنا چاہئے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ کیا اس کی وجہ مسلمانوں کے آپس کے اختلافات ہیں' بھارت کی ہندو اکثریت کا غلبہ ہے' مسلمانوں کے اندر تعلیم کا فقدان ہے یا وہ معاشی بدحالی کا شکار ہیں اور منتشر فکری نظریات رکھتے ہیں۔

وجوہات خواہ کچھ بھی ہوں ہمیں اصل زمینی حقائق کا علم یہاں پر بسنے والی جماعتیں ادارے یا افراد ہی سے ہو سکتا ہے۔

آج میں آپ سے ملاقات کرتے ہوئے اور آپ کے خیالات سننے کا موقع ملنے پر یہ سوچ رہا ہوں کہ اگر آپ سے ملاقات نہ ہوتی تو ہمارے وفد کا یہ دورہ نامکمل رہتا۔ میری نظر ایک اور پہلو کا احاطہ بھی کرتی ہے۔ کیا پاک بھارت تعلقات کی موجودہ صورت حال میں دونوں ملکوں کے اختلافات' نفرتوں اور دشمنیوں کے پل پار کرنے کے لئے جماعت اسلامی ہند کوئی کردار ادا کر سکتی ہے۔ شاید یہ سوال پچاس سالوں میں کسی نے آپ سے نہ کیا ہو۔ یہی سب سے بڑا سوال ہے جسے پوچھنے کیلئے میں حاضر ہوا ہوں۔ پاک بھارت جھگڑوں کا عرصہ پچاس سالوں پر محیط ہے اس دوران وہ تین جنگیں بھی لڑ چکے ہیں۔ دونوں ملکوں نے ایک دوسرے کو نیچا دکھانے' کمزور کرنے اور ختم کرنے کے لئے کبھی کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ انہوں نے اسلحہ کے ڈھیر لگا کر اپنی معیشت کو کنگال دیا اور عوام کو غربت کے گڑھوں میں دھکیل دیا۔ سیکیورٹی کے نام پر بجٹ کا بڑا حصہ جنگی تیاریوں میں صرف کرتے رہے۔ سائنس' تعلیم' ٹیکنالوجی' صحت' ماحولیات' معاشرتی و معاشی ترقی کے میدانوں میں وہ دنیا سے بہت پیچھے رہ گئے۔

دونوں ملکوں کی حکومتیں نک اپنے اختلافات کو پر امن ذرا ایک ٹیبل پر بیٹھ کر سکیں۔

عوام ا ہے اور امیدیں کیے رکھیں
ں بڑی ہوئی۔ اب وہ ا ششیں رہی ہیں اور دونوں ملکوں کی رائے عامہ ں اور کے ہر شعبے کے افراد نے آپس سلسلہ شروع کیا۔ یہ وقت رین ڈپلومیسی ہے۔ وہ اپنی اپنی حکومتوں کی مدد ہے ہیں۔ انہوں نے ان میں حیرت انگیز طور پر کامیابی حاصل کی اور ں رصے میں پیش رفت ہوتی طر آئی۔ کشمیر سمیت تمام مسائل پر بات چیت ہوئی۔ اور دونوں ملکوں نے ثابت کر دیا کہ وہ آپس میں جنگ نہیں چاہتے۔ وہ اس طویل سرد جنگ کا خاتمہ چاہتے ہیں۔ جس میں دونوں کا نقصا ر کسی ا ندہ نہیں۔

دونوں ملکوں کے د کی ان کوششوں کے آگے رکاوٹوں کے پہاڑ ہیں۔ بیوریوکریسی جو حکومتی پالیسیوں کو کنٹرول کرتی ہے۔ اسٹیبلشمنٹ جس کے اندر حکومتی نظام کے کل پرزے بند ہیں۔ پھر دونوں ملکوں کی انتہا پسند مذہبی جماعتیں جو بنیاد پرستی کا الاؤ جلائے رکھتی ہیں۔ دونوں ملکوں کے سیاستدانوں کا عمل بھ پن کا شکار ہے۔ وہ ایک دوسرے کے خلاف بیان دینے کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں۔ ان کی بدعنوانیاں چھپی رہیں اور مسائل سے رہے۔ وہ اپنا مقصد پورا کرنے کیلئے عوام کے اندر عسکری جذبات پیدا کرتے ہیں۔ جہاد کی تلقین کرتے ہیں۔ مذہب اور نسل کی بنیاد پر نفرتیں بڑھاتے ہیں۔ اس سارے منظر نامے میں پس پردہ اسلحہ بیچنے والے ملکوں کا گھناؤنا کردار ہے۔ ان کی کوشش یہی رہتی ہے کہ دونوں ملکوں میں جنگ کے سے حالات باقی رہیں اور ہمارا اسلحہ بکتا رہے۔ دونوں ملکوں کے اسلحہ ار بھاری کمیشن حاصل کرتے ہیں۔ میں آپ لوگوں کو بتانا چاہتا ہوں کہ یہ جو 12 افراد کا وفد آپ کے سامنے موجود ہے اور اس سے پہلے ر تسر بھی گئے یہ کوئی معمولی بات

نہیں۔ ہمیں بہت سی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن ہم نے ہمت سے کام لیا کیونکہ ہم سمجھتے تھے کہ ہم آنے والی نسلوں کے لئے کام کررہے ہیں۔ ہمارے مقاصد عظیم اور انسانی بھلائی کے لئے ہیں۔

ہم نے ہر ایسی رکاوٹ کو توڑ دیا جو دونوں ملکوں کے عوام کے درمیان فاصلہ قائم رکھنے کے لئے قائم کی گئی۔ دونوں ملکوں کے ذرائع ابلاغ اور صحافیوں کی اکثریت نے پچاس سالوں میں امن کے قیام کیلئے رائے عامہ کو ہموار کرنے میں مدد نہیں کی اور کوششیں کرنے والوں کا راستہ روکتے رہے' ایک دوسرے ملک کا ایجنٹ لکھتے رہے۔ شکوک و شبہات' ابہام' بے یقینی اور خوف کی صحافت کو فروغ دیا۔ جھوٹ پر مبنی فرضی باتیں چھاپنے سے بھی اجتناب نہیں کیا گیا۔

آج دونوں ملکوں کے وزرائے اعظم کی سوچ اور فکر میں نمایاں تبدیلیوں نے صورت حال کو بہتر کرنے میں مدد کی ہے۔ دونوں رہنما مسئلہ کشمیر سمیت اپنے تمام مسائل مذاکرات کی ٹیبل پر بیٹھ کر حل کرنے کا اعادہ کر چکے ہیں۔ سیکرٹریوں کی سطح پر بات چیت کا سلسلہ بھی شروع ہو چکا ہے۔

میں بھارت کے عوام کو پاکستان کے عوام کی جانب سے آزادی کی گولڈن جوبلی پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ ہم نے دونوں ملکوں کی آزادی کی گولڈن جوبلی مشترکہ طور پر منانے کا پروگرام بنایا تھا۔ لیکن دونوں ملکوں کی بیوریوکریسی نے یہ کوششیں ناکام بنا دیں۔ تاہم ہم چند لوگ امرتسر پہنچ گئے اور بھارت کی آزادی کی تقریب میں شرکت کی اور اب ہم دہلی آئے ہیں۔

پاکستان امن پسند لوگوں کا ملک ہے۔ پاکستان کے عوام بھارت کے ساتھ امن اور دوستی کے ساتھ رہنے کے خواہش مند ہیں۔ وہ دونوں ملکوں کی طویل مخاصمت (Confrontation) سے تنگ آ چکے ہیں۔

میری بھارت کے عوام کے وسیع تر حلقوں میں شناسائی ہوئی ہے۔ میں نے بھارت کے کئی شہروں کا دورہ کیا ہے۔ ہر طبقے کے لوگوں سے تبادلۂ خیال ہوا۔ مجھے کسی بھی

جگہ یہ تاثر نہیں ملا کہ یہاں کے عوام پاکستان سے نفرت کرتے ہیں۔
میں پاکستان میں رہتا ہوں۔ ظاہر ہے مجھے اپنے وطن سے محبت ہے جو ایک فطری چیز ہے۔ پاکستان ایک آزاد اور خود مختار ملک ہے جو اقتدار اعلیٰ کا مالک ہے۔ میں سمجھتا ہوں دونوں ملکوں کے دو طرفہ تعلقات کو بہتر بنانے اور باہمی مسائل کے حل میں مدد دینے کے لئے جماعت اسلامی ہند اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔ پاکستان کی جماعت اسلامی کو بدقسمتی سے ہم اپنا نقطہ نظر سمجھانے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ ان کے لیڈر ایک ہی طرح کے عسکری نوعیت کے بیانات دیتے ہیں۔

کم و بیش یہی صورت حال بھارت میں بھی ہے۔ یہاں کے سیاستدان اور بنیاد پرست جماعتیں تعصب پھیلانے میں سرگرم رہتی ہیں۔

انتہا پسند ہندو جماعتیں پاکستان کے ساتھ تعلقات کی بہتری کی حکومتی کوششوں کو آگے نہیں بڑھنے دیتیں اور حکومت کو اپنی فکس (Fix) پوزیشن سے نکلنے میں مدد نہیں دیتیں۔ وہ دباؤ ڈالتی ہیں کہ کشمیر پر اپنی پچاس سالہ پرانی پالیسی سے ذرا بھی نہ سرکے۔

دونوں ملکوں کی حکومتوں کی ان اندرونی مجبوریوں کا احساس اور ادراک کرتے ہوئے عوام کی سطح پر ان مذاکرات کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ ہم اپنی اپنی حکومتوں کو سمجھا رہے ہیں کہ ان کے پاس راستہ صرف ایک ہے اور وہ ہے امن کا راستہ۔ جنگ سے ماؤں کی گودیں اجڑتی ہیں۔ خواہ یہ مائیں پاکستان کی ہوں یا ہندوستان کی۔

میں جماعت اسلامی ہند کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ پاکستان تشریف لائیں۔ پاکستان کی جماعت اسلامی سے بھی بات چیت کریں۔

پاکستان کے عوام سے ملاقات کریں اور دونوں ملکوں میں امن قائم کرنے کے لئے عملی کوششیں کریں۔ آپ خود ہی اس بات کا تعین کریں کہ جماعت اسلامی ہند پاکستان و بھارت میں امن قائم کرنے میں کیا کردار ادا کر سکتی ہے۔"

امیر جماعت ہند امیر الحسن' نائب صدر اور سیکرٹری جنرل نے بعد میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

"ہم پاکستانی وفد کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ آپ ایک اچھے جذبے اور نیک مقصد کے ساتھ یہاں تشریف لائے ہیں۔ انسان اور انسانیت کی بھلائی اور بقا امن اور دوستی میں ہے۔ دشمنیاں اور نفرتیں قوموں کو اندر ہی اندر سے کھوکھلا کر دیتی ہیں۔

جماعت اسلامی ہند کا کردار بہت واضح ہے۔ ہم نے بھارت کی اس وسیع و عریض سرزمین میں اسلام کی اشاعت کا بیڑہ اٹھایا ہے جس میں انسان اور انسانیت کی بھلائی موجود ہے۔ حضرت مولانا مودودی نے اپنے علم و عمل اور فکر و کردار سے جماعت اسلامی کو سینچا ہے۔ ان کی دوربینی، فہم و ادراک اور اعلیٰ بصیرت نے ہر سو علم و عرفان کے چراغ روشن کیے۔ انہوں نے مسلمانان عالم اور خصوصاً" اسلامیان ہند کی صحیح سمت رہنمائی کی اور انہیں فکری انتشار سے نکالنے کی کوشش کی۔ اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں ان کی گرانقدر خدمات کو ہمیشہ خراج عقیدت پیش کیا جاتا رہے گا۔

جماعت اسلام ہند اسی فکر کو آگے بڑھا رہی ہے۔ دین کی تبلیغ و اشاعت اور اسے گھر گھر پہنچانے کیلئے کام کررہی ہے اسلام کا پیغام انسان اور انسانیت کی بھلائی کیلئے ہے۔ اسلام ایک ایسی روشنی ہے جو دلوں کو منور کرتی ہے ہمارا مذہب زندگی کے ہر پہلو اور شعبے میں انسانوں کو رہنما اصول مہیا کرتا ہے۔ تا کہ وہ ان اصولوں پر کاربند ہو کر اپنی زندگیوں کو خداوند عالم کی منشاء اور مرضی کے تابع کر دیں۔

اسلام ایک صالح معاشرے کی تشکیل کا مکمل اور جامع پروگرام دیتا ہے۔ اسلام رنگ و نسل، ذات، قبیلہ، زبان، خاندان، قوم سب کی نفی کرتا ہے۔ اور تمام انسانوں کو برابری کا درجہ دیتا ہے۔ اللہ کے نزدیک بہتر وہ ہے جو زیادہ متقی ہے۔ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے۔ اسے اختیار کر کے انسان اس دنیا میں فلاح اور مرنے کے بعد والی زندگی میں نجات پا سکتا ہے۔ انسانوں کو جوڑنے، انکے اندر حقیقی ملاپ اور محبت پیدا کرنے اور خدا کی زمین پر پائیدار امن قائم کرنے کے لئے اسلامی تعلیمات سے رہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے۔ دین و ملت اور ملک و عوام کیلئے جماعت اسلامی ہند کی خدمات کی فہرست بہت لمبی اور دائرہ بہت وسیع ہے۔

جماعت نے اسلامی ضابطہ حیات سے متعلق ٹھوس اور وسیع لٹریچر تیار کر کے اس ملک کے عوام تک پہنچایا ہے جس سے آنے والی نسلیں بھی استفادہ کرتی رہیں گی۔

عوام کے مختلف فرقوں اور طبقات کے درمیان میل ملاپ اور بھائی چارے کو فروغ دینا اور بلا لحاظ مذہب و ملت لوگوں کی خدمت کرنا جماعت اسلامی کے پروگرام میں شامل ہے۔ قدرتی آفات اور ناگہانی حادثات سے متاثر ہونے والوں کی خدمت کیلئے جماعت کے کارکن ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ ہمارا خدمت خلق کا شعبہ سب سے زیادہ فعال اور متحرک ہے۔

فرقہ وارانہ فسادات کو روکنے کے لئے جماعت کا ریلیف ورک تو آزاد ہندوستان کی تاریخ کا ایک ریکارڈ ہے۔ اتحاد ملت کے سلسلہ میں جماعت اسلامی کی کوششوں کو ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ نظر انداز نہیں کر سکتی۔ آزادی کے فوراً" بعد سے جماعت اسلامی اس رخ پر کام کرتی رہی ہے۔ ہم نے اپنے طور پر بھی کام کئے ہیں اور دوسرے حلقوں کی جانب سے کی جانے والی کوششوں میں بھرپور حصہ لیا ہے۔ خواہ وہ مسلم مجلس مشاورت کا قیام ہو، مسلم پرسنل لاء بورڈ کی تشکیل ہو۔ مسلم یونیورسٹی کی تحریک ہو بابری مسجد کے تحفظ کا مسئلہ ہو۔ یا مسلمانوں کے حالات پر غور کرنے اور انہیں اونچا اٹھانے کے مقصد سے منعقد کئے جانے والے کنونشن ہوں۔ جماعت اسلامی ہند نے کسی مسلم تنظیم یا ادارے کے خلاف کبھی کوئی مہم نہیں چلائی۔ خواہ اس سے اسے کتنا ہی شدید اختلاف رہا ہو اور نہ اپنے خلاف چلائی جانے والی کسی مہم کا کسی ناپسندیدہ طریقے سے جواب دیا ہے۔

ہم نے خواتین میں بھی دعوت کو عام کر دیا ہے۔ ہمارا شعبہ خواتین ہندوستان کے بیشتر حصوں میں سرگرم عمل ہے۔

تحریک آزادی ہند میں جماعت اسلامی نے مسلمانان ہند کی فکری اور عملی رہنمائی کی۔ مولانا مودودی نے انگریز کی غلامی سے آزادی کے لئے مسلمانوں کے دلوں میں تازگی اور ولولہ پیدا کیا۔ تحریک پاکستان ایک غلط سمت قدم تھا۔ اس کی قیادت اسلامی فکر

اور تعلیمات سے بے بہرہ تھی۔ قائداعظم کے ساتھ گنتی کے چند علماء تھے۔ علماء کی غالب اکثریت پاکستان بننے کی مخالف تھی۔ انہیں معلوم تھا کہ پاکستان بننے سے مسلمانوں کی تقسیم ہوگی' بھارت کے مسلمان بٹ جائیں گے اور بھارت کمزور ہوگا۔ قیام پاکستان کے لئے جو تحریک چلائی گئی اس سے نفرتوں نے جنم لیا۔ لاکھوں لوگ مارے گئے۔ بے گھر ہوگئے۔ خاندانوں کے خاندان اجڑ گئے۔ عورتیں بیوہ ہوگئیں۔ بچے یتیم ہوگئے۔ لاوارث ہوگئے۔ ایک دوسرے کی بہنوں' بہوؤں' بیٹیوں کی عزتیں لوٹی گئیں۔ برصغیر کی زمین خون میں نہا گئی۔

پاکستان میں آج تک یہ غلط پروپیگنڈہ کیا جاتا رہا ہے کہ جناح صاحب کے ساتھ پاکستان بنانے کی کوششوں میں علماء ہند شامل تھے۔ یہ تاریخ کو مسخ کرنے والی بات ہے۔ جناح کے ساتھ چند ایک مٹھی بھر علماء تھے۔ علماء کی غالب اکثریت ان کی مخالف تھی۔ مولانا مودودی کا یہ خیال درست تھا کہ پاکستان بنانے کی دعوے دار قیادت اسلامی شعائر اور تعلیمات سے بے بہرہ ہے۔ اس طرح کی قیادت سے اسلامی نظام کو قائم کرنے کی توقع فضول ہے۔

پاکستان نفرت کی بنیاد پر بنا۔ بھارت نفرت کی بنیاد پر ٹوٹا۔ پاکستا بھی نفرت کی بنیاد پر ٹوٹ گیا۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی اسی نفرت کا نتیجہ ہے۔ ہم یہ بھی کہیں گے کہ بھارت مزید ٹوٹ جائے گا اگر نفرت نہ چھوڑی۔ پاکستان مزید ٹوٹ جائے گا اگر نفرت نہ چھوڑی۔ نفرتیں قوموں کو کھا کر انہیں بکھیر دیتی ہیں۔ ٹکڑے ٹکڑے کردیتی ہیں۔ پاکستان اور بھارت کی موجودہ صورت حال اسی نفرت کا نتیجہ ہے۔

پاکستان میں یہ غلط پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے کہ بھارت میں مسلمانوں کی حالت اچھی نہیں۔ انہیں شہری اور مذہبی حقوق حاصل نہیں۔ ان کے ساتھ برا سلوک کیا جاتا ہے۔ ہمیں بھارت میں کوئی مسئلہ نہیں۔ ہمارے حقوق یہاں محفوظ ہیں۔ ہم یہاں اطمینان سے رہتے ہیں۔ یہاں مسلمانوں کے اندر قیادت کا بھی کوئی بحران نہیں۔ پاکستان بھارت کے مسلمانوں سے دور ہو چکا ہے ان کے ساتھ فکری روابط نہیں رکھتا۔

ہم آپ لوگوں کے ساتھ مل کر بہت خوش ہوئے ہیں۔ آپ پاکستان میں ہماری طرف سے خیرسگالی کا پیغام پہنچا دیں۔ آپ نے پاکستان آنے کی جو دعوت دی ہے اس پر آپ کا شکریہ۔" تقاریر کے بعد ہمارے وفد کے تمام ارکان اور ہمارے ساتھ شامل بھارتی میزبان کو کتابوں کے سیٹ تحفے میں دئے گئے۔

جماعت اسلامی کے رہنماؤں کے خیالات سن کر میری امیدوں کا تانا بنا ٹوٹ گیا۔ میں قدرے مایوس ہوا۔ میں سوچ رہا تھا کہ میں جماعت اسلامی ہند کے تعاون سے پاک بھارت تعلقات میں کشیدگی کو کم کرانے کی کوششوں میں کامیاب ہو سکوں گا اور شاید برصغیر میں قیام امن کی کوششوں میں پیش رفت ہو سکے۔

برصغیر ہند کی تحریک آزادی جب زوروں پر تھی اور مسلمانان ہند دو قومی نظریہ کی بنیاد پر اپنے لئے علیحدہ ملک کا مطالبہ کر رہے تھے اس وقت اس خیال کے مخالف علماء مسلمانوں کو دوسری سمت بلا رہے تھے۔ انہیں کانگریس کے ساتھ اتحاد کر کے اپنے لئے فلاح کا راستہ تلاش کرنے کی ضرورت پر زور دیتے تھے۔ اگست 1941ء میں لاہور میں برصغیر کے ممتاز علماء اور دانشوروں کا ایک اجتماع ہوا جس میں 95 افراد شریک ہوئے۔ اسی اجتماع میں جماعت اسلامی کی تشکیل ہوئی اور مولانا مودودی اس کے امیر منتخب ہوئے۔ اس وقت برصغیر کی جنگ آزادی ایک نازک اور اہم مرحلہ میں داخل ہو چکی تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب جماعت اسلامی کی تشکیل کرنے والوں کو یہ بخوبی احساس تھا کہ ملک آزاد بھی ہو سکتا ہے اور تقسیم بھی۔

مولانا مودودی نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں جہاں مسلمانان ہند کی ذہنی اور مذہبی رہنمائی کا فریضہ انجام دینا شروع کیا وہاں قائداعظم کی قیادت اور علیحدہ وطن کے قیام کے لئے ان کی تحریک کی پر زور مخالفت شروع کی۔

انہوں نے جناح کی ذات اور شخصیت پر شدید نقطہ چینی کی۔ 1947ء میں برصغیر کی آزادی اور تقسیم کے بعد جماعت اسلامی کے افراد بھی تقسیم ہو گئے۔ آزادی کے فورا" بعد کا دور بھارتی مسلمانوں کے لئے انتہائی سخت اور صبر آزما دور تھا۔ مسلمان سہمے ہوئے

تقسیم کے ذمہ دار وہی ہیں۔ انتقال آبادی کے دوران ہونے والے فسادات
مسلمان بری طرح تھے۔ جماعت اسلامی کے افراد کے لئے فوری طور
ہونا او کی تنظیم نو کرنا مشکل کام تھا۔ تاہم اپریل 1948ء میں الہ آباد میں ایک
منعقد ہوا اور مو ث ندوی امیر جما ی ہند منتخب ہوئے۔
کے آثار پر صاو یں جماعت نے اپنے آپ کو تبلیغ دین اور
تک محدود رکھا ہے۔ تبلیغ کے ل صرف ہندوستان ہے۔
امیر جماعت ا نے اپنی تقریر میں بعض اہم نکات اٹھا۔ مشرقی
پاکستا رگی کو پاکستان کی نفرت کی پالیسی کا ہمیں اس بات
جانبداری سے ساتھ تجزیہ کرنا ا ہم نے پچھلے سالوں میں نف
سیاست کی ہے اور نفرت کی ہے۔ فرخندہ لودھی نے سچ کہا ہے کہ آزادی
بذات ب بہت بڑا رومان ہے۔ ایک حسین خو یک دلکش تصور۔ لیکن
آزادی کے پچاس برسوں میں ہم نے رت ہی کالی فرقہ
--- گروہ در گروہ ---
الیکشن میں کامیابی کے بعد مشرقی پاکستان کی اکثریتی پارٹی کے لیڈر کی حیثیت میں شیخ
مجیب کو پاکستان کی وزارت عظم ہئے تھا۔ جوان کا لیکن ان
کے ساتھ ا کے ساتھ سازش لی ئی اقتدار سے حروم رکھا
گیا۔
مغربی اور حکو یاتی طور پر بنگالی قوم کو
سمجھتے تھے اور انہیں مناسب حقوق مہیا نہیں کئے گئے۔ جس کی وجہ
اس محرومی کا شکار ہوتے رہے مشرقی پاکستان (سابقہ) میں فو کشی کی گئی۔
آج تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ مشرقی پاکستان پر فوج صوبہ کس یا
اور کیسے بنایا گیا نیز اس منصوبے کی تکمیل میں مختلف نے کیا کردار ادا
کیا۔ فوج کی ہائی رے ہو اور مختلف میں کیا فیصلے

ہوئے۔

1 جنگ کے نتیجے میں مشرقی پاکستان علیحدہ ہو کر ایک آزاد ملک بن گیا۔ اس سے پیشتر بھارت سے 1965ء تک ایک جنگ لڑی تھی۔ پنجاب کے سابق وزیر اعلیٰ اور سابق سپیکر پنجاب [illegible] کا کہنا کہ میں آج تک یہ نہیں سمجھ سکا کہ 1965ء کی جنگ کا مقصد کیا تھا اور [illegible] ذوالفقار علی بھٹو اور ایوب خان کے معتمد [illegible] اور دانشور محقق الطاف [illegible] تجزیہ ہے اگر 1965ء کی جنگ [illegible] عوام اور فوجیوں کو بروقت سنا دی جاتی تو شاید ملک [illegible] ء میں بھارتی [illegible] ہتھیار ڈالنے کی ذلت سے بچ جاتا۔ مگر 1965ء کے [illegible] اور نغمے ہماری زندگی کا حصہ بن گئے۔ فوج کے سالار اور اعلیٰ افسر اس بات پر ناز کرنے لگے کہ [illegible] نے ہر محاذ پر بھارتی فوج کو پسپا کر دیا تھا۔ [illegible] ب خان ہمت نہ [illegible] ہر کش [illegible] لمانوں کو بھارتی ظلم و [illegible] سے نجات دلا چکے ہوتے۔ اسی غلط فہمی [illegible] تی پاکستان، [illegible] اپنی فوجوں [illegible] دیا۔ ہم نے اپنے آپ کو یقین دلا [illegible] کہ [illegible] شرقی پاکستان کے [illegible] کو دیکھتے ہی دم دبا کر بھاگ جائیں گے۔

کالج کوئٹہ میں کئی برسوں کی محنت کے بعد 1965ء کی تاریخ لکھی گئی۔ اس تاریخ سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ ایک آدھ محاذ [illegible] پاکستانی افواج کو ہر محاذ [illegible] ترالڑ کا منصوبہ جلدی میں تیار کیا گیا تھا اور [illegible] ے سیاستدانوں میں سے [illegible] کسی سے اس کی [illegible] حاصل نہیں کی گئی تھی۔ منصوبہ [illegible] نے یہ [illegible] لیا تھا کہ جب پاکستانی سپاہی کشمیر میں پہنچیں گے تو عوام نعرے لگاتے [illegible] ان کی [illegible] میں اٹھ کھڑے ہوں گے [illegible] یوں کہ جب کشمیر کے مظلوم [illegible] نے غیر [illegible] فوجی دستوں کو آتے دیکھ [illegible] نے فوراً" بھارتی افسروں کو ان [illegible] ہ سے خبردار [illegible] دیا۔ الطاف گوہر کہتے ہیں [illegible] کو اس منصوبے کا علم ستمبر میں ہوا جبکہ بھارتی حکومت کو اس منصوبے کی تفصیلات جولائی میں ہو گئی تھیں۔ الطاف [illegible] پوچھتے ہیں کہ بھارتی فو[illegible] نے جب مشرقی پاکستان کی سرحدوں پر حملہ [illegible] نے مشرقی [illegible]

کیوں حملہ نہ کیا۔ یہ سوال نوشتہ دیوار ہے۔ محض یہ کہہ دینے سے کہ یحییٰ خان دن رات شراب کے نشے میں دھت رہتا تھا حکومت کی نااہلی کا جواز نہیں بن جاتا۔ امیر جماعت اسلامی پاکستان قاضی حسین احمد نے کہا کہ مشرقی پاکستان میں ہمارے کارکنوں کو ہندوؤں کے رحم و کرم پر اکیلا چھوڑ کر اور انہیں بے خبر رکھ کر فوج نے دشمن کے آگے ہتھیار ڈال دئے اور ملک توڑنے والے ذوالفقار علی بھٹو کو مغربی پاکستان کا مطلق العنان چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بنا دیا گیا۔ 1971ء کی جنگ میں ایک طرف تو پاکستانی افواج بھارت کے سامنے سپر انداز ہوئیں اور دوسری طرف عہدے تقسیم ہونے لگے۔ جنرل ٹکا خان جنہیں بنگالی مسلمان بوچڑ کہتے تھے باقی ماندہ پاکستان کے وزیر دفاع بن گئے۔ جنرل رحیم جو جیسور میں اپنی فوجوں کو بھارتی حملہ آوارں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر فرار ہوگئے تھے۔ وہ وزارت دفاع کے سیکرٹری مقرر ہوگئے۔ جنرل راؤ فرمان علی جنہوں نے دو سو بنگالی دانشوروں کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا تھا وہ ایک اہم فوجی ادارے کے سربراہ بن گئے۔ جنرل گل حسن جنہوں نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ 1971ء کی جنگ میں وہ ایک ایسے مبصر کا کردار ادا کر رہے تھے جن کی بات پر کوئی دھیان نہیں دیتا تھا' افواج پاکستان کے چیف کمانڈر بن گئے۔ الطاف گوہر کے بقول ذوالفقار علی بھٹو بھی مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے منصوبے میں یحییٰ خان کے شریک تھے۔ بے نظیر بھٹو اس کا جواب یہ دیتی ہیں کہ بھٹو مشرقی پاکستان کے المیے کے ذمہ دار نہیں۔ اگر بھٹو 1971ء میں نہ ہوتے تو باقی ماندہ پاکستان بھی مزید ٹکڑوں میں بٹ جاتا۔

نہ جانے کب تک مشرقی پاکستان میں ہماری شکست ہمارے گلے کا ہار بنی رہے گی۔ کیا آج تک ہم نے ان اسباب کا جائزہ لیا جو اس شکست کی وجہ بنے۔ اگر 1971ء کی جنگ کی صحیح تاریخ لکھی گئی ہوتی تو جنرل نیازی جنہوں نے بھارتی افواج کے آگے ہتھیار ڈالے محاسبے سے نہ بچ سکتے۔

ذوالفقار علی بھٹو نے جسٹس محمود الرحمٰن کی سربراہی میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے اسباب جاننے کیلئے ایک کمشن بنایا تھا جس کی رپورٹ آج تک شائع نہیں کی گئی

اور قوم کو اندھیرے میں رکھا گیا۔

مشرقی پاکستان کے بنگالی کیا چاہتے تھے۔ ان کے مسائل اور مجبوریاں کیا تھیں۔ وہ جنہوں نے تحریک پاکستان میں ہم سے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا' ہم سے الگ ہونے کا فیصلہ کیوں کر چکے تھے۔ بعض حلقے کہتے ہیں کہ تحقیقات کرانے کا کیا فائدہ۔ گڑے مردے کیوں اکھاڑیں۔ اس طرح بنگلہ دیش کی حکومت مطالبہ کرے گی کہ پاکستان سرکاری سطح پر بنگلہ دیش سے معافی مانگے۔ لیکن گڑے مردے اکھاڑے بغیر سچائی معلوم نہیں کی جا سکتی۔ بعض حلقوں کو ڈر ہے کہ اگر یہ معلوم ہو جائے کہ سابقہ مشرقی پاکستان میں کتنے نہتے شہری مارے گئے۔ تو اس طرح افواج پاکستان کی بدنامی ہوگی۔ اگر یہ پتہ چل جائے کہ مشرقی پاکستان کے سیاسی راہنماؤں نے بھارت سے کیسے رابطے قائم کر رکھے تھے اور بنگالی مجاہدوں نے کتنے بے گناہ مغربی پاکستانی اور بہاریوں کو گولی کا نشانہ بنایا تو بنگلہ دیش کی تحریک آزادی کی تذلیل ہوگی۔ مگر حقائق کو جھٹلانا ممکن نہیں ایک نہ ایک دن حقائق کا سامنا کرنا ہوگا۔ گڑے مردے اکھاڑنے ہوں گے۔

پاکستان اور بنگلہ دیش میں مصالحت ہو سکتی ہے کہ غلطیاں دونوں طرف سے ہوئیں۔ ان کا اعتراف کرنا ہم سب پر لازم ہے۔ اگر ہم صرف اپنے کمالات سے لطف اندوز ہوتے رہے تو ہم ان بے گناہوں کو کیا جواب دیں گے جو ان کمالات کا شکار ہوئے۔ فصل گل سے یہ پوچھنا پڑتا ہے کہ دشت میں دیوانوں پر کیا گزری۔ جب تک یہ خبر نہ آئے کہ دامن کس طرح پارہ پارہ ہوئے اور گریباں کیسے چاک ہوئے گلشن میں بہار نہیں آسکتی۔

1971ء کی جنگ کے نتیجے میں مشرقی پاکستان ہم سے جدا ہوگیا۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی میں بھارت کے کردار کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس وقت بھارت میں اندرا گاندھی برسر اقتدار تھیں۔ بھارت نے درپردہ اور اعلانیہ بنگالی لیڈروں کے ساتھ رابطے بڑھائے اور علیحدگی کی تحریک میں ہر طرح ان کی مدد کی۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی پر اندرا گاندھی کا یہ بیان ریکارڈ پر موجود ہے کہ ہم نے ایک ہزار سال پرانا بدلہ لے لیا

ہے۔ یہ اندرا گاندھی کی پاکستان کے خلاف دشمنی کا کھلا اظہار تھا۔ بھارتی دانشور ستیا پال نے کہا کہ اگر بھارت چاہتا تو مشرقی پاکستان پر قبضہ کر لیتا لیکن اس نے اپنی افواج واپس بلا لیں۔ تاہم کئی بھارتی دانشور بھارت کے اس کردار پہ تنقید کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ مشرقی پاکستان کے اندرونی معاملات میں بھارت کو مداخلت کا حق نہیں تھا۔

مشرقی پاکستان کے ٹوٹنے کے اسباب اس کے علاوہ بھی تھے۔

آزادی ہند سے پہلے بھارت کی مسلح افواج کے برطانوی کمانڈر انچیف جنرل آکن لیک نے اپنے سابقہ پرائیویٹ سیکرٹری شاہد حامد کو 1967ء میں ایک خط میں لکھا۔

"پاکستان کو چاہئے کہ مشرقی پاکستان سے دست بردار ہو جائے۔ وہ لوگ اپنے حقوق حاصل کرنے کیلئے ہر وقت مستعد ہوں گے اور پاکستان کے لئے خطرہ ثابت ہوں گے۔ جناح نے پاکستان میں ان کی شمولیت پر اصرار کر کے بڑی غلطی کی۔ میرا خیال ہے ان کے ذہن میں پٹ سن کی صنعت تھی۔ پاکستان نامساعد حالات کا شکار ہے۔ پنجابی بنگالیوں سے شیر و شکر نہیں ہوں گے۔ وہ ایک دوسرے کے لئے تیل اور پانی کی طرح ہیں۔ مذہب کے سوا' وہ ہر لحاظ سے ایک دوسرے کے لئے مختلف ہیں اور میرا ہمیشہ سے یہ خیال رہا ہے کہ انہیں علیحدگی پر راضی ہو جانا چاہئے۔ میری رائے میں مغربی پاکستان پٹ سن کی آمدنی سے محروم رہ جانے کے باوجود مشرقی پاکستان کے بغیر زیادہ مضبوط ثابت ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ مشرقی بنگال کے پاکستان کے ساتھ الحاق کی دوبارہ کوئی امید نہیں۔ درحقیقت میں اس پر بہت حیران ہوتا ہوں کہ کیا یہ ایک فاش غلطی نہیں تھی کہ ان دونوں کے ایک قوم ہونے پر اتفاق کر لیا گیا جبکہ حقیقت میں وہ ایک قوم نہیں ہیں اور غالباً" آئندہ کبھی ایسا ہونے کا امکان بھی نہیں۔"

1970ء میں دوبارہ جنرل آکن لیک نے لکھا "پاکستان کے حالات اچھے نہیں ہیں۔ ملک کے دونوں حصوں کے درمیان ایک ہزار میل کا فاصلہ ہونے کی بنا پر بہت مشکلات ہیں۔ جبکہ درمیان میں ہندوستان کا ملک پڑتا ہو۔ جس کا رویہ پاکستان کے ساتھ کچھ زیادہ دوستانہ نہیں۔ جناح کو مشرقی پاکستان کی شمولیت پر زیادہ اصرار نہیں کرنا چاہئے

تھا۔ جس پہلو سے بھی غور کیا جائے سوائے مذہب کی قدر مشترک کے یہ علاقہ مغربی پاکستان کے لئے اجنبی ہے۔ اس کی زیادہ قرابت ہندو بنگال سے بنتی ہے۔ وہ لوگ کیوں کشمیر کے بدلے اس کا معاملہ طے نہیں کر لیتے۔" پھر 23 اپریل 1971ء میں اس نے لکھا

"مجھے پاکستان کے بارے میں کوئی خبر نہیں ملی۔ یہ ایک بڑا المیہ ہے۔ اور میں یحییٰ اور اس کے احمق مشیروں کو کبھی معاف نہیں کر سکتا۔ گو مجھے ان کے مشیروں کے فوجی ہونے پر شبہ ہے۔ یعقوب اور احسن بھی اچھی نظر سے نہیں دیکھے جاتے۔ ہندوستان اور پاکستان جنگ کے دہانے پر کھڑے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ مشرقی بنگال آزادی حاصل کر لے گا اور اگر ایسا ہو جاتا ہے تو غالباً" ہندوستان اسے اپنے اندر ضم کر لے گا۔ بہر حال وہاں کی 49 فیصد آبادی ہندو ہے۔ یہ ہمیشہ ایک مضحکہ خیز صورت حال رہی ہے اور پاکستانی فوجی دستوں نے مشرقی پاکستان میں ملازمت کو ایک بیرونی ملازمت تصور کیا ہے۔ اگر پاکستان مشرقی پاکستان کے بغیر اپنے وجود کو برقرار رکھ سکتا ہے تو بالاخر سب معاملات درست ہو جائیں گے۔ لیکن کشمیر ایک مستقل ناسور کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ حیثیت ہمیشہ رہے گی اور آخر کار اس وقت تک ایک اور جنگ کا باعث بنی رہے گی جب تک ہندوستان مذاکرات کے ذریعے کسی تصفیئے تک پہنچنے پر رضامند نہیں ہو جاتا۔ مشرقی پاکستان میں انتشار ناگزیر ہے۔ کیونکہ اس احمق یحییٰ نے بنگالیوں کو قوت کے ذریعے کچلنے پر اصرار کیا۔ اس نے یہ کوئی اچھا کام نہیں کیا۔ المیہ یہ ہے کہ اس سے پاکستان دو لخت ہو جائے گا اور اس طرح اس کی تمام حماقتوں کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔ یہ ہماری غلطی ہے۔ اس کا قصور وار ماؤنٹ بیٹن ہے۔ جس نے تقسیم کے وقت اتنی جلد بازی کا مظاہرہ کیا اور پاکستان میں مشرقی بنگال کی شمولیت اور کشمیر کے اخراج پر متفق ہونے کی بھیانک غلطی کی۔"

جنرل آکن لیک کے اس خط سے کئی سوالوں کے جوابات مل جاتے ہیں بشمول ان سوالوں کے جو امیر جماعت اسلامی ہند نے پاکستان کے دو لخت ہونے کے بارے میں

اٹھائے۔

میرے خیال میں بنگالیوں کی ہم سے علیحدگی کی تحریک جو ان کے لئے آزادی کی تحریک تھی اس پر ہمیں اعتراض نہیں کرنا چاہئے اور فراخدلی کے ساتھ اپنی غلطیوں کا اعتراف کر لینا چاہئے۔ بنگلہ دیش ہر سال پاکستانی افواج کے ہتھیار ڈالنے کے دن اسی جگہ پر آزادی کی تقریب منعقد کرتا ہے۔ آزادی کی تقریب منعقد کرنا ان کا حق ہے۔

جب ڈھاکہ فال ہوا اس وقت لاہور میں سخت بے چینی' مایوسی اور غم و غصہ پھیلا ہوا تھا۔ اس وقت پاکستان ٹیلیویژن نے خبروں میں پاکستانی فوج کو ہتھیار ڈالتے ہوئے دکھایا تو جماعت اسلامی نے ٹی وی سٹیشن پر پتھراؤ کیا۔ اور کئی دانشوروں نے واویلا کیا کہ یہ پروگرام بند کیا جائے۔ وہ یہ سب کچھ برداشت نہیں کر سکتے ہم یہ ذلت دیکھنا گوارا نہیں کر سکتے۔ لیکن جو کچھ ہم بنگلہ دیش میں کرتے رہے ہیں اس پر ہم نادم نہیں۔ ہمارے پڑھے لکھے دانشور اپنے لب کیوں سی چکے تھے۔ انہوں نے مشرقی بنگال میں ظلم و زیادتیوں پر احتجاج کیوں نہ کیا گیا۔ ریپ کے واقعات کی مذمت کھلے الفاظ میں کیوں نہ کی گئی۔ ہتھیار ڈالنے سے دو دن پہلے بنگلہ دیشی دانشور بڑی تعداد میں قتل کئے گئے۔ پاکستان کی تاریخ کا یہ شرمناک اور کربناک باب ہے۔ مشرقی پاکستان میں ہماری فوج کے ہتھیار ڈالنے پر دنیا بھر میں پاکستانیوں کو ہزیمت اور شرمندگی اٹھانا پڑی۔

ہندوستان کے بارے میں بھی جنرل آکن لیک نے لکھا۔

"انڈیا میں حالات کیا رخ اختیار کریں گے' اس کا مجھے اندازہ نہیں۔ ممکن ہے کہ سکھ اپنی علیحدہ حکومت قائم کرنے کی کوشش کریں۔ میرا خیال ہے کہ وہ غالباً" ایسا کریں گے اور یہ مرکزیت کو توڑنے اور علیحدہ ہو جانے کی صرف ابتداء ہوگی۔

انڈیا یورپ کی طرح مختلف قومیتوں پر مشتمل ایک براعظم ہے پنجابی ایک مدراسی سے اسی طرح مختلف ہے جیسے سکاٹ لینڈ کا ایک باشندہ اطالوی سے۔ انگریزوں نے اسے متحد کرنے کی کوشش کی تھی لیکن مستقل طور پر کچھ حاصل نہ کر سکے۔ انڈیا کشمیر میں کبھی استحکام برقرار نہیں رکھے سکے گا کشمیر برصغیر کے سینے پر ناسور کی طرح ہے اور

ہمیشہ رہے گا۔ یہ مسئلہ ہندوستان کے لئے تمام معاملات سے زیادہ بوجھ اور خطرہ بنا رہے گا۔

امیر جماعت اسلامی ہند نے یہ بھی کہا ہے کہ بھارت میں مسلمان کسی تکلیف میں نہیں۔ یہاں مسلمانوں کے مسائل اور حالت زار کا ذکر کر کے غلط بیانی سے کام لیا جاتا ہے اور غلط پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے۔ ہمارے حقوق یہاں صلب نہیں ہو رہے ہم پر ظلم کی فرضی داستانیں سنائی جاتی ہیں۔

بھارتی مسلمانوں کی عمومی حالت کو دیکھتے ہوئے جماعت اسلامی کے اکابرین کی ان کے بارے میں ایسی رائے خارجی دباؤ کی وجہ معلوم ہوتی ہے۔ اسے درست تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ بھارت میں مسلمان دنیا کی سب سے بڑی اقلیت ہیں۔ ان کی سماجی حالت اچھی نظر نہیں آتی۔ معاشی طور پر بھی وہ پس ماندہ طبقہ نظر آتے ہیں۔ ملازمتوں میں ان کا تناسب بہت کم ہے۔ اس کی وجہ تو ان کی اپنی کمزوریاں بھی ہیں۔ کہ وہ اپنے بچوں بچیوں کو اعلیٰ تعلیم دلوانے سے گریزاں رہتے ہیں۔

کچھ ان کا تفاوت بھی تھا شامل بربادی
کچھ خاک بسر رہنا ہم کو بھی گوارا تھا

مسلمان تعلیم یافتہ خواتین کا تناسب صرف 19% ہے اور جو مسلمان لڑکیاں کسی شعبے میں معیار تک پہنچیں انہیں اس شعبے میں ملازمت کرنے میں خارجی دباؤ کا سامنا رہتا ہے۔ جے پور میں ایک نیم سرکاری ادارے میں لڑکیوں کے لئے خالی آسامیوں کا اشتہار چھپا۔ مسلمان لڑکیوں نے درخواستیں دیں اور کوالیفائی کر لیا اور انہیں ملازمتیں مل گئیں۔ لیکن اس علاقے کے مسلمانوں نے اکٹھے ہو کر جلوس نکالا اور اس ادارے کا گھیراؤ کیا اور دھمکی دی کہ اگر مسلمان لڑکیوں کو ملازمت دی گئی تو ہم اس بلڈنگ کو جلا دیں گے۔ وہاں کی انتظامیہ نے مجبوراً" ان مسلمان لڑکیوں کو ملازمت دینے سے معذوری ظاہر کر دی۔

ایک اور مشکل یہ ہے کہ پاک بھارت تعلقات میں کشیدگی کی وجہ سے بھارت کے

مسلمان مشکل صورت حال میں پھنس جاتے ہیں اور جب یہ کشیدگی حد سے بڑھ جائے اور جنگ کی نوبت آجائے تو وہ ذہنی پریشانی اور الجھن کا شکار ہو کر دباؤ میں آجاتے ہیں۔ اس لئے پاک بھارت تعلقات کی بہتری ہی بھارتی مسلمانوں کو تحفظ اور نفسیاتی طاقت اور خوشی مہیا کر سکتی ہے۔ بھارتی مسلمانوں کا دل پاکستان کے ساتھ دھڑکتا ہے جب پاک بھارت کرکٹ میچ ہوتا ہے تو ان کی ہمدردیاں پاکستان کے ساتھ ہوتی ہیں۔

جامع مسجد دہلی میں کرنسی بدلنے گیا تو وہاں کے ایک مسلمان تاجر نے کہا ہم یہاں کافرستان میں رہتے ہیں۔ لیکن ہمیں کوئی مسئلہ نہیں۔ جے پور کے ایک مسلمان گھرانے کے افراد بھی یہی رائے رکھتے تھے۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ اگر پاکستان نہ بنتا تو بھارت کے دو صوبوں میں آج مسلمانوں کی حکومت ہوتی۔

بھارت کے مسلمانوں کو سماجی انصاف کے حصول میں دشواریاں ہوں تو وہاں کی حکومت ہی ذمہ دار ہوگی۔ خود بھارت کے سابق وزیراعظم دیوی گوڑا نے کہا تھا کہ بھارتی مسلمانوں کی سماجی حالت افسوسناک ہے۔ فوجی اور نیم فوجی دستوں میں ان کی تعداد بہت کم ہے۔ مسلمان صرف تحفظ ہی نہیں بلکہ وہ اقتدار میں شراکت بھی چاہتے ہیں۔ بھارت میں مسلمانوں کی اہمیت صرف اس وقت بڑھ جاتی ہے جب وہاں انتخابات ہو رہے ہوں۔ سیاسی جماعتیں ان کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے کی کوشش کرتی ہیں کیونکہ ان کا ایک بڑا ووٹ بنک ہے۔ حتیٰ کہ انتہا پسند ہندو جماعتیں بھی مسلمانوں کے حق میں بیان دینے سے پیچھے نہیں ہٹتیں۔

بھارت کے مسلمان دل سے پاکستان کی ترقی اور خوشحالی چاہتے ہیں۔ کیا ہمیں ان کی ترقی اور خوشحالی عزیز ہے۔ امیر جماعت اسلامی ہند کے اس بیان کو اسی پس منظر میں دیکھنا چاہئے۔ بھارت مسلمانوں کی ترقی و خوشحالی پاک بھارت کشیدگی میں ممکن نہیں۔ پاکستان میں بسنے والی ہندو اقلیت کا بھی بھارتی حکومت کو یہی مشورہ ہے۔ کہ وہ پاکستان کے ساتھ اپنے تعلقات بہتر بنانے کی کوشش کرے۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ بھارت کے مسلمانوں کے دکھ درد کا احساس نہ پاکستان کے عوام کو ہے نہ حکومت کو۔

دہلی

ملاقاتیں :- پاکستان ہائی کمشنر۔ نائب صدر بھارت۔ سیکرٹری کانگریس۔ آئی

زیارت :- مرزا غالب۔ نظام الدین اولیا۔ امیر خسرو

دہلی بھارت کا دارالحکومت ہے۔ اس کی آبادی ایک کروڑ کے لگ بھگ ہے سڑکیں کشادہ اور بڑی بڑی ہیں۔ صفائی کا انتظام معیاری نہیں لیکن نسبتاً" بہتر ہے۔ سڑکوں بازاروں میں چلتے پھرتے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے لاہور میں گھوم پھر رہے ہیں۔ پرائیویٹ ٹرانسپورٹ کا انتظام اچھا ہے۔ بڑی تعداد میں بسیں چلتی ہیں۔ چاندنی چوک سائیکل رکشہ سے اٹا پڑا ہے۔ شہر کے دیگر علاقوں میں بھی سائیکل رکشہ نظر آتے ہیں۔ چاندنی چوک بڑا شاپنگ سینٹر ہے۔ یہاں خریداری کے لئے چیزوں کی بہتات ہے۔ ہر معیار کا سامان مل جاتا ہے۔ چاندنی چوک کے آس پاس گوردوارہ' مندر' جامع مسجد اور لال قلعہ موجود ہیں۔ بسوں کا دھواں اتنا زیادہ ہے کہ سارا شہر دھویں کی لپیٹ میں نظر آتا ہے جو انسانی صحت کے لئے بے حد مضر ہے۔ یہاں کلکتہ کی طرح فضا کی آلودگی بہت زیادہ ہے۔ دہلی کی ثقافتی' تمدنی' تہذیبی علمی ادبی سیاسی اور تاریخی حیثیت اس شہر کو متحرک اور پرکشش رکھتی ہے۔ یہاں ہفتوں گھومتے پھریں دل نہیں بھرتا۔ بہت سی تاریخی عمارات اور بزرگان دین کے مزارات ہیں۔ مرزا غالب کا مزار بھی یہیں ہے۔ غالب اکیڈمی غالب کے مزار کے ساتھ منسلک عمارت پر قائم ہے جس کا افتتاح اندرا گاندھی نے کیا تھا۔ غالب اکیڈمی سارا سال مختلف موضوعات پر سیمینار اور ورکشاپس منعقد کرتی رہتی ہے۔

وفد میں ہمارے ساتھ طلباء بھی شامل تھے۔ پاک بھارت تعلقات کے پس منظر میں بہت سے موضوعات ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ ہم سرونٹس آف پیپلز سوسائٹی کے کانفرنس روم میں بھارت کے مختلف وفود کے ساتھ بات چیت کر رہے تھے اس گفتگو میں بھارت کی ایک ریاست کے سابق جج اور کچھ سماجی تنظیموں کے افراد بھی شامل تھے۔ مہمانوں میں جماعت اسلامی ہند کے نمائندے بھی تھے۔ بات چیت کا کوئی ایجنڈا نہیں تھا۔ میں نے دونوں ملکوں کی بیوریوکریسی اور انتہا پسند تنظیموں کے حوالے سے تند و تیز باتیں کیں۔ جماعت اسلامی پاکستان کے حوالے سے میں نے کہا کہ اگرچہ جماعت اسلامی پاکستان میں فروعی لسانی اور مذہبی فرقہ واریت میں شامل نہیں ہوتی لیکن

امیر جماعت کی پالیسی سابقہ جماعت اسلامی کے کردار سے مماثلت نہیں رکھتی۔ وہ عسکری نوعیت کے بیانات دیتے ہیں اور ہر معاملے کو بزور قوت حل کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ جہاں تک جمہوریت کا تعلق ہے جماعت اسلامی کبھی بھی اس کی حامی نہیں رہی۔ وہ الیکشن میں حصہ ضرور لیتی ہے۔ لیکن جمہوریت کو مضبوط بنانے کی غرض سے مدد و تعاون پر آمادہ نہیں ہوتی۔ کشمیر کے مسئلے پر وہ ہر وقت جہاد کیلئے تیار رہنے کا مشورہ دیتے ہیں اور بات چیت کیلئے سفارتی سطح پر کوششوں کو شک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ وہ سخت گیر ہیں اور نرم و لچک دار رویہ اپنانے کو تیار نہیں۔ ان کا خیال ہے کہ حکومتیں کشمیر کے معاملے میں بھارت کے ہاتھ پر بکنے کو تیار ہیں۔ اگرچہ ان کے قائد مولانا مودودی پاکستان بننے کے سخت مخالف تھے۔ لیکن پاکستان بن جانے کے بعد جماعت اسلامی بھارت کے ساتھ کسی طرح کے تجارتی لین دین اور معمول کے سیاسی و سفارتی تعلقات قائم کرنے کے حق میں نہیں۔ وہ کہتی ہے جب تک مسئلہ کشمیر حل نہیں ہو جاتا بھارت ہمارا دشمن رہے گا۔ مسئلہ کشمیر کا حل وہ یہ بتاتے ہیں۔ کشمیر بنے گا پاکستان۔ کشمیر پاکستان کی شہ رگ ہے۔ پاکستان کشمیر کے بغیر نامکمل ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ مسئلہ کشمیر کے لئے کشمیریوں کی رائے لینے کی صرف اتنی گنجائش ہے کہ کشمیری پاکستان کے ساتھ اپنے الحاق کا اعلان کر دیں۔

مسئلہ کشمیر کے لئے استصواب رائے کو وہ اب تھرڈ آپشن کا نام دیتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اگر کشمیریوں نے اس رائے کا اظہار کر دیا کہ وہ بھارت اور پاکستان دونوں کے ساتھ الحاق نہیں چاہتے بلکہ وہ انڈیپنڈینٹ کشمیر چاہتے ہیں تو یہ بات جماعت اسلامی کو قبول نہ ہوگی۔ ان کے بقول یہ تھرڈ آپشن ہے جس کے پس پردہ امریکی سازش کام کر رہی ہے۔ میں نے کہا کشمیر کے مسئلے کو حل کرنے کے لئے شملہ سمجھوتہ مدد دے سکتا ہے۔ میں نے بھارت کی بنیاد پرست جماعت پر بھی تنقید کی اور بابری مسجد کی شہادت پر بھارت کی اس وقت کی حکومت کی مذمت کی۔ ہمارے وفد میں شامل ایک صاحب نے کہا کہ پاکستان کی جماعت اسلامی پاک بھارت تعلقات میں بہتری

چاہتی ہے۔ وہ تعلق ں رکاوٹ نہ ہی وہ کٹر مذہبی جماعت
ہے۔ اس پر میں نے کہا کہ ے بھائی کا خیال غلط ہے۔ جماعت اسلامی ایک بنیاد
پرست نیم مذہبی سیاسی جماعت جس نے ضیاء الحق جیسے ڈکٹیٹر کے سا کیا
اور 11 سال، دردہ اور اعلا کی مدد کی۔ اس کی سوچ رجعت پسند ہے ر ذر
جمہوری قو ساتھ نبھا نہیں کرتی۔

کے بع ستانی دوست مجھ سے ناراض تھا۔ اس کا خیال تھا کہ بھارت
میں بیٹھ کر مجھے پاکستان کی جماعت اسلامی کی حمایت نہیں کرنی چاہیے ہر ملک میں
پاکستان کی کمزوریوں کا ذکر کیوں کریں۔ میں نے کہا آپ ایک رہے تھے جو سفید
جھوٹ ہے ارت کا کوئی فرد اسے سچائی تسلیم کر سکتا جماعت اسلامی بنیا
پرست جماعت نہیں اور کشمیر میں وہ کشمیر آپشن نہیں
کہتے۔ نواز شریف کا یہ بیان ریکارڈ پر موجود ہے کہ امیر جماعت اسلامی قاضی حسین احمد
نے ان کی حکومت سے کشمیر میں انتخابات کے نام پر دس کروڑ روپے وصول کئے تھے جو
کا زاد ہے۔ بھارت ہو کہ پاکستان کو ہر طرح کا میسر ہے خواہ کوئی
بتلائے یا چھپائے یہ پاکستان کی کمزوری کا اظہار نہیں بلکہ سچ کی حقیقت کا اقرار ہے۔ کیا
میں نے بھارت میں بیٹھ کر بھارتیہ جنتا پارٹی کی تعریف نہیں کی۔ بھارت اور پاکستان کی
کونسی بات ہے جو ایک دوسرے سے چھپی ہوئی ہے۔ کیا بھارت کے دانشور یا حکومت
جماعت اسلامی پاکستان کے کردار یا نظریہ عمل سے بے خبر ہوں گے۔

ہم نے کے قائم مقام ہائی کمشنر سے ملاقات کا وقت لیا اور اگلے
روز ان سے ملاقات کیلئے پاکستان ہائی کمشنر گئے۔ خالد کھٹک سے ملاقات میں ہم
نے اپنے موجودہ دہلی کے دورے کی تفصیلات نہیں آگاہ کیا۔ ہم نے بتایا کہ اگلے
روز بھارتی وزیراعظم آئی کے گجرال اور نائب کشن کانت سے ہماری ملاقات طے
ہے۔

خالد کھٹک نے بڑی تفصیل سے ہمیں پاک بھارت تعلقات کی موجودہ سیاسی

صورت حال اور پھر اس کے تاریخی پس منظر سے آگاہ کیا۔ انہوں نے اچھا خاص لیکچر دے ڈالا۔ وہ ایسے سفارتکار تھے جو پاک بھارت تعلقات کے حوالے سے بات چیت کی حدود کے اندر رہ کر ان پہلوؤں کو دہرا رہے تھے جو پچاس سالہ طویل رقابت نے انہیں زبانی حفظ کروا دئے ہیں۔ پاکستان اور بھارت کے سفارتکار ایک ہی طرح کی ڈگر پر چلتے آرہے ہیں۔ ان کو پتہ ہے کہ انہیں کیا کہنا ہے۔ ان کی سوچ کو ایک سانچے میں ڈھالا گیا ہے۔ وہ اس سوچ سے باہر نہیں نکل سکتے۔ وہ انفرادی حیثیت میں ایسا کردار ادا کرنے کے قابل ہی نہیں جو زمانے کے بدلتے حالات کا تقاضا ہو۔ سرد جنگ کے پلے ہوئے یہ بے جان گھوڑے صرف اپنی جگہ پر حرکت کرتے رہتے ہیں۔ یہ سفارتکار ایک ایسی دیوار ہیں جو بڑی پر سکون ہے۔ نہ پتھر مارتی ہے' نہ نعرے لگاتی ہے۔ نہ جلسہ نہ جلوس۔ لیکن اس کی ترقی بھی تو نہیں۔ اس نے دیوار ہی رہنا ہے۔ انسان اور دیوار میں یہی فرق ہے کہ انسان کے اندر سوچ اور فکر ہے اور یہی سوچ اور فکر اسے آگے لئے چلتی ہے۔ جس منزل کا وہ تعین کرلے وہاں پہنچ کر نئی منزل کی نشاندہی ہوتی ہے اور وہ اس منزل کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔

اک سفر تا بہ منزل' اک سفر منزل میں ہے

سفارتکار تو بے چارے ایک منزل کا ہی تعین نہیں کر پائے اگلی منزلیں کہاں ڈھونڈیں گے۔ سفر پر نکل پڑیں تو منزل نظر آئے۔ کشمیر کے مسئلے کا پچاس سال پرانا حل ہی ایک حل ہے۔ بھارت کہتا ہے مجھے وہ حل نہیں چاہئے۔ پاکستان کہتا ہے مجھے یہی ایک حل چاہئے۔ ٹکراؤ ہوتے رہے اور اب خدا نہ کرے کہ آخری ٹکراؤ کی نوبت آئے۔ جب مسئلے کو حل کرنے کی نیت لیکر بیٹھیں گے تو امن کے کئی راستے اور نئی راہیں نکلیں گی۔ سفارتکاری کے جوہر ایک دوسرے کو نیچا دکھانے' جھوٹا ثابت کرنے اور نقصان پہنچانے کیلئے استعمال ہوتے رہے تو گاڈ فادر وہی ہوگا جو دور بیٹھا اپنا اسلحہ بیچ رہا ہے۔ کشمیر پر بزور شمشیر قبضہ بھارت کو طاقتور نہیں بلکہ کمزور بناتا ہے۔

اس کا جمہوری حل تلاش کرنے کے وں ملکوں کو افہام کا راستہ نکالنا ہو
تاکہ آنے والے کل کے ۔ یں۔
ہماری تع رہے تھے کہ آپ لوگ ابطوں کے ذریعے
 ونوں ملکوں میں بڑھتی ہوئی ٹینشن کو کم کرے ا کوششیں جارا
رکھیں۔ وہ بحث کررہے تھے کہ آپ کا People Dialogue کے Peo
ایک ملک کی Term پر نہیں ہونا چا Mutual Terms پر ہو ۔ ان کا
کہنا بالکل درست تھا۔
ان کا کہنا تھا ک ستان پر یلغار کی ور ں پر قبضہ کیا ین کر ایک
مثال بھی ا جس میں کسی روسی فوجی نے افغانستان میں کسی لی
عصم ی کی ہو۔ لیکن وجوں نے کشمیر کِ نیں لوٹیں۔ ریپ
کئے اور اسی ں سے اٹھا کر لے جاتے بھارتی فوجوں کا ریکارڈ بڑا
خراب ہے ور میں شرم ہے۔ آپ جب وزیر ی ے گجرال اور نائب صدر سے
ملیں تو پاکستان کا نقطہ نظر پیش کریں۔ یاد رکھیں جب تک کشمیر کا مسئلہ حل نہیں ہ
جاتا پاکستان اور بھارت کے تعلقات ت نہیں ہونگے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ بھارت
کے ساتھ کی وجہ وڑوں کی سمگلنگ ہو ر ۔ یہ سب
جھوٹ ہے۔ یہ کہ ے ور کیسے اکٹھے ہو سکتے ہیں ہ ے کروڑ کی
نگ ہو رہی ہے۔ سمگلنگ طریقوں سے ہوتی ہے۔ جس کا ریکارڈ نہیں ہوتا۔
یہ سب بھارتی پروپیگنڈہ فسیاتی د نے کا حربہ۔ تا کہ باقاعدہ
شرو ر بھارت پاکستان کی منڈی پر چھا جائے اور اس طرح کشمیر کا مسئلہ بھی پس
پشت ئے۔
نے کھٹک لہ آپ سمجھوتہ ایکسپریس سے سفر ر آپ کو
معلوم ہوگا کہ کیا ہو سمگلنگ ہو رہی جارت۔ پاکستان جو مال بھارت سے
منگواتا ہے وہ دوبئی اور ہانگ کانگ کے راستے پاکستان آتا ہے جس کی وجہ سے دگنی

قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ ہمارے وفد میں شامل ڈاکٹر عمر خان بتا رہے تھے کہ ظلم کی بات یہ ہے کہ جان بچانے والی ادویات جو غریب اور متوسط طبقے کے لوگوں کے استعمال میں ہوتی ہیں ان کی قیمتوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ایک گولی Zantac جو السر اور تبخیر (Acidity) ہو جانے پر استعمال کی جاتی ہے۔ اس کی قیمت بھارت میں ایک روپیہ ساٹھ پیسے اور پاکستان میں پندرہ روپے ہے۔ اسی طرح ایک ٹیکہ Desferd جو خون بدلنے کے لئے ہر ماہ مریض کو لگایا جاتا ہے۔ بھارت میں اس کی قیمت چالیس پچاس روپے ہے۔ جبکہ پاکستان میں ایک سو پچاس سے دو سو روپے تک بکتا ہے۔ یہ دونوں ادویات انٹرنیشنل کمپنی گلیکسو اور سیبا گائیگی سپلائی کرتی ہے۔

تجارت کسی مسئلے کی موجودگی میں بھی جاری رہ سکتی ہے۔ دنیا کے اور ملکوں کی مثالیں موجود ہیں۔ ہم صرف انہیں اشیاء کا لین دین کر لیں جن سے ہماری مصنوعات اور صنعت کو نقصان نہ ہو۔ کھٹک صاحب نے میری سب باتوں کو طفلانہ سوچ قرار دیا۔

کھٹک صاحب نے کشمیر میں بھارتی فوجوں کی اخلاقی گراوٹ کی بات کی۔ اس پر ہر درد مند آدمی فکر مندی اور افسوس کا اظہار کرے گا اور اسے قابل مذمت ہی سمجھے گا۔ خواہ وہ پاکستانی ہو' بھارتی ہو یا دنیا کے کسی اور ملک کا رہنے والا۔

لیکن کیا ہماری فوج کا دامن مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) میں صاف ہے۔ کیا وہاں ریپ کے واقعات نہیں ہوئے' بے گناہ بنگالی قتل نہیں ہوئے۔ بھارتی فوج کے کشمیر میں اخلاقی جرائم ہوں یا پاکستانی فوج کے مشرقی پاکستان میں۔ امریکی فوج کے ویتنام میں یا سرب فوج کے بوسنیا میں سب قابل مذمت ہیں۔ جمہوریت اور انسانیت کی شمع جلا کر رکھنی ہے تو فوجی طاقت کے استعمال سے مسئلوں کا حل نکالنے کی کوشش ترک کرنا ہوگی۔

بھارت کے نائب وزیراعظم کشن کانت کا تعلق لاہور سے ہے۔ وہ بھارت کے صوبے آندھرا پردیش کے گورنر بھی رہ چکے ہیں۔ اندر کمار گجرال جب وزیر اعظم بنے

تو انہیں نائب صدر بنایا گیا۔ وہ ساؤتھ ایشین فریرنٹی۔ انڈیا کے عہدیدار بھی ہیں۔ ان سے ملاقات کیلئے ہم وائس پریذیڈنٹ ہاؤس پہنچے۔ وفد کے ارکان کا تعارف ان سے کرایا گیا۔ کشن کانت علم و ادب سے گہرا لگاؤ رکھتے ہیں۔ اردو بڑی روانی سے بولتے ہیں۔ میں نے اپنی تنظیم کی جانب سے انہیں لاہور کنونشن کا بروشر پیش کیا۔ جس میں پاک بھارت سیاسی' ادبی' شخصیات اور دانشوروں کے مشترکہ پیغامات چھپے تھے۔ اس کے علاوہ امرتسر امن مارچ کا ذکر بھی ہوا۔ کشن کانت کا کہنا تھا کہ آپ نے امن کی کوششوں کی جو شمع جلائی ہے ایک دن یہ سورج کی طرح چمکے گی۔ آپ اپنی کوششوں کو باری رکھیں ہمت اور حوصلہ نہ ہاریں۔

کشن کانت کی والدہ بھی اسی جگہ رہائش پذیر ہیں۔ ان سے بھی ملاقات ہوئی۔ ان کی عمر سو سال کے قریب ہے۔ سرخ و سفید رنگ ہے۔ انہوں نے لاہور کے ساتھ اپنی پرانی یادوں کا ذکر کیا اور کہا لاہور میرے دل میں ہے۔ مجھے اس شہر سے بہت پیار ہے۔ وہ لاہوریوں کا حال پوچھتی رہیں۔ لاہور میں اپنی رہائش کے وقت کا نقشہ کھینچتی رہیں۔ ہم ہندو اور مسلمان ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ آپس میں بہت پیار تھا۔ ایک دوسرے کے گھروں میں آتے جاتے۔ تقریبات میں ایک دوسرے کو بلاتے۔ آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ لاہور کو میرا سلام کہنا۔ بہت دل چاہتا ہے لاہور دیکھوں۔

اگلے روز ہمارے وفد کو پارلیمنٹ کا اجلاس دکھایا گیا۔ ہمارے وفد میں شامل طلباء کو بھارت میں بڑی اہمیت دی گئی۔ پاک بھارت دانشوروں کا خیال ہے کہ پاک بھارت تعلقات کی بہتری میں دونوں ملکوں کی نوجوان نسل اہم کردار ادا کر سکتی ہے خصوصاً" طلباء۔ آج تک آپس میں طلباء کے وفود کا متبادلہ نہیں ہوا۔ وہ ایک دوسرے کو جان نہیں سکے سمجھ نہیں سکے۔ انہیں تبادلہ خیال کا موقع نہیں ملا۔ نہ ہی وہ نصاب تعلیم کو دیکھ کر متبادل آراء حاصل کر سکتے ہیں۔ دونوں ملکوں کی سرد جنگ میں یہی نوجوان نسل نشانہ بنی ہے۔ دونوں ملکوں کے نصاب تعلیم کو بنانے والوں نے نفرتوں کو اگلی نسلوں تک پہنچانے کے لئے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ پرائمری سطح سے لے کر اگلی جماعتوں تک نصاب میں ایسا زہر ملایا گیا ہے جن سے تعصب کو ہوا ملی ہے۔ مذاہب کے فرق کو دشمنیاں قائم رکھنے اور بڑھانے کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ ہم نے تجویز پیش کی کہ

دونوں ملکوں کے ماہرین تعلیم پر مشتمل مشترکہ کمیٹی بنائی جائے جو دونوں ملکوں کے نصاب کو درست کرے اور اس میں سے غلط تاریخی حقائق کو نکال کر ایک دوسرے کی دل آزاری کرنے والے الفاظ یا واقعات نکال دے۔

شاید گذشتہ پچاس سالوں میں پاکستان سے جانے والے غیر سرکاری وفد میں پاکستانی طلباء کی شمولیت نہ رہی ہو۔ ہمارے وفد کے طلباء کو دہلی کے ایک اہم اور بڑے تعلیمی ادارے سینٹ سٹیفن کالج (Saint Staphen's College) کی ایک بڑی تقریب میں بلایا گیا جہاں انہوں نے پاکستانی مہمان طلباء کی حیثیت میں تقاریر کیں۔ دہلی کا یہ کالج دنیا بھر میں مشہور ہے۔ اسی کالج سے پاکستان کے سابق فوجی حکمران ضیاء الحق نے تعلیم حاصل کی۔ کالج کے پرنسپل نے ہمارے طلباء کو ہوسٹل کا وہ کمرہ بھی دکھایا جہاں جنرل ضیاء الحق تعلیم کے دوران رہائش پذیر تھے۔

طلباء نے آپس میں تحائف کا تبادلہ کیا اور آٹوگراف لئے۔

مہاتما گاندھی کی پڑپوتی سپریا گاندھی بھی پاکستانی طلباء سے ملیں۔ سپریا گاندھی مہاتما گاندھی کی پڑپوتی ہونے کے ناطے بھارت میں بہت مشہور ہیں اور انہیں احترام و عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ امرتسر کے سیمینار میں بھی وہ سٹیج پر موجود تھیں۔ بھارتیہ جنتا پارٹی کے لیڈر اور اس وقت کے اپوزیشن لیڈر اٹل بہاری واجپائی سے ہماری ملاقات کا وقت طے تھا۔ لیکن ہم مقررہ وقت سے کچھ دیر بعد پہنچے جب تک وہ جا چکے تھے۔ دہلی میں بہت سے لوگ پاکستان دیکھنے کے خواہشمند ہیں۔ وہ اپنے پرانے دوستوں اور چھوڑے ہوئے اپنے گھروں کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ بھارت میں پاکستان کے لوگوں اور وہاں کی معاشرتی زندگی کے بارے میں انہیں بہت کم واقفیت ہے۔ ایک بھارتی دوست کا کہنا تھا کہ ہمارے ہاں پاکستان کے لوگوں کے بارے میں واقفیت جھوٹے نظریات کی بنیاد پر قائم ہے۔ ہم میں سے بیشتر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ پاکستانیوں کے دلوں میں ہندوستان کے تئیں تعصب بھرا ہے۔ یہاں بے شمار لوگ ہیں جن کے ہر سانس میں لاہور بستا ہے۔ ان کے سامنے اس روشنیوں کے شہر کا نام لیجئے اور پھر دیکھئے کہ اداس آنکھیں بھی کس طرح چمک اٹھتی ہیں۔ ایک بھارتی نے بتایا کہ میں جب بھی لاہور جاتا ہوں تو عام لوگوں کی خوش خلقی، مہمان نوازی اور انسان دوستی دیکھ کر مجھ پر سب سے

پہلا تاثر یہ ہوتا ہے کہ ہمارے عوام پاکستان کے بارے میں کتنے غلط خیالات کا شکار ہیں۔ ہند پاک تعلقات کا یہ ایک بڑا المیہ ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کے بارے میں ہماری لاعلمی بڑھتی جا رہی ہے۔

کانگریس۔ آئی کے سیکرٹری بی پی موہریہ کی بہو مسلمان ہے۔ اس کا نام تبسم ہے۔ اس کا تعلق لاہور سے ہے۔ تبسم نے ہمیں اپنے گھر کھانے پر بلایا۔ یہ ایک فارم ہاؤس ہے جو نو ایکڑ پر محیط ہے۔ اس کے اندر سوئمنگ پول اور ایک بڑا زیر زمین کنونشن ہال ہے۔ یہیں ہماری ملاقات بی پی موہریہ سے ہوئی۔ کسی بھارتی سیاستدان کا اتنا شاندار گھر اور ٹھاٹھ باٹھ دیکھ کر ہم حیران ہوئے۔ بی پی موہریہ بہت دلچسپ انسان ہیں۔ انہوں نے کہا کہ میں ایک گھر بنانے میں دس سال لگاتا ہوں اب میں نے ایک اور گھر بنانا شروع کیا ہے۔

بی پی موہریہ نے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ انہوں نے کانگرس کے دوسرے لیڈروں کے ساتھ تقسیم ہند سے پہلے جناح سے ملاقات کی۔ میں ذاتی طور پر پاکستان بننے کے سخت خلاف تھا۔ جناح صاحب کی یہ خواہش تھی کہ انہیں پورے بھارت کا آئنی سربراہ بنا دیا جائے تو وہ پاکستان کا مطالبہ ترک کر دیں گے۔ میں اس بات کے حق میں تھا کہ انہیں بھارت کا گورنر جنرل بنا دیا جائے تاکہ وہ پاکستان کا مطالبہ ترک کر دیں۔ اگر میری بات مان لی جاتی تو ہندوستان تقسیم نہ ہوتا اور اتنا بلڈ شیڈ نہ ہوتا۔ لیکن افسوس میری کسی نے نہ سنی۔

انہوں نے کہا اس وقت امریکہ عالمی قوت ہے۔ وہ براہ راست پاک بھارت کشیدگی قائم رکھنے کا ذمہ دار ہے۔ اگر اس وقت امریکہ کسی سے خوف کھاتا ہے تو وہ اسلامی بلاک ہے۔ اگر اسلامی ممالک متحد ہو جائیں تو بڑی طاقت بن سکتے ہیں۔

میں نے پہلی دفعہ کسی بھارتی سیاستدان سے یہ بات سنی کہ قائداعظم کو اگر پورے انڈیا کا سربراہ بنا دیا جاتا تو وہ پاکستان کا مطالبہ ترک کر دیتے۔ یہ بات حالات واقعات اور حقائق کا تجزیہ کئے بغیر کہی گئی ہے۔ ایسا ممکن ہی نہ تھا اور انگریز کے پاس اس بات کا کوئی جواز بھی نہ تھا کہ وہ جناح کو بھارت کی حکومت سپرد کر دیا جائے۔ جناح کا پاکستان کا مطالبہ جن حقائق پر مبنی تھا اس کے لئے انہوں نے بھرپور وکالت کی۔



کیمرے سے لی گئی غالب کی اصلی تصویر

غالب کے مزار پر حاضری سے کبھی کوتاہی نہیں کی۔ سے میری عقیدت زمانہ طالب علمی سے ہے۔ غالب ہر صدی کا شاعر ہے۔ اس اور فکر کئی جہانوں اور نوں کا احاطہ کرتی ہے۔ اس کی شاعری اور فلسفہ زندگی کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ انسانی زندگی کا کونسا پہلو ہے جس پر اس نے خیال آرائی نہیں کی۔ غالب کا فلسفہ زندگی کی مصیبتوں' ناکامیوں رومیوں ہے اور زندگی کی نئی جہتیں تلاش کرتا ہے۔ کا کمال ہے کہ فاقہ کشی انسان کو ج نہیں ا۔ اپنی ذات کی پہچان کا شعور ہو جائے تو پھر مندی سے مشکلات کا م نے کی ترغیب پیدا ہوتی ہے۔ وہ غمول کا ک ا ے 'پس ا ز میں کر ا کہ یوں محسوس ہوتا ہے یہ غم درد اور المیہ میرا ۔ یوں و ں کے ر ں میں شریک نظر آتا ہے۔ غالب حسن و عشق ر میں بھی غوطہ زن ہے ں میں ڈوب کر زندگی پانے کی جستجو میں ہے۔ وہ جمالیات کے موتی چن کر رنگ' پھول خوشبو ت گ و ر بو ب کے حسن جمال کی سیج سجاتا ہے۔ جس کی مہک ہر طرف پھیل کر ے گ و پے یئت کر ۔ اس کی شاعری کا ہر لفظ نایاب موتی ے۔ جس کی خوبصورتی ر رنگ نہیں پڑتا۔

گنجینہ معنی طلسم ا ر و سمجھئے

جو کہ غالب! مرے اشع ں آو

غالب کی غزل میں نغمے اور لفظ کی ہم آہنگ ہے۔ جس سے شعر کی ش کہیں سے کہیں جا پہنچتی ے غ ر مو ر ت ں کی انہیں ندرونی جذبے اور تجربے شکل میں ل منتقل کامیابی حاصل ہوئی ار ں ہماری زبان کی شاعری میں نہیر اس سے ان کی توانائی' تخیل کی بلندی اور جذ یت کا پ ہے۔ نغمگی اور مصوری کے ا ج میں ان کی شاعری کا حسن اور ن کی صدا از مضمر ہے۔ ن کے کلام کی یہی خوبی آج بھی ہمیں اپنی کھینچتی ہے۔ آج بھی وہ ہمارے کے شاعر معلوم ہوتے ہیر ، والا زما سے بھی قریب پائے۔

یہ شاعرانہ اسلوب کا تمغہ امتیاز ہے۔

ہوں گرمی نشاط تصو[illegible] نغمہ

میں عندلیب گلشن نا آفریدہ ہوں

کہا جاتا ہے غالب کا شیکسپیئر کی طر[illegible] فلسفۂ حیات نہیں[illegible] زندگی پر ان کی نظر حکیمانہ ہے۔ جو غم کی پرچھائیوں میں[illegible] زندہ رہنا[illegible] سے لطف اندوز ہونے کا سلیقہ سکھاتی ہے۔ غالب کے ہمعصروں میں[illegible] جس کے کلام میں یہ خوبیاں[illegible] انسان کی ذاتی زندگی کے نشیب و[illegible] کی خلقی کے جلووں کی رنگا رنگی اور ان کی دلفریبیاں اور ان سے لطف اندا[illegible] کی تمنا یہ سب موضوعات ہمیں ان کے ہاں ملتے ہیں[illegible] کے کلام میں شوخی بھی ہے اور حکیمانہ نکتہ آ[illegible]۔ جدید انسان کا شعور[illegible] بجھاؤ اور تضاد بھی۔ ان کا ذہن دائمی طور پر حرکت کی حالت میں رہتا ہے۔ سوچ اور فکر کی پرواز جاری رہتی [illegible] کی عالمگیر انسا[illegible] اور اس کی فضیلت کو مانتی ہے۔[illegible] جو ہر آزادی ہے۔[illegible] بے[illegible] چوکھٹے[illegible] کر[illegible] سیار نہ تھا۔ وہ پرستی اور رجعت[illegible] کے قائل نہ تھے[illegible] ں حائل سمجھتے مہدی مجر[illegible]، بھائی کے بارے میں انہیں علم[illegible] علوم پڑھنا چاہتا ہے تو[illegible] ے جرور[illegible] لکھا کہ[illegible] حسین نے[illegible] یاں کس قصے میں[illegible] ہے۔[illegible] ھ کر کیا[illegible]۔ طب[illegible] و ہیئت و[illegible] و فلسفہ پڑھ جو[illegible] ں۔ چاہیے۔

اس سے[illegible] ہوتا ہے[illegible] ب کے نزدیک دنیاوی علو[illegible] کو وہ بصیرت حاصل[illegible] ہو سکتی ہو[illegible] رندی[illegible] ائل کو سمجھنے اور اس[illegible] رے لئے[illegible] جب میں پہلی با[illegible] غالب کے مزار پر حاضری دی۔ اس وقت مزار پر تالا لگا[illegible] اکیڈمی والوں سے چابی[illegible] ار کے اندر گیا اور فاتح[illegible]۔ لاہور واپس آ کر[illegible] ے اخبار کے کلر ایڈیشن[illegible]۔ اس[illegible] یک کاپی غالب اکیڈمی[illegible] ں۔ وہاں ایک پروفیسر صاحب[illegible] بھارت کی اس میں بدنا[illegible] لوں نے یہ لکھا کہ اتنے[illegible] نشور کے

یہ سلوک ہو رہا ہے کہ مزار پر تالے لگے ہوئے ہیں۔ ہمیں غالب کے مزار کو اس کے شایان شان بنانا چاہئے۔ غالب اکیڈمی والوں نے متعلقہ حکام سے ملاقاتیں کیں اور اس بات کا فیصلہ ہوا کہ جلد سے جلد غالب کے مزار کی تعمیر شروع کی جائے اور جو فنڈز اندرا گاندھی کے دور میں مزار کی تعمیر کیلئے وقف کئے گئے تھے انہیں اس مقصد کے لئے استعمال میں لایا جائے۔ اس کا اعلان وہاں کے اخبارات میں بھی ہوا۔

افسوس ہے کہ آج تک غالب کے مزار کی تعمیر کا کام شروع نہیں ہوا۔

حضرت نظام الدین اولیاء اور حضرت امیر خسرو کے مزارات ساتھ ساتھ ہیں۔ امیر خسرو نظام الدین اولیاء کے مرید تھے۔ امیر خسرو کی درگاہ کے اندر عورت کے حسن و جمال کی تعریف میں شعر لکھا ہے اور مزار کے باہر لکھا ہے۔

"عورتوں کا داخلہ منع ہے"

امیر خسرو کی مثنویاں رواداری کی روشن مثال ہیں۔ وہ ہندوستان کی ہر چیز کو محبوب رکھتے ہیں۔ وہ ہندی علوم و فنون، علم نجوم، منطق، اور کلام کی تعریف کرتے ہیں۔ ہندوستان کی آب و ہوا، پھل، میووں، جانوروں اور یہاں کی عورتوں کے حسن و جمال کی تعریف میں ان کا قلم بہت رواں دواں ہے۔ ان کی مثنویوں میں اس زمانہ کے ہندوستان کی معاشرت سے متعلق مفید معلومات ہیں۔ انہوں نے کئی راگ اور راگنیاں ایجاد کیں۔ ستار بھی انہی کی ایجاد ہے۔ حضرت امیر خسرو کے مزار کے احاطہ میں ایک شخص ہارمونیم اور طبلے کے سنگم میں امیر خسرو کا کلام سناتا ہے جسے میں اس کے پاس بیٹھ کر سنتا ہوں۔ بہت لطف محسوس ہوتا ہے۔ امیر خسرو کے کلام کی کشش ہے کہ دل محبت اور جذبات سے بھر جاتا ہے۔ اس روح پرور منظر اور کیفیت کا مزہ دیر تک باقی رہتا ہے۔ امیر خسرو کے مزار پر ان کا کلام سننے کی خواہش پوری ہو جاتی ہے۔ لیکن غالب کے مزار پر یہ تشنگی باقی رہتی ہے۔ شاید غالب کے صد سالہ جشن پر اس طرح کی کوئی محفل ان کے مزار کے احاطہ میں سجی ہو تاہم ان کے مزار کو اس طرح بے رونق دیکھ کر لگتا ہے اہل ہند نے غالب کی قدر نہیں کی۔

دہلی میں ہمارا قیام وہاں کی ایک مشہور سماجی و سیاسی تنظیم سٹیزن فار ڈیموکریسی

CFD لے [illegible] ساس بور کر کے گھر تھا۔ ایک روز وہ کسی دوست [illegible]
تھے کہ میر [illegible] پ [illegible] بعد میں میں نے ان [illegible] کہ ایسا کیوں! وہ
لے آپ جو ادھر ٹھہرے ہوئے ہیں۔

دہلی میں عصمت [illegible] کے اڈے بھی ہیں۔ دہلی میں پانچ سو کے قریب طوائفیں
ہیں۔ چند ا [illegible] ہیں باقی صرف جسم فروشی کا دھندا کرتی ہیں۔ بازار حسن
میں رہائش [illegible] نے بتایا کہ یہاں کئی [illegible] طوائفیں بھی ہیں جن کے بچے بی۔
اے [illegible] ے کرنے کے بعد بے روزگار پھ [illegible]۔ ایک مخصوص علاقے میں ایک
ساتھ بنے ہوئے کئی منزلہ گھروں میں [illegible] یوں کی طرح عو [illegible]، غول کے غول
[illegible] ہیں۔ [illegible] عالم یہ [illegible] کے پاس اپنے [illegible] لئے کمروں میں بیڈ بھی
[illegible] اب نہیں [illegible] کے تختوں پر [illegible] بچھا کر گزارہ [illegible] ہیں۔ مختلف ع
عورتیں [illegible] کیاں رات کے مخصوص [illegible] ں اپنے گھروں سے نکل کر باہر ف
[illegible] جاتی ہیں اور ہر آنے جانے والے کو آواز دیتی ہیں۔ اگر کو [illegible] رے تو
[illegible] ں طرف لپکتی ہیں اور منتیں کرتی ہوئی کہتی ہیں "صرف پچاس رو [illegible] ں" ان
[illegible] چہروں پر ہوائیاں اڑی ہوتی [illegible]۔ زرد پیلے بے جان چہروں پر خوف دہشت اور
[illegible] ہٹ کے آثار نما [illegible] یہ خوف پولیس کا ہے جو گاہے بہ گاہے راؤنڈ لگا
لیتی ہے۔ پولیس کو آتا دیکھ کر سب طوائفیں اور گاہک ادھر ادھر کھسک جاتے ہیں۔ یہ
سارا منظر [illegible]

[illegible] قبل سہاس بور کر [illegible] ے وفد کے اعزاز میں پر تکلف ڈنر دیا
[illegible] ہم شخصیا [illegible] کی جن میں مشہور صحافی کلدیپ نیر بھی شامل
تھے۔ سہاس بو [illegible] اور ان کے اہل خانہ نے ہماری مہمان نوازی میں کوئی کسر اٹھا نہ
رکھی۔ سہاس بور ری والدہ کنیرڈ کالج لاہور سے پڑھی ہوئی ہیں۔ ہم ان کے علمی ذوق
اور مطالعے سے متاثر ہوئے۔

لاہور کنونشن

پاک بھارت تجارت - مسئلہ کشمیر - مذہبی رواداری

پاکستان کی گولڈن جوبلی کی تقریب 14 اگست 1997ء کو لاہور میں شاندار طریقے سے منانے کیلئے ایک پروگرام ساؤتھ ایشین فریٹرنٹی نے ترتیب دیا۔ جس میں سیمینار' موسیقی' قومی گیت' نغمے وغیرہ شامل تھے۔ یہ تقریب دراصل مشترکہ طور پر بھارت' پاکستان اور جنوبی ایشیاء کے باقی ملکوں کے شہریوں نے مل کر 14 اگست کو لاہور اور 15 اگست کو امرتسر میں منانا تھی۔ لیکن بدقسمتی سے ہماری تمام تر کوششوں کے باوجود ایسا ممکن نہ ہو سکا اور آخر وقت میں ہماری حکومت نے بھارت کے ایک سو دانشوروں کو ویزے جاری نہ کئے۔ ردعمل کے طور پر بھارت نے بھی ہمارے 100 آدمیوں کے ویزے روک لئے۔ اس تقریب کے لئے ہمیں پاکستان اور جنوبی ایشیاء کے دیگر ملکوں سے پیغامات موصول ہو چکے تھے اور اکثر ملکوں کے سفیروں نے اس تقریب میں شرکت کرنے پر آمادگی بھی ظاہر کر دی تھی۔

پیغام الٰہی بخش سومرو سپیکر نیشنل اسمبلی

مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی کہ ساؤتھ ایشین فریٹرنٹی۔ پاکستان 14 اگست کو پاکستان کی گولڈن جوبلی منانے کیلئے لاہور میں فرینڈ شپ کیمپ منعقد کر رہی ہے۔ یہ بات قابل تعریف ہے کہ SAF پاکستان نے اس موقع پر سارک ملکوں کی اہم شخصیات کو اس میں شرکت کی دعوت دی ہے جن میں خاص طور پر انڈیا بھی شامل ہے۔ 1947ء اس خطے کی تاریخ کا اہم موڑ ہے۔ جب جنوبی ایشیاء کی دو سب سے بڑی اور آزاد ریاستیں معرض وجود میں آئیں۔ بدقسمتی سے دونوں ملکوں کو ورثے میں کئی حل طلب مسائل ملے۔ جن کی وجہ سے انہیں جنگیں بھی لڑنا پڑیں۔ اگر ہم گذشتہ پچاس سالوں کی تاریخ کا جائزہ لیں تو یہ دیکھ کر پاکستان اور بھارت دونوں پر افسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے وسائل' وقت اور پیسہ برباد کیا۔ جو کہ ترقی' خوشحالی اور سیاسی و معاشی نظام کی بہتری پر لگنا چاہئے تھا۔

دونوں ملکوں میں نئی لیڈر شپ آنے کے بعد امید کی ایک لہر پیدا ہوئی ہے۔ دونوں

ملکوں کی اعلیٰ قیادت نے اپنے دو طرفہ مسائل کو بات چیت کے ذریعے حل کرنے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ دونوں ملکوں کے تعلقات میں بہتری پیدا ہونے سے اس پورے خطے میں ترقی کے لئے سازگار ماحول پیدا ہوگا۔

یہ بہترین موقع ہے کہ جنوبی ایشیاء کے ممالک اپنے وسائل کو باہمی تعاون سے اپنی بہتری کیلئے استعمال میں لائیں۔ یہ وقت کی ضرورت اور عوام کی خواہشات کے عین مطابق ہے۔ ساؤتھ ایشین فریٹرنٹی پاکستان کو میں گولڈن جوبلی شاندار طریقے سے منانے پر مبارک باد دیتا ہوں اور جنوبی ایشیاء میں مستقل اور پائیدار امن کے قیام کی دعا کرتا ہوں۔

پیغام۔ اٹل بہاری واجپائی (لیڈر آف دی اپوزیشن۔ انڈیا)

مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ پچاس سالہ آزادی کی سالگرہ کے تاریخی موقع پر ساؤتھ ایشین فریٹرنٹی۔ انڈیا اور پاکستان مشترکہ طور پر 11 سے 14 اگست 1997ء کو لاہور میں کیمپ لگائیں گے۔ جس میں انڈیا۔ پاکستان اور دیگر سارک ملکوں کے افراد شرکت کریں گے۔ عوام کی سطح پر اسطرح کے مذاکرات اور مشترکہ تقریبات ایک دوسرے کو سمجھنے اور تجارتی و ثقافتی رشتوں کے فروغ اور ان میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنے میں معاون ثابت ہو سکتی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اس کیمپ کے ذریعے برصغیر کے لوگوں میں ثقافتی، معاشرتی اور معاشی تعلقات کے فروغ میں بہت مدد ملے گی اور اس سے ایسا سازگار ماحول پیدا ہوگا جو حکومتوں کیلئے مددگار ثابت ہوگا۔ انہیں ایک دوسرے کا نقطہ نظر سمجھنے میں مدد ملے گی اور وہ اپنے پیچیدہ مسائل کا حل ڈھونڈنے کی کوشش کریں گی۔

آپ کا کیمپ، جو اعلیٰ مقاصد کے لئے ہے وہ مثبت سوچ اور فکر کے ساتھ اچھے نتائج مرتب کرے گا۔ میں اس کی کامیابی کے لئے دعا گو ہوں۔

پیغام: ڈاکٹر مبارک علی۔ پاکستان

ارت اور پاکستان کے عوام کی آپسی سماجی ملاپ کی کوششیں اور اپنے اپنے ملکوں
ت پر دشمنی اور رقابت کو ختم کرنے کے لئے دباؤ بڑھانا اور بہتر تعلقات قائم
کرنے کی ضرورت کے لئے فضاء کو سازگار بنانا یقیناً" قابل ، فخر اقدام ہے۔ جس
باہمی مسائل کو حل کرنے میں مدد ملے گی اور ایسا ماحول گا جس سے اعتم
فضا جنم
ح یہ کیمپ ، عوام کی سطح پر آپس کے رابطوں کو قائم کرنے کی ابتداء ہے
جس کا اثر طاقتو تک پہنچے گا۔ ایک دوسرے ، اعتماد اور بھروسہ بڑھے گا اور
امن کے قیام میں مدد ملے گی۔

پیغام: نعیم۔ یو حسن (سیکرٹری جنرل سارک

ڈئر مسٹر شیخ۔ جان کر بے حد خوشی اور مسرت ساؤتھ ایشین فریٹرنٹی
پاکستان لاہور میں 11 اگست سے 14 اگست تک پاکستان کی گولڈن جوبلی منانے کے لئے
فرینڈ شپ کیمپ لگا ہے۔ جس میں جنوبی ایشیائی ممالک کی اہم شخصیات اور مختلف
شعبوں سے تعلق لے نمایاں افراد شرکت کر گے۔
میں آپ کے کیمپ کی کامیابی کیلئے نیک تمنا اظہار کرتا ہوں اور پاکستان کی
گولڈن اہل پاکستان کو میری طرف سے مبارکباد پہنچا دیجئے۔ میں توقع
کرتا ہوں کہ آپ کا کیمپ آئندہ بھی سارک ملکوں میں رنگت اور دوستی کے
رشتوں کو مضبوط کرنے میں اپنا کردار ادا کرتی رہے گی۔

پیغام: ہائی کمشنر آف سری لنکا

سری لنکا اور پ کے صدیوں سے دوستی اور خلوص کے رشتے قائم ہیں۔ دونوں
ملکوں کے دو طرفہ ی سطح پر باہمی احترام، دوستا تعاون پر مبنی ہیں۔

پاکستان سری لنکا کا بہترین وقتوں کا دوست ہے۔ مختلف زمانہ وقت اور حالات میں پاکستان سری لنکا کا باعتماد دوست ثابت ہوا ہے۔ اس پس منظر میں مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ ساؤتھ ایشین فرٹرنٹی۔ پاکستان نے گولڈن جوبلی تقریب منانے کے لئے لاہور میں فرینڈ شپ کیمپ قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس میں دیگر سارک ممالک نے شرکت پر آمادگی ظاہر کر کے ان امیدوں کو بڑھایا ہے۔ جن سے جنوبی ایشیاء میں باہمی اعتماد' بھائی چارہ اور استحکام پیدا ہوگا۔ اس اقدام سے بھارت و پاکستان کی حکومتوں میں امن قائم ہونے میں مدد ملی اس کے علاوہ جنوبی ایشیا میں معاشی ترقی اور خوشحالی آئے گی۔

ساؤتھ ایشین فرٹرنٹی کے اس فرینڈ شپ کیمپ کے موقع پر سری لنکا کے عوام اور حکومت کی جانب سے پاکستان کے عوام اور حکومت کو آزادی کی گولڈن جوبلی پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ ساؤتھ ایشین فریٹرنٹی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے' جس نے مجھے یہ پیغام آپ تک ارسال کرنے کا موقع دیا' میں آپ کی تنظیم کے منتظمین کی کاوشوں پر انہیں مبارکباد پیش کرتا ہوں اور دعاگو ہوں کہ خدا آپ کو اپنے نیک مقاصد میں کامیاب کرے اور اپنی رحمت کا سایہ قائم رکھے۔

ان پیغامات کے علاوہ بھارت کے ڈپٹی چیئرمین پلاننگ کمشن مادھو راندواتی اور ہیومین ریسورسز ڈیولپمنٹ منسٹر ایس آر بومائی نے بھی اپنے پیغامات ارسال کئے۔

اس موقع پر ایک بروشر شائع کیا گیا جس میں پاکستان کے تاریخ دان رائٹر ڈاکٹر مبارک علی' فریال علی گوہر اور جناب عبدالحمید خان کے مضامین شائع ہوئے۔ ڈاکٹر خالد جاوید جان کی نظم "آزادی کی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر" کافی مقبول ہوئی۔

دونوں کے ہاں فرقہ بندی
ملا اور پنڈت کی چاندی
اک کی قید میں ہے اسلام
اک کے ہاتھوں دکھی رام
دونوں کے ہیں دکھ سکھ سانجھے

کیدو حاکم، قیدی رانجھے

لیڈی Jocelyn Saeed کی نظم

This is the Time

Too late! Too late for legend!

Pathfinder rests on Mars today,

While affliction, like a shroud,

Silence what we would say.

It is n't easy going on .....

hosting echoes and relearning to speak

With the beleft and suffering .....

Once so strong: Now so week.

For fifty years we nurtured illusions

Knowing neither whence nor wither at might go

Waiting for the flowering of an image

a living image in which hope might grow

Till the rhythem nourished in the roots

Move like tonguee to help us hear

The sound that signals us to look at

and risk ourselves for peace.

Now is the time.

ایک نظم کا اردو ترجمہ
"شانتی نگر کا نوحہ"
میری رات دن کی پکار گھر کی تلاش میں
میرا گھر جو شہر سے مٹ گیا
میرا شہر جو
کڑی نفرتوں کے سمندروں میں اتر گیا
وہ قیامتیں تو گزر گئیں
مرے دل سے لرزہ نہ جا سکا
نہیں مٹ سکی
مرے ذہن سے یہ سبک سری
کہ میں کچھ نہیں
میرے دیس میں سبھی کچھ سہی
یہاں شانتی کا نگر نہیں
یہاں رینگتے ہیں وہ آدمی
ابھی جن کے کاندھوں پہ سر نہیں
مگر ایسی روح سفر بھی ہے
جو چلے تو ایسے کھنڈروں میں جا کر رکے گی
جس میں وہ لوگ ہیں
جو محبتوں کے امین ہیں
وہ ڈسے ہوئے شب زرد کے
ہیں مداوا اگر میرے درد کے
میرا درد جس میں دوا بھی ہے
اسی درد سے کسی شہر میں

کوئی انقلاب ہوا بھی ہے؟

انتی نگر پنجاب ٹی [redacted] یک بستی جسے مذہبی انتہا پسندوں نے جلا دیا)

دہلی میں 1995ء میں پاک انڈیا پیپلز فورم کے زیر اہتمام ایک کنونشن منعقد ہوا۔ اس کے 9 ماہ بعد لاہور میں اسی طرح کا ایک پاک بھارت کٹھ ہوا۔ جس میں دونوں جانب [redacted] نے شرکت کی۔

[redacted] میں پہلی مرتبہ اتنی بڑی تعداد میں بھارتی دانشوروں کو لاہور آنے کی [redacted]۔ اس تقریب کے انعقاد کے لئے انسانی حقوق کمشن کے موجودہ ڈائریکٹر آئی۔ اے رحمان اور پا[redacted] کے سابق وزیر خارجہ ڈاکٹر مبشر [redacted] کاوشیں شامل تھیں اس [redacted] " انہی باتوں کی تجدید کی گئی تھی جو گذشتہ سال دہلی میں طے پا[redacted] ئیں۔ یہ جنگ کا راستہ قبول نہیں۔ فوجی طاقت کو بڑھانے سے اجتناب کیا جائے اور 3 سال میں 25% تک افواج میں کمی کی جائے۔ ایٹمی اسلحہ [redacted] دیا جائے۔ دونوں ملک بارڈر سے اپنی اپنی افواج مناسب حد تک پیچھے ہٹ

بیلسٹک میزا[redacted]نے اور ز[redacted]نے پر پابندی۔ باہمی تجارت کا فروغ۔ بارڈر کے [redacted] تخریبی کاروائیوں [redacted] کا خاتمہ۔ کتب و رسائل کی آزادانہ [redacted] پابندیاں نرم کی [redacted] نرم رواداری کو ختم کرنا۔ جنگ [redacted] کا معاہدہ۔ کشمیر میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کو ختم کرنا۔ بھارت اپنی [redacted] کشمیر سے واپس [redacted] کشمیر کے مسئلے کو جمہوری طریقے سے حل کیا جائے۔

کشمیر ورکنگ گروپ میں میری اس تجویز کو رپورٹ میں شامل کیا گیا کہ کشمیر کے مسئلے کے حل کے لئے کشمیریوں کو بھی مذاکرات میں شامل کیا جائے

مسئلہ کشمیر

ہم نے دیکھ لیا کہ دونوں ملکوں کی حکومتیں پچاس سالوں میں مسئلہ کشمیر کو حل کرنے میں ناکام رہی ہیں۔ ان کے درمیان اگر کبھی مذاکرات ہوئے بھی تو وہ بے نتیجہ ہی رہے۔ دونوں ملک تین جنگیں بھی لڑ چکے ہیں۔ لیاقت نہرو پیکٹ ہوا۔ جس میں طے ہوا کہ دونوں ملک مذاکرات کے ذریعے امن کے قیام کی کوشش کریں گے۔ جنگ سے گریز کیا جائے گا۔ افہام و تفہیم کی فضاء پیدا کر کے اختلافی مسائل کا حل نکالا جائے گا۔

کشمیر کے مسئلے پر دونوں رہنما کسی اتفاق رائے پر نہ پہنچ سکے اور کشمیر کے مسئلے کے مسودے پر دستخط ثبت نہ ہوئے۔ ساٹھ کی دہائی میں انڈس بیسن واٹر ٹریٹی اور تاشقند معاہدہ پر دستخط ہوئے۔ لیکن بھارتی وزیر خارجہ سردار سورن سنگھ اور پاکستانی وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو کشمیر کے مسئلے پر پیش رفت نہ کر سکے۔ 1971ء میں دونوں ملکوں نے شملہ معاہدہ اور سلال ڈیم پر دستخط کئے۔ لیکن کشمیر کے مسئلے پر جمود طاری رہا۔ 1980ء کی دہائی میں دونوں ملک امن' دوستی' تعاون اور ایک دوسرے پر جارحیت نہ کرنے کے ایک مسودے پر اتفاق کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ لیکن سیاسی عدم استحکام اور جرات کے فقدان نے انہیں آگے نہیں بڑھنے دیا۔ کشمیر کا فیصلہ پاکستان اور بھارت کی انٹیلی جینس ایجنسیاں' اسٹیبلشمنٹ اور فوج نہیں کرنے دیتی۔

کشمیر کا مسئلہ زمین کا نہیں ہے۔ جغرافیائی محل وقوع کا نہیں۔ سرسبز و شاداب میدانوں' وادیوں خوبصورت پہاڑوں نہروں چشموں اور دریاؤں کا نہیں۔ یہ تو خالصتاً" انسانی مسئلہ ہے۔ انسانوں کے حقوق کا۔ ان کی تمناؤں' خواہشوں' امنگوں رشتوں اور زندگیوں کا۔ اس مسئلے نے دونوں ملکوں سے غربت کو ختم نہیں ہونے دیا۔ اسلحہ کے ڈھیر لگوا کر' راکٹوں' بموں' ٹینکوں جہازوں کے انبار جمع کروا کے ان کی اقتصادیات کو

چاٹ لیا ہے۔ کشمیر کا مسئلہ ایک ایسی دلہن کا روپ دھار چکا ہے جس کے دو دعویدار ہیں۔ لیکن خود اس سے نہیں پوچھا جاتا کہ وہ کیا چاہتی ہے۔

حالیہ چند برسوں میں دونوں ملکوں کے امن چاہنے والے عوام کی سوچ اور فکر میں یکسانیت اور کئی پہلوؤں پر ایک جیسا نقطۂ نظر سامنے آیا ہے دونوں ملکوں کے عوام اس بات کے شدید خواہشمند ہیں کہ مسئلہ کشمیر جمہوری طریقے سے پاکستان بھارت اور کشمیریوں کے اتفاق رائے سے حل ہو جائے۔ عوام نے محسوس کیا کہ دونوں ملکوں کی حکومتیں کمزور ہیں۔ ان کے سیاسی لیڈر بڑے سیاسی فیصلے کرنے کی ہمت نہیں رکھتے حکومتیں جب اندرونی خلفشار اور مسائل کے دباؤ میں آتی ہیں۔ تو عوام کی توجہ بدلنے کے لئے ایک دوسرے کے خلاف سیاسی بیان بازی شروع کر دیتی ہیں۔ عسکری نوعیت کے بیان دے کر لوگوں کے جذبات ایک دوسرے کے خلاف بھڑکاتی ہیں۔ جس سے فضاء کشیدہ ہو جاتی ہے۔ حالانکہ یہی سیاسی لیڈر جب نجی طور پر یا سرکاری میٹنگوں میں مذاکرات کرتے ہیں۔ تو ان میں یکسانیت ہوتی ہے۔ وہ امن و بھائی چارے کے فروغ کی بات کرتے ہیں۔ اور جب یہی لیڈر پبلک میں جاتے ہیں تو ان کے بیانات کچھ اور ہوتے ہیں۔ خود نواز شریف نے کہا کہ ہم آئی کے گجرال کی مجبوریوں کو سمجھتے ہیں۔ وہ ہماری مجبوریوں کو جانتے ہیں۔

سیاچین گلیشیئر کے مسئلے پر مذاکرات میں دونوں ملکوں کے خارجہ سیکرٹریوں کی سطح پر تسلیم کیا گیا کہ سات ہزار فٹ بلندیوں پر بے مقصد جانی و مالی نقصان ہو رہا ہے اور ابھی تک وہاں تیرہ سو سے زائد فوجی جوان اپنی جانیں کھو چکے ہیں۔ دونوں ملک ایک معاہدے پر دستخط کے قریب تھے لیکن ایسا ممکن نہ ہو سکا۔ نواز شریف نے جرات کر کے کہا کہ دونوں ملک سیاچین سے اپنی افواج واپس بلالیں گے لیکن پاکستان کے آرمی چیف نے اگلے ہی روز بیان دیا کہ فوجیں واپس نہیں بلائی جائیں گی۔ اسی طرح جنوبی ایشیاء سربراہی کانفرنس میں نواز گجرال ملاقات کے موقع پر نواز شریف نے کہا تھا کہ بھارت اور پاکستان جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کریں۔ بھارت کے ساتھ اس طرح کی

کوششوں کو اسٹیبلشمنٹ اور فوج نے زیادہ پسند نہیں کیا۔ نواز شریف نے بھارتی وزیراعظم کے ساتھ تین بار ذاتی ملاقاتیں کیں۔ جس سے عوام کی سطح پر ثقافتی اور تجارتی وفود کا تبادلہ شروع ہوگیا۔ ہماری اسٹیبلشمنٹ بھارت کے عزائم کے بارے میں مطمئن نہیں رہتی۔ شک میں رہتی ہے۔ اسی طرح بھارت کی بیوریوکریسی دو طرفہ تعلقات کو معمول پر لانے میں رکاوٹ ہے۔ پاکستان میں وزیراعظم سیکرٹریٹ نے دو مرتبہ جنرل ہیڈ کوارٹر سے چیف آف آرمی سٹاف کے بیان پر وضاحت طلب کی۔ سابق صدر لغاری کے آفس کے ذرائع نے کہا کہ لغاری نے ذاتی طور پر نواز شریف کو کہا کہ وہ بھارت کے ساتھ اپنے تعلقات کو بہتر بنانے کی پالیسی میں احتیاط سے کام لی۔ نواز شریف نے ایک انٹرویو میں اس سوال کا جواب دینے سے انکار کیا کہ اسٹیبلشمنٹ ان کی حکومت کی بھارت کے ساتھ بہتر تعلقات کی پالیسی کی حمائت کرتی ہے یا نہیں۔ البتہ انہوں نے یہ کہا کہ کشمیر کے مسئلے کا حل جنگ نہیں بلکہ مذاکرات ہیں۔ اسی طرح بھارت کی مسلح افواج کے نئے سربراہ نے عہدہ سنبھالتے ہی تندو تیز بلکہ جارحانہ بیانات دینے شروع کر دئے اور پاکستان کو سیدھی دھمکیاں دینے لگے۔ ان کے یہ بیانات گجرات حکومت کی پالیسی کے خلاف تھے۔

لاہور کنونشن میں کشمیر کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے میں نے یہ تجویز دی تھی کہ کشمیر کے مسئلے پر پاکستان بھارت اور کشمیری رہنماؤں پر مشتمل کمیٹی تشکیل دی جائے جو جموں کا دورہ بھی کرے اور اپنی رپورٹ مرتب کرے۔ جب تک کشمیریوں کو مذاکرات میں شامل نہیں کیا جاتا اس مسئلے کا حل ممکن نہیں۔ میری تجویز کو جنرل ہاؤس میں منظوری کے بعد رپورٹ کا حصہ بنا لیا گیا۔

شورش زدہ ریاست کشمیر کے عوامی رہنماؤں کو اس کمیٹی میں شامل کرنے میں عملی رکاوٹوں کا بہانہ بنایا گیا۔ بھارت نے اپنے طور پر ایک کمیٹی بنائی جس نے جموں میں جاکر حالات کا جائزہ لیا اور ایک رپورٹ مرتب کی۔ اس رپورٹ میں بھارت پر سخت تنقید کی گئی تھی۔ جس کی وجہ سے بھارت کے فورم میں سخت اختلافات پیدا ہوگئے اس

رپورٹ کو دبالیا گیا اور کلکتہ کنونشن میں اس کا ذکر تک نہیں ہونے دیا گیا۔

میں نے اپنی تقریر میں کشمیر کمیٹی میں کشمیری رہنماؤں کو شامل نہ کرنے پر سخت تنقید کی اور کہا کہ کشمیر میں بھارت نے زبردستی بندوق کی نوک پر انتخابات کروائے ہیں جسے بین الاقوامی رائے عامہ نے بھی رد کر دیا ہے۔ میں نے اپنی اس تجویز کو دہرایا کہ ہمیں مذاکرات میں کشمیر کے نمائندہ افراد کو شامل کرنا ہوگا۔ ڈاکٹر مبشر حسن نے میری تجویز اور تنقید پر خاموشی اختیار کی۔ اگرچہ کشمیر کے معاملے میں بھارت پر اخلاقی ذمہ داری کا بوجھ زیادہ ہے۔ لیکن ہمیں امن کے قیام کے لئے اپنی کوششوں میں پیچھے نہیں رہنا چاہئے اور بھارت کو یہ سمجھ لینا ہوگا کہ کسی چھوٹے سے خطہ زمین پر زبردستی قبضہ برقرار رکھنے سے وہ فوجی اور اقتصادی اعتبار سے مضبوط نہیں ہو جائے گا۔ پاکستان کی مذہبی جماعتوں کو بھی کشمیر کے مسئلے کو پر امن طریقوں سے حل کرنے کی بات کرنا ہوگی۔ جہادی ٹریننگ کیمپ قائم کر کے کشمیر میں گوریلا کاروائیوں کی کوشش کی گئی تو مسئلہ مذاکرات کے ذریعے حل کرنے میں دشواری ہوگی۔ ہم سب جانتے ہیں 50 سالوں سے کشمیر پر غیر اعلانیہ جنگ جاری ہے جو ناتمام ہے اس کا فوجی یا گوریلا کاروائی کا حل ڈھونڈنے کی کوششیں جاری رہیں تو یہ جنگ ناتمام چلتی رہے گی۔ جس کا کوئی فاتح بنے گا نہ مفتوح۔ گذشتہ 50 سالوں میں دونوں اطراف کی فائرنگ سے پچاس ہزار سے زائد شہری ہلاک ہو چکے ہیں۔

پاک بھارت تجارت

لاہور میں میری کوششوں سے پاک بھارت تجارت پر ایک زور دار سیمینار منعقد ہوا۔ بھارت پاکستان کے ساتھ تجارت کی ضرورت پر بہت زور دیتا آیا ہے۔ کئی بھارتی دانشوروں نے اس بات کا برملا اظہار کیا ہے کہ پاکستان کے ساتھ معمول کے تعلقات قائم ہونے کا سب سے بڑا ذریعہ تجارت ہے۔ باہمی دو طرفہ تجارت کا آغاز اور فروغ دونوں ملکوں کی اقتصادی صورت حال میں بہتری پیدا کر سکتا ہے۔ دونوں ملکوں کی

نفسیات کا تجزیہ کرنے والے ماہرین اور اہل فکر کا کہنا ہے کہ ایک مرتبہ تجارت شروع ہو جائے تو سب کچھ نارمل ہو جائے گا۔ سیاسی و نفسیاتی کھچاؤ میں کمی واقع ہوگی۔ جب تجارت بڑھے گی تو دونوں ملکوں کے بارڈر کے ساتھ ساتھ بستیاں آباد ہوں گی۔ تاجر کی نظر اپنے سرمائے اور نفع پر ہوتی ہے۔ وہ کب چاہے گا کہ جنگ ہو اور اس کا سرمایہ اور پراپرٹی خطرے میں پڑ جائے۔ اس طرح وار سائیکی (جنگ کی نفسیات) ختم ہو جائے گی۔

ان باتوں سے قطع نظر زمینی حقائق کیا ہیں بھارت اور پاکستان کی براہ راست تجارت سے کس کا کتنا فائدہ اور کتنا نقصان ہے۔ ہماری انڈسٹری بھارت کے مقابلے میں بہت کم اور بہت پیچھے ہے۔ ہمارا صنعتکار اپنی مصنوعات کو مہنگے داموں بیچتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ بھارت کی سطح پر ہم اپنی چیزوں کو لاہی نہیں سکتے ورنہ ہمارے کارخانے بند ہو جائیں گے اور یہاں ہر طرف بھارتی مصنوعات چھا جائیں گی۔

دراصل 1947ء کے بعد پاکستان میں صنعتکاروں نے اپنے کارخانے اور فیکٹریاں لگاتے وقت یہ فرض کر لیا تھا کہ بھارت کے ساتھ اب کبھی پاکستان کی تجارت ہو ہی نہیں سکتی۔ انہوں نے اسی حساب کی منصوبہ بندی کی۔ وہ اس پہلو کو بھول گئے کہ کبھی ایسا وقت بھی آسکتا ہے جب ان کی تیار کردہ مصنوعات قریبی ہمسایہ ملک کی پروڈکٹس سے مقابلے پر آکھڑی ہوں گی۔ ہمارا سرمایہ دار اس مقابلے کا عادی نہ تھا۔ وہ اپنی من مانی سے نفع کا تعین کر لیتا ہے۔ حالات اور وقت تیزی سے بدلے تو معاشیات کا پہلو سب سے زیادہ اہمیت اختیار کر گیا۔ صارفین سیانے ہوگئے۔ انہیں ضرورت کی سستی اور مہنگی چیزوں کا ادراک اور شعور بڑھ گیا۔ دراصل یہ گراؤنڈ Reality ہے۔ ایک Compultion ہے۔ معاشیات کے اپنے اصول ہوتے ہیں۔ ان کی اپنی ضرورتیں ہوتی ہیں۔ آج کے دور میں حکومتیں ان معاشی اصولوں کو نظر انداز کر کے اپنی پالیسیاں وضع نہیں کر سکتیں۔

جب معاشی ضرورتوں کو بروئے کار لانے کے لئے حکومتوں پر دباؤں بڑھا تو پاک

بھارت تجارت کا موضوع اہمیت اختیار کر گیا۔ جس پر بحث و مباحثے کا آغاز ہو گیا۔

کیا مسئلہ کشمیر کے حل کے بغیر پاک بھارت تجارت ہونی چاہئے۔ اس بات پر پاکستان میں مکالمہ مباحثہ اور تکرار چلتی رہتی ہے میری ذاتی کوششوں سے لاہور میں پاک بھارت تجارت کے موضوع پر ہونے والے سیمینار میں سماجی' سیاسی شخصیات اور چیمبر و انڈسٹری کے افراد نے بڑی تعداد میں شرکت کی اور معاشیات کے ماہرین نے اظہار خیال کیا۔

اکثریت نے بھارت کے ساتھ تجارت کے حق میں رائے دی اور کہا کہ بھارت کے ساتھ تجارت میں پاکستان اور بھارت دونوں کا فائدہ ہے۔ ہمیں اقتصادی ترقی کیلئے جرات مندانہ فیصلے کرنے ہوں گے۔ پاکستانی تاجر بھارت سے خوفزدہ نہ ہوں اس کی منڈی پر قبضہ کریں۔ ہمارے صنعتکار نہیں چاہتے کہ بھارت سے مقابلے کی فضاء پیدا ہو اور عوام کو سستی اشیاء ملیں۔ لیکن صنعتکاروں کو اعتماد میں لئے بغیر بھارت سے تجارت مناسب نہیں۔ کیا بھارت کے ساتھ تجارت پاکستان کے خلاف سازش ہے۔ ہمیں سازش کی تھیوری سے نکل کر معاملات کا حقیقت پسندانہ تجزیہ کرنا ہو گا۔

بھارت کو اگر 14 کروڑ آبادی کی منڈی ملے گی۔ تو پاکستان کو بھی 90 کروڑ آبادی والی منڈیٔ ملے گی۔ سیمینار میں یہ کہا گیا کہ بھارت کے ساتھ تجارتی تعلقات کے حوالے سے عوام کے ذہنوں میں کچھ خدشات ہیں جنہیں دور کرنا چاہئے۔

پاکستان ہانگ کانگ اور دبئی کے راستے بھارت سے اشیاء درآمد کرتا ہے۔ جس پر اس کا بہت سا روپیہ خرچ ہوتا ہے۔ یہی اشیاء اگر واہگہ بارڈر سے منگوائی جائیں تو بہت زیادہ بچت ہوگی۔

ایسی مثالیں موجود ہیں کہ دنیا کے کچھ ممالک آپس میں تنازعات میں الجھے رہے۔ ان میں دشمنیاں قائم ہوئیں اور لڑائیاں بھی ہوئیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ دو طرفہ تجارت بھی چلتی رہی۔ روس امریکہ اور مشرقی و مغربی جرمنی' امریکہ اور ویتنام' فرانس اور اٹلی' جاپان اور کوریا وغیرہ۔ اگر اردن اسرائیل کے ساتھ تجارت کر سکتا ہے تو

پاکستان بھارت کے ساتھ کیوں تجارت نہیں کر سکتا۔

مذہبی رواداری:

پاک بھارت عوام کی سطح پر ڈائیلاگ لاہور' کلکتہ' امرتسر' دہلی اور پشاور میں ہوئے۔ ان میں دیگر امور کے علاوہ مذہبی رواداری کا مسئلہ ہمیشہ ایجنڈے میں شامل رہا۔ اس پر کمیٹیاں بنیں۔ بحث و تمحیث اور مذاکرات ہوئے۔ جس میں پنڈت اور علماء بھی شریک ہوئے۔ ورکنگ گروپ قائم کئے گئے۔ دراصل دونوں ملکوں کو بڑھتی ہوئی مذہبی عدم رواداری کے مسئلے کا سامنے ہے جس کی وجہ سے دونوں ملکوں میں بسنے والی اقلیتوں کے حقوق بری طرح پامال ہو رہے ہیں۔ انہیں مذہب کے نام پر کچلا جا رہا ہے۔

بدترین اور افسوسناک صورت حال نے اس وقت جنم لیا جب بھارت کے شہر ایودھیا میں 6 دسمبر 1992ء کو بابری مسجد کو ہندوؤں کی انتہا پسند اور کٹر مذہبی جماعتوں نے شہید کردیا۔ جس کے ردعمل کے طور پر پاکستان اور بنگلہ دیش میں مندر گرائے گئے۔ بابری مسجد شہید کر کے بھارت کے سیکولر آئین کی روح اور تشخص کو سخت دھچکا لگا اور اسے دنیا بھر میں ہزیمت اور شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا۔

1506ء میں پہلی پانی پت کی لڑائی میں ابراہیم لودھی کو شکست دے کر بابر نے دہلی کے تخت پر قبضہ کر لیا اس کے ایک جرنیل اعظم خان نے یوپی کے علاقے میں دریائے جمنا عبور کر کے اودھ Avad کا علاقہ اپنے قبضے میں لے لیا۔ اس نے وہاں ایک مسجد تعمیر کروائی جو بابری مسجد کے نام سے مشہور ہوئی۔ ہندوؤں کا کہنا ہے کہ بابر کے آنے سے پہلے ہی ایودھیا میں مندر موجود تھا جہاں لارڈ رام نے جنم لیا۔ بابر نے جب یہ علاقہ فتح کیا تو مندر کی جگہ مسجد تعمیر کروائی گئی۔ ہندوؤں کے بقول 1948ء میں یہاں بت رکھ دیئے گئے تھے اور اب عبادت کا حق انکا ہے۔ ہم بالکل اسی جگہ اپنا مندر تعمیر کریں گے۔ مسلمان کہتے ہیں کہ اس جگہ کبھی مندر نہ تھا۔ یہ مسجد 450 سال پہلے تعمیر ہوئی

اور ہم اسی جگہ اسی مسجد میں عبادت کریں گے۔

1948ء میں جب اس مسجد میں بت رکھ دئے گئے تو تنازعہ بہت بڑھ گیا اور یہاں تالے لگانے پڑے۔ اس وقت سے یہاں مسلمان یا ہندو کوئی بھی عبادت نہ کر سکا۔

کچھ سال پہلے بھارتیہ جنتا پارٹی نے دیگر جماعتوں کے ساتھ مل کر مسجد کو گرا کر مندر بنانے کی مہم شروع کی۔ کانگریس کے دور اقتدار میں اتر پردیش کے صوبے کی حکومت نے ملی بھگت سے مسجد کو گرا دیا اور مندر کی تعمیر شروع کر دی۔ جس پر فسادات شروع ہوگئے اور کئی جانیں ضائع ہوگئیں۔ الہ آباد ہائی کورٹ نے مندر کی تعمیر روکنے کا حکم دیا۔ لیکن اس پر عمل درآمد مشکل ہوگیا۔ قانون کی دھجیاں اڑتی رہیں۔ سپریم کورٹ نے الہ آباد ہائی کورٹ کے حکم کی توثیق کر دی اور اب وہاں تعمیر کا کام رک گیا ہے۔

کیا یہ کوئی قانونی تنازعہ ہے۔ کیا یہ تاریخی سچائی کا مسئلہ ہے۔ کیا یہ سیاسی پاور گیم ہے۔ کیا چند گز کے فاصلے پر مندر نہیں بن سکتا۔ کیا مندر بنانے کے لئے کسی کی عبادت گاہ کو گرانا جائز ہے۔ بی جے پی بھارت کے بچوں کو کیا سبق دینا چاہتی ہے۔ کیا مذہب کا تقاضا یہ ہے کہ بتوں کی پوجا کیلئے قانون اور امن کی پرواہ نہ کی جائے؟ وہ بھارت کی اقلیتوں کو پاؤں تلے روند رہے ہیں۔ بھارت مذہبی ریاست نہیں۔ اسے مذہبی ریاست کا درجہ دینے کی کوشش سے بھارت کے اقتدار اعلیٰ اور وحدت کو نقصان پہنچے گا۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ بھارتیہ جنتا پارٹی کے منشور میں بابری مسجد کی جگہ رام مندر کی تعمیر کا وعدہ کیا گیا ہے۔ بقول شبانہ اعظمی بابری مسجد کی شہادت سے یوں لگا جیسے بھارت میں مسلمان ہونا جرم ہو۔ جب مسلمان انتہا پسندی یا سکھ انتہا پسندی بھارت کے لئے خطرہ سمجھی جا سکتی ہے تو ہندو انتہا پسندی کیوں نہیں۔ BJP نے اقلیتوں کے بارے میں پالیسی بدل لینے کی جو بات کی ہے وہ غلط ہے۔ وہ ساٹھ سالوں سے مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈہ کرتی آرہی ہے۔ اگرچہ سونیا گاندھی نے بھارت کے مسلمانوں سے بابری مسجد کی شہادت پر کانگریس کی جانب سے معافی مانگی ہے لیکن یہ

محض تسلی ہے۔ پاکستان کے ہا قاضی ا ے بابری مسجد کی
کردار بال ٹھاکرے سے ملاقات کی تو انہوں ۔ نہ مسج نہ مندر،
نیشنل قو ا گار تعمیر کردی جائے۔

ہمارے وفد کو ایک فلم دکھائی گئی۔ جو بابری مسجد گرائے جانے
سال پہلے کی مہم جوئی پر بنائی گئی تھی۔ جس میں انتہا پسند ہندو بال ٹھاکر ان کی
ت اور دیگر مذہبی جبر کے گوں کو رام مندر کی تعمیر کیلئے جلسے جلوس
کیا۔ اس فلم میں ہندوؤں ۔ تہا پسند لیڈروں، ش یوں اور بابری مسجد کے
امام اور وہاں نماز پڑھنے والے مسلمانوں کے انٹرویو د گئے تھے۔ ہمارے ایک
دوست ویڈیو 250 رو زیدلی۔ وا گہ با ں ویڈیو کرنے
د روک لیا گیا۔ کسٹم حکام کا لہ اس سے پاکستان میں بھارت کے خلاف
ڈہ بڑھے گا۔ میں نے کسٹم آفسر میں لیا اور کہا کہ یہ فلم آپ ہی کے
ملک میں ہمیں دکھائی گئی اور ہم وری جذبے کی قدر بھی کرتے ہیں۔ ہم بھارت
کشیدگی نہیں کم کرنا چاہتے ہیں اور اسی لئے یہاں آئے تھے۔ اس فلم کو
میں دکھ نے سے سچ کے اظہار کی اس جرات من
مذہبی انت کا عمل، خواہ کہیں بھی ہو۔۔ تاہ
آفیسر کو قائل کرنے میں
ر وہ ویڈ

حال ہی میں امام کعبہ شیخ ثد السب بھارتی مسلمانوں کو مشورہ دیا
ہے کہ اگر ایود جد واقعی ایک من مسجد
کی دوبارہ تعمیر ر دیں۔ انہوں ۔ یہ پر دو روزہ
عالمی کانفرنس ۔ انہوں نے کہا کہ مسلمان تاریخ کی چھان بین
میں متنا پر مسجد کی تعمیر کے لئے پر تشدد طریقے اپنانے یا جہاد کر
ست خلاف ہوا
بھارت میں ivities (Terrorist and Dis کے قانون کے

ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ مذہبی آزادی سلب کی گئی۔ انسانی حقوق کی پامالی ہوئی۔ اقلیتوں' ٹریڈ یونینوں اور سماجی خدمت کے اداروں سے منسلک افراد کو کچلنے کے لئے اس ظالمانہ قانون کا بے دریغ استعمال کیا گیا۔ حکومتی و شہری سطح پر مذہب کی بنیاد پر امتیاز برتا جا رہا ہے۔ اقلیتوں کو ملازمتوں میں برابری کا درجہ نہیں ملتا۔ حالانکہ بھارتی قانون اس کی اجازت نہیں دیتا۔ بھارت میں سیکولر آئین کی موجودگی میں مذہبی انتہا پسند جماعتیں روز بروز مضبوط کیوں ہوتی جا رہی ہیں۔ انہیں عوام میں پذیرائی کیوں مل رہی ہے۔ وہ پارلیمنٹ میں اتنی بڑی تعداد میں کیوں پہنچ جاتی ہیں۔ یہ اہم سوال ہمارے وفد میں شامل ڈاکٹر عمر خان نے بھارتی دانشوروں کے ساتھ ایک میٹنگ میں اٹھایا تھا۔ ایک بھارتی نے کہا یہ کہنا غلط ہے کہ عوام نے اپنے سیکولر مزاج کو بدل لیا ہے۔ دراصل کٹر مذہبی جماعتوں کی الیکشن میں کامیابی کی وجہ لبرل اور سیکولر جماعتوں کے آپس کے اختلافات ہیں۔ انہوں نے کہا بابری مسجد گرائے جانے کے بعد BJP کو الیکشن میں کئی صوبوں میں ناکامی ہوئی تھی۔ BJP کا پول کھل چکا ہے اگلے الیکشن میں وہ بہت کم نشستیں جیت سکے گی۔ ہم نے ان کے خیالات سے زیادہ اتفاق نہیں کیا۔ کلدیپ نیر کے بقول بھارتیہ جنتا پارٹی بھارت میں ہندو راج لانا چاہتی ہے۔ وہ دوسری تمام اقلیتوں کو خالص ہندوستانی بنانا چاہتی ہے۔ اس نے اپنے منشور میں مہا بھارت کے قیام کی خوشخبری دی ہے۔ برما سے افغانستان تک اور بنگلہ دیش سے انڈونیشیا تک مہا بھارت کے نقشے میں شامل ہیں۔ بی جے پی حکومت کے دور میں انتہا پسندی کے رجحانات میں بے انتہا اضافہ ہو چکا ہے۔ فلم فائر کے خلاف رد عمل میں سینماؤں پر حملے ہوئے۔ دیپ کمار کے گھر نیم برہنہ ہو کر مظاہرہ کیا گیا۔ پاکستان کی کرکٹ ٹیم کے دورے کو ناکام بنانے کے لئے گراؤنڈ میں پچ اکھاڑ دی گئی۔ صوبہ بہار میں عیسائیوں کے گرجا گھروں پر حملے ہوئے۔ انہیں جلا دیا گیا۔ عیسائی راہب قتل کر دئے گئے۔

پاکستان میں مذہبی و نیم مذہبی سیاسی جماعتوں کو الیکشن میں عوام کی جانب سے پذیرائی نہیں ملتی۔ اسمبلیوں میں وہ 3% سے زیادہ نہیں پہنچ پاتے۔ اس کے باوجود

معاشرے میں وہ طاقتور عنصر کے طور پر موجود ہیں اور ہر حکومت کو اپنی حکومت کی مضبوطی کے لئے انہیں کسی نہ کسی طور ساتھ ملا کر رکھنے کی ضرورت رہتی ہے۔

1973ء کے آئین کے مطابق تمام قوانین کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے لئے اسلامی نظریاتی کونسل تشکیل دی گئی۔ فوجی ڈکٹیر جنرل ضیاء الحق نے اس میں بہت سی تبدیلیاں کیں۔ سپریم کوٹ کی موجودگی کے باوجود فیڈرل شریعت کورٹ کی تشکیل کی گئی۔ اس کے علاوہ فوری سماعت کی عدالتیں بنائی گئیں۔ اس طرح ایک ہی وقت میں کئی طرح کے عدالتی نظام سے پیچیدگیاں پیدا ہوگئیں۔ فیڈرل شریعت کورٹ نے اکثر حکومت کو ہدایات بھیجیں کہ وہ مختلف سول و فوجداری قوانین اسلام کے مطابق بنائے۔ ارتکاب جرم پر انصاف مہیا کرنے کے لئے یہ اصول وضع ہوا کہ اگر کوئی شخص کسی کو قتل کر دے تو اس کے لواحقین کے معاف کرنے یا معاوضہ (خون بہا) ادا کرنے کی صورت میں اسے رہا کر دیا جائے۔ لیکن توہین رسالت (Blosphmy Law) کے مرتکب شخص کو ثبوت مل جانے پر پھانسی کی سزا دی جائے گی۔ سیاسی جماعتوں کی عدم دلچسپی اور عوامی سطح پر جمود اور بے حسی نے اس طرح کے سخت گیر قوانین بننے میں رکاوٹ نہ ڈالی۔ اس طرح کے قوانین نے مذہبی بنیاد پرستی خوف گھٹن اور تعصب کی فضاء پیدا کر دی۔ توہین رسالت کا غلط اور بے جا استعمال ہوا۔ جس کے افسوسناک نتائج نکلنے شروع ہوئے۔ ذاتی مخالفت' دشمنی یا شک کی بنا پر غیر مسلم اقلیت کے افراد پر فرد جرم عائد کر دی گئی۔ عدالتی چارہ جوئی کے دوران بھی خوف کی فضاء پیدا ہوئی۔ توہین رسالت کے کیسوں میں اکثر اقلیتی مذہب کے ماننے والوں کو ہی انتقام کا نشانہ بنایا جاتا رہا۔ ایک عیسائی نوجوان توہین رسالت کیس میں ضمانت پر رہائی کے بعد قتل کر دیا گیا۔ ایک عیسائی نوجوان کو اس جرم میں ضمانت پر رہائی ملتے ہی حکومت نے ملک سے باہر بھجوا دیا کہ مبادا اسے بھی قتل نہ کر دیا جائے۔

قانون میں اس بات کی وضاحت یا تشریح سرے سے موجود ہی نہیں کہ توہین رسالت کا تعین کس طرح ہوگا اور اس کا فیصلہ کون کرے گا۔

ایک قصبے میں مسجد کے لاؤڈ سپیکر پر یہ اعلان ہوا کہ محلے کے ایک شخص نے توہین رسالت کا ارتکاب کیا ہے اس اعلان کو سننے کے بعد محلے کے بعض لوگوں نے اس شخص کے گھر پر حملہ بول دیا۔ اس پر تشدد کرنے کے بعد اسے سکوٹر کے پیچھے باندھ کر سڑکوں پر گھسیٹا گیا جس سے وہ مر گیا۔ بعد میں تحقیق کرنے پر پتا چلا کہ محلے کی مسجد کے امام سے اس کی کھٹ پٹ تھی۔ پولیس نے مقدمہ درج کر کے کاروائی ڈالنے کے لئے کچھ گرفتاریاں کیں۔

ایک عیسائی مذہبی رہنما پاکستان کے دورے پر آئے تو انہوں نے بیان دیا کہ توہین رسالت کی سزا میں تخفیف ہونی چاہئے تا کہ اس سخت قانون کو اقلیتوں کو دبانے یا حراساں کرنے کے لئے استعمال نہ کیا جا سکے۔ اس پر پاکستان کے علماء نے سخت رد عمل کا اظہار کیا اور کہا کہ اگر حکومت نے ایسا کیا تو اسے تسلیم نہیں کیا جائے گا اور ہم خود توہین رسالت کرنے والے کو قتل کر دیں گے۔ پاکستان کے علماء کا کہنا ہے کہ توہین رسالت اگر غلطی سے بھی ہو تو اس کی معافی نہیں۔ اس کی سزا صرف موت ہے۔ پاکستان میں مذہبی انتہا پسندی کے رجحانات اتنے وسیع اور گہرے ہو چکے ہیں کہ کوئی بات سننے اور سمجھنے کو تیار نہیں۔ مذہبی عدم رواداری نے ایسی فضاء پیدا کر دی ہے کہ بات چیت اور ڈائیلاگ کی گنجائش کم ہے۔

اسلام میں ایسے مسائل جو زمانہ اور وقت کی تبدیلی کے ساتھ جنم لیں انہیں اس وقت کے حالات میں پرکھنے سمجھنے اور ان میں مطابقت پیدا کرنے کی سہولت رکھی گئی ہے جسے اجتحاد کا نام دیا گیا ہے۔ گذشتہ کئی صدیوں سے اسلامی معاشروں میں سوچ بچار اور فکر و اجتحاد کے دروازے بند پڑے ہیں۔ جس کی وجہ سے جمود طاری ہے۔ علماء کے بیانات تقریروں اور تحریروں سے فروعی مسائل جنم لیتے ہیں۔ فرقہ واریت کو ہوا ملتی ہے۔ تنگ نظری اور تعصب پھیلتا ہے۔ قائداعظم ان علماء کی دسترس سے محفوظ نہ رہے۔ اسی لئے علماء کے بارے میں خود بھی محتاط رہے اور دوسروں کو بھی محتاط رہنے کی تلقین کرتے رہے۔

پاکستان کے ایک دانشور محمود مرزا نے جسٹس آ[illegible]ین کے حوالے سے کہا
[illegible] جسٹس مولو[illegible] حسین [illegible] کہ قائداعظم ایک دفعہ علی گڑھ تشریف
لا[illegible]لم کے علماء دین کے بارے استفسار کرنے پر جناح نے کہا۔

My Boys, give them [illegible]ssible respect. But do not let them Come near you Or you w[illegible] destroyed.

نواز شریف نے اپنے [illegible]ت میں مذہبی جماعتوں کی ناراضگی سے بچنے اور ا
کی حمائت حاصل کرنے کے لئے توہین رسالت آرڈیننس کو باقاعدہ قانون کا
دیا۔ اسے 1986ء میں ایک پارلیمنٹ ایکٹ کے ذریعے پاکستان پینل کوڈ کا حصہ بنایا
تھا۔ پاکستان میں تو[illegible]ت کا قانون متنازعہ رہا ہے۔ اکثر [illegible] بھی مذہبی دہشت
گردی سے اپنی جان کا خطرہ رہتا ہے۔ اس لئے وہ [illegible]سالت کے کیس لینے سے
پہلے بہت کچھ سوچ[illegible] سلامت مسیح کیس میں توہین رسالت کے ملزمان کو
بری کرنے پر بعد میں [illegible] کر دیا گیا۔ سلامت مسیح ایک عیسائی نوجوان تھا جس
کی عمر 15 سال تھی۔ اس پر الزام تھا کہ اس نے کاغذ پر آنحضرت [illegible] میں توہین
آمیز الفاظ لکھ کر مسجد میں پھینکے [illegible] پر لکھائی اتنی خوبصورت تھی کہ [illegible]ھ
سلامت مسیح ایسی تحریر لکھ ہی نہیں سکتا تھا۔ اسی طرح خانپور میں 25 سالہ نوجوان کو
توہین رسالت کے الزام میں سزائے موت سنائی گئی۔ وہ بالکل ان [illegible]ہے۔ اس
الزام [illegible] مئی 1995ء میں قصبہ فتح پور کمال میں ایک پرائیویٹ [illegible]ل میں ا
نے آنحضرتؐ کی شان میں گستاخانہ الفاظ استعمال کئے تھے۔ وہ اس ہوٹل میں ویٹر تھا
اس کی ذات جوگی ہے۔

توہین رسالت قانون کی بڑی خامی یہ ہے کہ اس میں [illegible]یت کے اہم عنصر کو نظرانداز
کر دیا گیا ہے۔ مولانا وحید الدین نے اپنی کتاب "[illegible]ں کا مسئ[illegible] تحقیق کے
بعد یہ بات درج کی ہے کہ اسلامی اصول قانون میں توہین رسالت کی سزا کہیں نہیں
ملتی۔ شاتم رسول کو سزا صرف آخرت میں ہوگی۔

بے نظیر حکومت بھی توہین رسالت اور حدود آرڈیننس قانون کو تبدیل یا اس میں ترمیم نہ کر سکی۔ قانون شہادت اور حدود آرڈیننس خواتین کے ساتھ انصاف کے عمومی تصور کی نفی ہے لیکن مذہب کے نام پر اسے قائم رکھا گیا۔ اس قانون کے تحت کسی عورت کے لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ اگر اس کے ساتھ ریپ / زبردستی عصمت دری کی گئی ہے تو وہ اسے عدالت میں ثابت کرے۔

پاکستان کی بہت سی مذہبی اور لسانی اقلیتوں میں سب سے زیادہ متاثر ہونے والی اقلیت احمدیہ ہے۔

پاکستان میں ہندو اقلیت کے ساتھ تعصب کی ایک مثال یہ ہے کہ راولپنڈی میں ہندوؤں کے مذہبی عقیدے کے مطابق لاش کو جلا دینے کے لئے مخصوص جگہ ان سے چھین لی گئی۔

پنجاب اسمبلی کے واحد ہندو M.P.A نے کہا کہ پاکستان میں تمام منہدم کئے گئے مندروں کی تعمیر کے لئے حکومت نے رقم مختص کی۔ لیکن ابھی تک ان مندروں کی دوبارہ تعمیر نہیں ہو سکی۔ انہیں بتایا گیا کہ کوئی ٹھیکیدار مندر تعمیر کرنے کو تیار نہیں۔ اس پر ہندو M.P.A نے کہا کہ اسے فنڈز مہیا کر دئے جائیں وہ یہ کام خود کرالیں گے۔ آج تک حکومت کی طرف سے کوئی جواب نہیں دیا گیا۔

مذہبی عدم رواداری کی یہ مثالیں صرف غیر مسلموں کے ساتھ ہی نہیں بلکہ مسلمانوں کے اندر موجود فرقوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔ شعیہ' سنی' بریلوی' دیوبندی' اہل حدیث کے درمیان آئے دن خون ریز فسادات ہوتے رہتے ہیں۔

شعیہ سنی فساد نے مذہبی دہشت گردی کی بدترین مثالیں قائم کی ہیں۔ ایک دوسرے کے مذہبی رہنماؤں کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ مساجد میں بم چلائے جاتے ہیں۔ بے گناہ نمازی شہید کر دیئے جاتے ہیں ملک فرقہ واریت اور تعصب کی آگ میں جل رہا ہے۔ خوف کے مارے کوئی آواز نہیں اٹھاتا۔ مسجد میں جمعہ پڑھنے کے لئے جائیں تو یہ یقین نہیں ہوتا کہ واپس آنا ہے کہ نہیں۔ اقبال نے کہا تھا۔

فرقہ بندی ہے کہیں کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

جنرل ضیاء الحق کے دور میں ملک میں مذہبی پیشوائیت اور مذہبی عدم رواداری پھیلتی رہی۔ علماء نے اس میں افسوسناک کردار ادا کیا۔ مولانا شاہ احمد نورانی نے کراچی میں ایک بہت بڑی سنی کانفرنس منعقد کی اور نعرہ دیا۔

"جاگ سنی جاگ۔ پاکستان تیرا ہے"

نواز شریف حکومت مذہبی جماعتوں اور ان کی سرگرمیوں پر پابندی لگانے سے ڈرتی ہے۔ بھارت میں بھی مذہبی پنڈتوں نے اپنا دبدبہ بڑھا دیا ہے۔ جے پور کیمپ میں ایک بھارتی نوجوان نے پنڈتوں کے طرز عمل کو تنقید کا نشانہ بنایا اور جگہ جگہ مورتیاں سجا کر مندر بنانے کے رجحان کو غلط قرار دیا۔ اس نے کہا یہ مذہبی دیس نہیں یہاں کسی مذہب کی چھاپ نہیں لگنی چاہئے۔ اس پر منتظمین نے کہا کہ یہ حساس موضوع ہے اسے نہ چھیڑیں۔

حال ہی میں نواز شریف نے 1973ء کے آئین میں ترمیم کے ذریعے شریعت کو ملک کا سپریم لاء بنانے کی کوشش کی ہے جسے سیاست دانوں اور معاشرے کے دیگر طبقات نے مسترد کر دیا ہے۔ ان کے بقول اس طرح نواز شریف خود کو امیر المومنین کا درجہ دلوانا چاہتے ہیں اور تمام اختیارات سمٹ کر ان کے پاس آجائیں گے۔ اسلامی شریعت کے نفاذ کی گنجائش پہلے سے ہی آئین میں موجود ہے۔ نواز شریف اگر سینٹ سے شریعت بل پاس کروا بھی لیں تو اس کے اچھے نتائج نہیں نکلیں گے۔ اس طرح کے تجربے ضیاء الحق نے بھی آزمائے۔ دیکھا گیا کہ جب بھی سیاسی حکومت کمزور ہوئی اس نے اسلام اور شریعت کے نفاذ کا واویلا مچا دیا۔ نواز شریف کی یہ خواہش تو بہت ہے کہ انصاف فوری ہو اور سزا میں دیر نہ لگے لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ جہاں ناانصافیاں، کرپشن، ظلم بھوک ننگ اور بیروز گاریاں ہوں وہاں سزاؤں کا اطلاق وقت اور

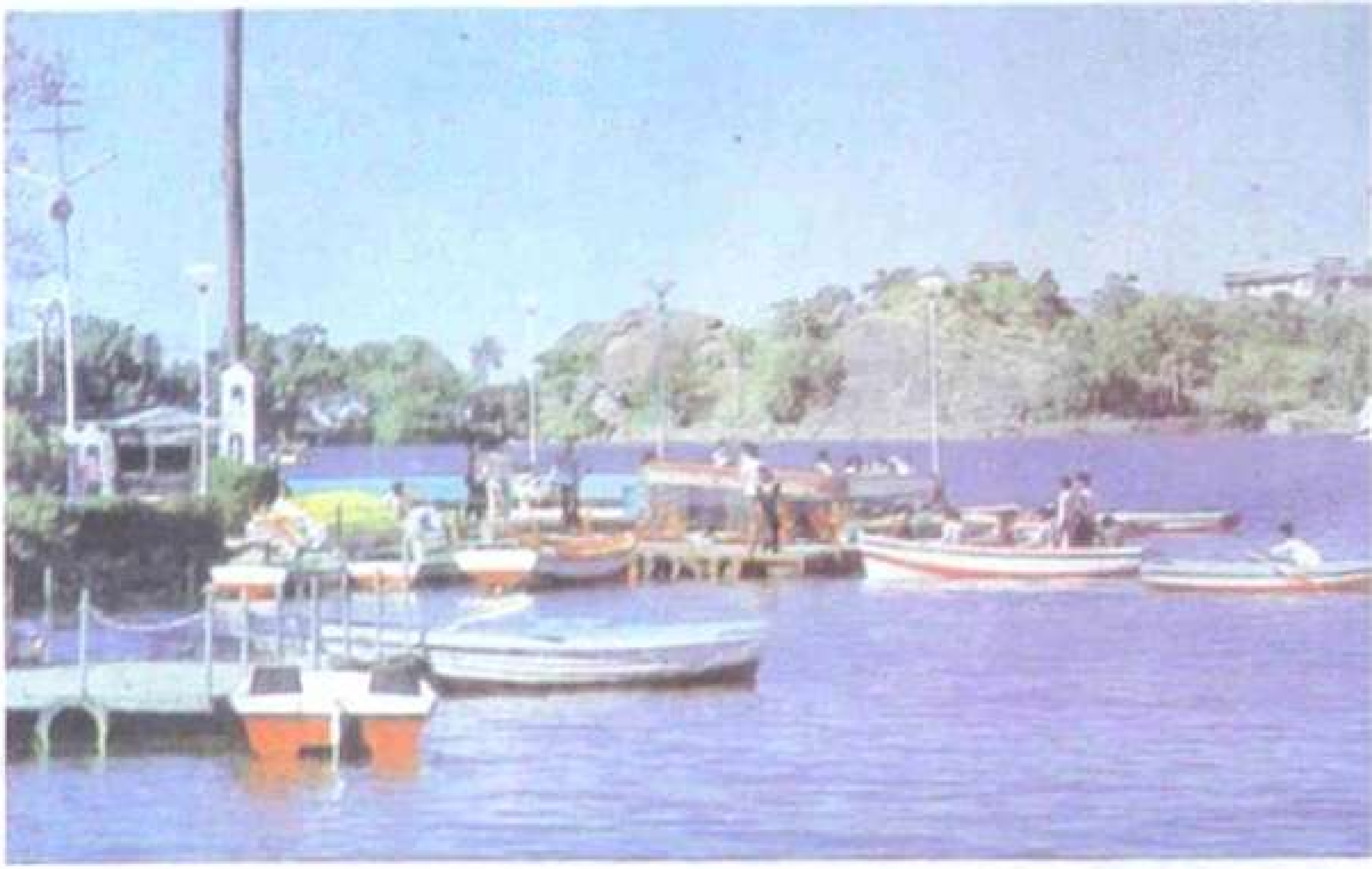
حالات کے تحت ہی ہوگا۔ اسلامی سخت سزاؤں کا نفاذ بھوک ننگ بے روزگاری' بے کاری اور نا انصافی میں کیسے ہوگا۔ خود حضرت عمر نے اپنے دور میں (قحط کی وجہ سے) چوری کرنے پر ہاتھ کاٹنے کی سزا معطل کردی تھی۔ نواز شریف لوگوں کے دروازے تک شریعت پہنچانے کی بجائے روٹی پہنچا دیں شریعت خود ہی پہنچ جائے گی۔

اسلام میں مذہبی رواداری پر بہت زور دیا گیا ہے۔ قرآن پاک میں کئی جگہ خدا نے یا النھاس کہہ کر تمام بنی نوع انسان کو مخاطب کیا ہے۔ خدا سب کا ہے۔ ہندو' سکھ' عیسائی' بودھ' چینی' مسلم خدا کو ماننے والے خدا کو نہ ماننے والے سب اس کے بندے ہیں۔ اسلام کے مطابق "دین میں کوئی جبر (زبردستی) نہیں۔ پیغمبر اسلام نے عیسائیوں کے ایک وفد کو مسجد میں ٹھہرایا اور ان کو اپنے طریقے پر مسجد میں نماز پڑھنے کی اجازت دی۔ (سیرت النبی جلد دوم صفحہ 371) غیر مسلموں کو ضمانت دی گئی کہ ان کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچایا جائے گا ان کے گرجے اور پادریوں کی حفاظت ہوگی۔ ان پر غیر منصفانہ طریقے پر ٹیکس نہیں لگے گا۔ کوئی بشپ اپنے منصب سے معذول نہیں ہوگا۔ کسی عیسائی کو جبر سے اس کے مذہب سے منحرف نہیں کیا جائے گا۔ کسی گرجے کو گرا کر وہاں مسجد یا مسلمان کا گھر نہیں بنایا جائے گا۔ ان کی مذہبی عبادت گاہوں کی تعمیر میں مالی امداد دی جائے گی۔ ان شرائط کی خلاف ورزی پر مسلمانوں کو سخت سزا دی جائے گی۔

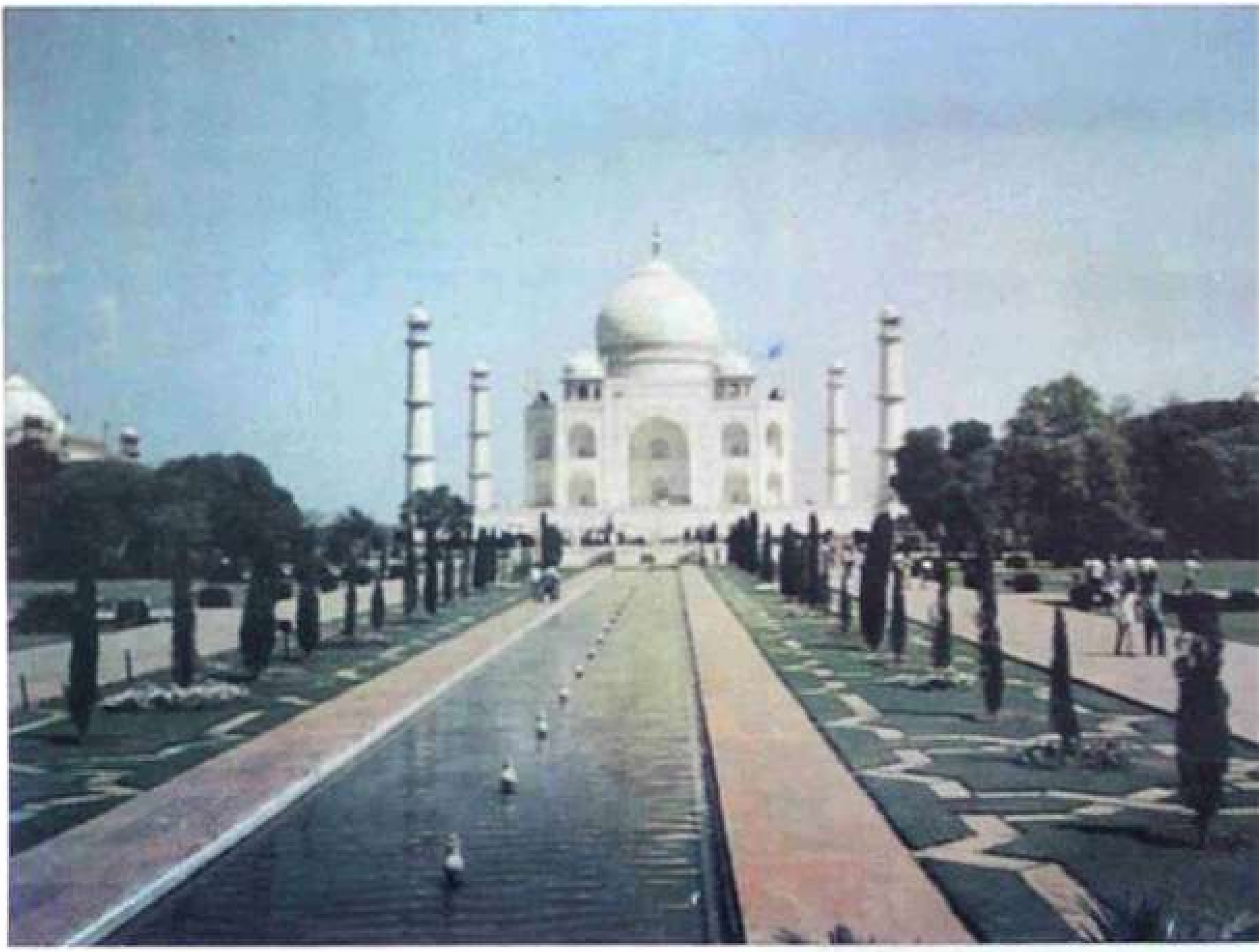
پاک بھارت تعلقات بہتر ہونے پر پہلی فرصت میں دونوں ملکوں کو مشترکہ طور پر اس اہم مسئلے کو حل کرنے اور اپنے اپنے معاشروں میں مذہبی رواداری کو فروغ دینے کیلئے کام کرنا ہوگا۔

حافظ شیرازی نے کہا تھا

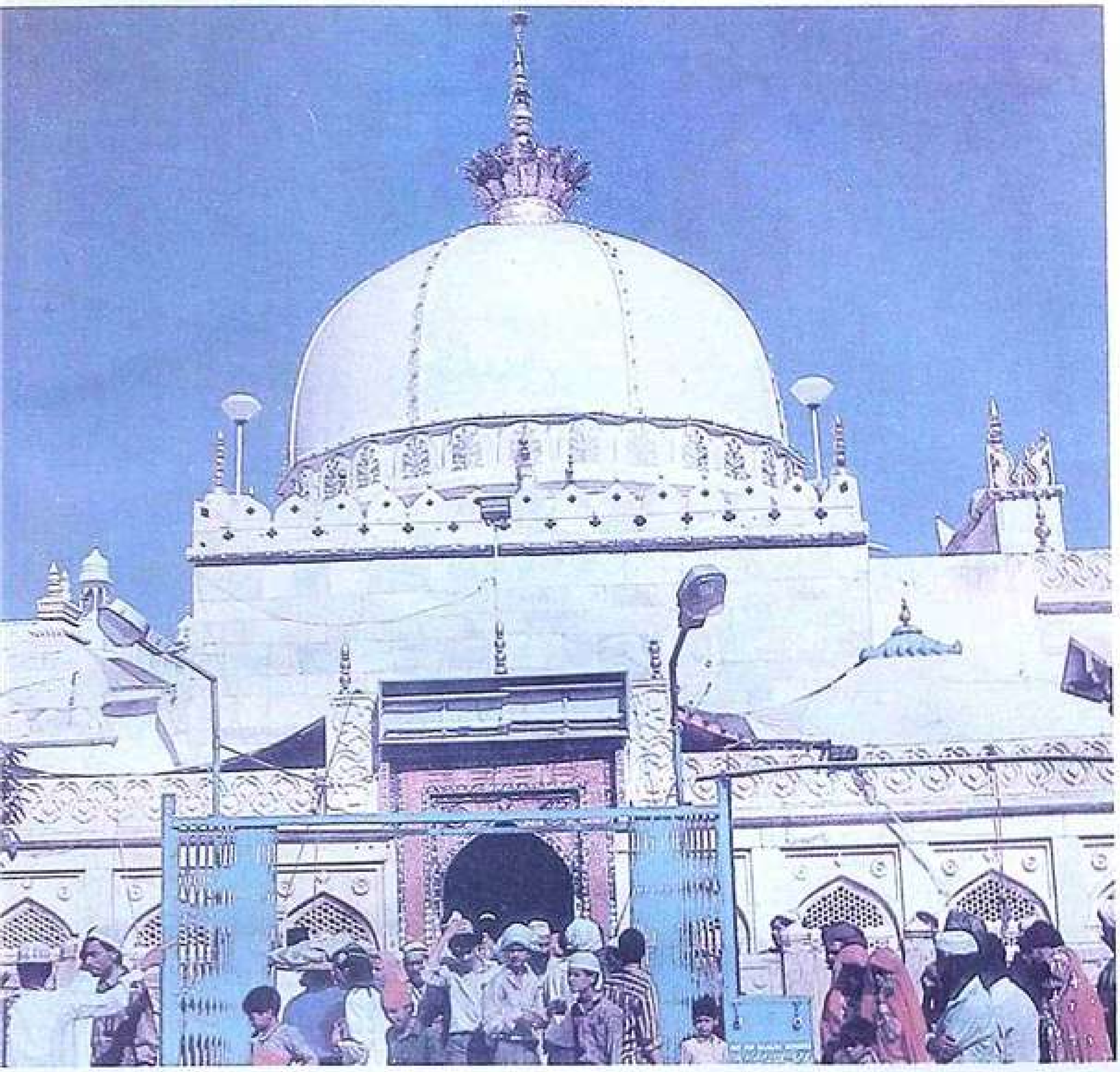
حافظا گر وصل خواہی صلح کن باخاص و عام
با مسلمان اللہ اللہ با براہمن رام رام



نکنی جھیل



تاج محل





انور ملک پچاس سال پہلے جس آموں کے باغ میں کھیلا کرتے تھے اسی طرح موجود ہے۔



گھر کا وہ کمرہ جس میں انور علی پیدا ہوا۔



کرشن نگر لاہور، کرشن داس بیدی کے گھر کا اندرونی حصہ



استاد سلامت علی خان و دیگر سامعین محفل موسیقی



بے پور

جے پور بھارت کے صوبے راجستھان کا دارالخلافہ ہے۔ اس کی آبادی دس لاکھ سے زیادہ ہے۔ دہلی احمد آباد ریل روٹ پر یہ شہر دہلی سے 308 کلو میٹر دور ہے۔ اگر بس کے ذریعے جائیں تو دہلی سے اس کا فاصلہ 272 کلو میٹر اور آگرہ سے 242 کلو میٹر ہے۔ یہاں ہوائی اڈہ بھی ہے اور ملک کے کئی اہم شہروں سے اسے ملا دیا گیا ہے۔

جے پور سے شمال مغرب کی طرف تھر کا ریگستان ہے۔ جو بھارت کا خشک ترین علاقہ ہے۔ 1727ء میں سوال جے سنگھ دوم (Sawal Jai Sing-II) نے اسے ڈیزائن کیا۔ جے سنگھ ایک فوجی لیڈر، دانشور، علم نجوم کا ماہر اور بہترین ڈیزائنر تھا۔ جے پور اٹھارویں صدی میں باقاعدہ منصوبہ بندی سے بننے والا نادر شہر ہے جو اپنی مثال آپ ہے۔ اسے انتہائی خوبصورتی سے ڈیزائن کیا گیا ہے۔ 34 ملی میٹر چوڑی سڑک بنائی گئی ہے۔ چورس اینٹ کے استعمال سے گھر بنائے گئے ہیں۔ اینٹوں کے یہ بلاک مزید چھوٹے کر کے گھروں کے ساتھ ساتھ بننے والے راستوں گلیوں اور بڑی شاہراہ کے متبادل نکلنے والے راستوں میں استعمال ہوئے ہیں۔ اینٹوں کے یہ بلاک پنک کلر کے ہیں اور پورے شہر میں صرف یہی کلر استعمال ہوا ہے۔ اس طرح سارا شہر ایک رنگ میں رنگا نظر آتا ہے۔ اسی وجہ سے اسے پنک سٹی کہا جاتا ہے۔ یہ شہر اپنی بناوٹ، سجاوٹ، رنگ اور ڈیزائن کی وجہ سے دنیا میں اپنی مثال آپ ہے۔

پرانے شہر میں داخلے کے لئے 6 میٹر بلند اور 2.8 میٹر چوڑے سات دروازے ہیں۔ شمال کی طرف گنگا پول اور دھارو واپول (Dharuva Pol) ہیں جہاں سے امبر (Ambar) شہر اور دہلی کی طرف راستہ نکلتا ہے۔ جنوب کی طرف گھاٹ گیٹ ہے۔ جہاں سے آگرہ اور رام پول جانے کا راستہ ہے۔ ان سے آگے سانگا نیری (Sanganeri) گیٹ اور اجمیری گیٹ، مشرق کی سمت سورج پول اور مغرب کی جانب چاند پول ہیں۔

ابتداء میں جے پور میں راجپوتوں کے کچاوا قبائل (Kachhawa Tribe) کی حکومت تھی۔ اس شہر کی خوبصورتی اور انفرادیت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ اس کی اصل

ہیئت اور شکل پرانے شہر کی صورت میں اسی طرح موجود ہے۔ جو بے حد پر کشش اور جاذب نظر لگتی ہے۔ یہی اس کی دلچسپی کا بڑا سبب ہے۔ گلابی رنگ کی اینٹوں' پتھروں سے بنے گھر' مندر اور ان میں چھوٹی چھوٹی کھڑکیاں اور جالیاں لگائی گئی ہیں۔ دونوں اطراف ایک ہی طریقے اور ڈیزائن کی بنی ہوئی دوکانیں ہیں درمیان میں کشادہ سڑک ہے۔

پرانے شہر یعنی اصل پنک سٹی سے گزریں تو ایک خوشگوار تاثر ملتا ہے۔ یہ اس شہر کا نیا پن ہے۔ جیسے کوئی پریوں کا دیس ہو۔ اس کی انفرادیت ہی یہ ہے کہ وہ دنیا کے کسی اور شہر سے نہیں ملتا۔ پہلی بار اس شہر کو دیکھنے والوں کو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کسی اور دنیا کے دیو مالائی شہر کو دیکھ رہے ہوں۔

پرانے شہر کے آس پاس اب کئی آبادیاں تعمیر ہو چکی ہیں۔ متوسط اور انتہائی غریب لوگوں کے محلے اور بستیاں بھی ہیں۔ فٹ پاتھوں پر بسیرا کئے لوگ۔ سائیکل رکشہ چلانے والے بھی ملیں گے۔ بھارت کے ہر صوبے اور شہر میں جدید اور خوبصورت کالونیوں' مکانوں' سڑکوں' ملٹی سٹوری بلڈنگوں بازاروں کے آس پاس پھیلی ہوئی غریب لوگوں کی بستیاں اور ان کی مفلسی کی زندگی کا پھیلا ہوا ماحول نظر آئے گا۔ خواہ وہ ممبئی ہو یا پنک سٹی۔

مرزا اسمٰعیل روڈ' اشوک نگر' سٹیچو (Statue) سرکل' سیکرٹیٹ رام باغ' پیلس ہوٹل' سپورٹس سٹیڈیم اور ودھایک نگر (Vidhayak Nagar) پنک سٹی کے آس پاس موجود ہیں۔ نئی سڑکوں اور خوبصورت جدید عمارتوں میں مہاراجہ کالج' سوائی خان ہسپتال اور سوائی رام سنگھ روڈ شامل ہیں کئی اور جدید بستیاں بھی بن گئی ہیں۔ نبی پارک' جاپو نگر' گاندھی نگر' تلک نگر' جواہر نگر' جنتا کالونی' سیٹھی کالونی وغیرہ۔

جے پور میں کئی خوبصورت اور جدید سینما ہیں۔ یہاں بھارت کا سب سے بڑا اوپن ائر سینما ہے۔ ہر معیار کے ہوٹل موجود ہیں۔ مشہور ہوٹلوں میں رام باغ پیلس ہوٹل' عامر ہوٹل' راجپوتانہ پیلس اور حال ہی میں تعمیر ہونے والا شیرٹن ہوٹل۔ سوائی مان

سنگھ میڈیکل کالج اور مالویہ ریجنل کالج آف انجینئرنگ یہاں کے اعلیٰ تعلیمی ادارے سمجھے جاتے ہیں۔

سیاحت کے لئے آنے والوں کی دلچسپی کے جہاں اور بہت سے سامان ہیں وہاں خریداری کرنے کیلئے بہت کچھ ہے۔ شہر کے بازاروں سے گزرنا ہی ایک دلچسپ مرحلہ اور بہترین منظر کشی ہے۔ طرح طرح کی چیزوں کی اقسام موجود ہیں۔ جب خریداری کیلئے نکلیں تو دوکانوں میں سجی چیزوں کو دیکھ کر دل چاہتا ہے کہ سب کچھ خرید لیں۔ پنک سٹی کا مسحور کن ماحول' عمارتوں کے رنگ و ڈیزائن اور مختلف اقسام کی اشیاء کی کشش سب کچھ بے حد دلچسپ اور خوبصورت ہے۔ جے پور خوبصورت اور قیمتی پتھروں' نگینوں' مورتیوں' مصنوعی زیورات اور خواتین کے کپڑوں کے لئے مشہور ہے۔ یہاں کی ہاتھ سے بنی ہوئی مشہور چپل "ناگرا" ہے پاکستان سے جانے والوں کو اکثر اس کی فرمائش کی جاتی ہے۔ جیولری اور لیڈیز کپڑوں کی خریداری کے لئے جوہری بازار مشہور ہے۔ یہاں ٹیکسٹائل' ہاتھ کی کڑھائی کے بنے کپڑے اور دیگر سامان ملتا ہے۔ یہاں لہریا ڈائنگ (Laharia Dycing) ساڑھیاں بہت مقبول ہیں۔ ہاتھی دانت سے بنی اشیاء اور وولن کارپٹ بے حد خوبصورت لگتے ہیں۔ دوکاندار ناتجربہ کار غیر ملکیوں سے مرضی کے پیسے بٹورتے ہیں۔

جے پور ریاست کا پرانا دارالخلافہ امبر تھا۔ یہاں امبر پیلس اپنی شان و شوکت کے نشان دکھاتا ہے۔ یہ راجپوت کلچر کی نمائندگی کرتا ہے۔ جس میں مغلیہ دور کی تعمیری ثقافت کی علامات بھی نظر آتی ہیں۔ امبر پیلس کے اندر سنگ مرمر کے پتھروں کے خوبصورت نمونے ہیں۔ شیش محل میں جابجا ستون ہیں اور چھوٹے چھوٹے شیشے موتیوں کی طرح دیواروں میں جڑے گئے ہیں۔ ایک موم بتی جلائیں تو اس کا عکس ان ہزاروں شیشوں میں یکساں عکس بندی کرتا نظر آئے گا۔ جے پور سے 13 کلو میٹر دور 17 ویں صدی میں بننے والا جین ٹمپل ہے یہاں جے پور ایئرپورٹ بھی ہے۔ مبارک محل کے باہر جنتر منتر ہے۔ اسے 1728 - 1734 کے درمیان جے سنگھ نے بنوایا تھا۔ اس میں

سورج موسموں کی تبدیلی کے اوقات اور ستاروں سیاروں کی گردش کے حساب کا طریقہ وضع کیا گیا ہے۔

ہوا محل جے پور کی تاریخ و ثقافت کا بڑا علامتی اظہار ہے۔ جس کے حوالے سے جے پور کی پہچان ہے۔ 1799ء میں یہ سات منزلہ انتہائی خوبصورت عمارتی ڈھانچہ گلابی رنگ کے پتھروں سے بنایا گیا تھا۔ جس کا رخ مشرق کیطرف ہے۔ ہوا محل کی تعمیراتی خوبصورتی کا جواب نہیں۔ دراصل اسے Honey Combed یعنی شہد کی مکھیوں کا چھتہ کہنا چاہئے۔ اس میں ہوا کے گزرنے کے لئے بہت سے راستے بنائے گئے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے سوراخ والی کھڑکیاں ہیں۔ یہ کھڑکیاں انتہائی خوبصورت جالی میں بنائی گئی ہیں۔ ان کھڑکیوں کو اس وقت کی شاہی خاندان کی خواتین کیلئے بنایا گیا تھا۔ تاکہ وہ شاہی سواری کے جلوس کو اور مارکیٹ میلوں کو ان چھوٹے چھوٹے پتھروں کے جھروکوں اور جالی کے سوراخوں و کھڑکیوں سے دیکھ سکیں۔

ہوا محل کی دیوار کی چوڑائی صرف 25 کیوبک میٹر ہے۔ اس کی جالی کے سوراخوں اور چھوٹی چھوٹی کھڑکیوں سے ٹھنڈی ہوا گزرتی ہے۔ اسی لئے اسے ہوا محل کہا جاتا ہے۔

ماؤنٹ ابو

بھارت کی ایک غیر سرکاری تنظیم کی جانب سے اسکے سالانہ کنوینشن میں شرکت کی دعوت ملی جو جو بھارت کے شہر ماؤنٹ ابو میں منعقد ہونا تھا۔ یہ شہر دہلی سے 300 کلو میٹر دور جنوب کی سمت واقع ہے۔ میرے لئے اس میں شرکت کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ بھارت جانے کا موقع اس وقت مل رہا تھا جب وہاں الیکشن کی سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ انہیں قریب سے دیکھنے اور جائزہ لینے میں آسانی اور ترجیح حاصل ہوتی۔ اس سے جہاں بھارت کی عمومی صورت حال کو سمجھنے کا اندازہ ہوتا وہاں مجھے بھارت کی نئی حکومت کے قیام اور پاک بھارت تعلقات پر اس کے اثرات کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنے میں مدد ملتی۔

میں یہ بھی چاہتا تھا کہ بھارت کے دانشوروں سے مل کر ان حقائق کا قریب سے مشاہدہ کروں جو اکثر عوام کی نظروں سے اوجھل رہتے ہیں۔ یا یوں کہئے کہ دونوں ملکوں کے عوام کو ان حقائق کا پتہ ہی نہیں چلنے دیا جاتا۔ پہاڑی مقام پر واقع یہ شہر شمال کی جانب ہمالیہ کا سب سے اونچا سلسلہ ہے۔ یہاں بکثرت بارشیں ہوتی ہیں جس کی وجہ سے سبزیاں اور پھل وافر مقدار میں پیدا ہوتے ہیں۔ دہلی سے ماؤنٹ ابو کیلئے ہم ٹرین پر بیٹھے۔ جے پور اور اجمیر کے شہروں سے گزرتے ہوئے رانکپور ریلوے سٹیشن پر اترے۔ وہاں سے بسوں کے ذریعے ابو روڈ روانہ ہوئے۔ راستے کے دونوں جانب کئی اقسام کے درخت' جھاڑیاں' خشک پہاڑ نظر آئے۔ کئی جگہ خوبصورت مناظر بھی دیکھنے میں آئے۔

ماؤنٹ ابو میں ہم لوگ ایک مندر کے قریب گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرے تھے۔ دن کے مختلف اوقات میں مخصوص وقفوں سے مندر کی گھنٹیاں بجنے لگتیں۔

اگلے روز یہاں بھارت کے دور دراز علاقوں سے آئے ہوئے لوگ ہمارے ساتھ شامل ہو گئے۔ ان میں صحافی' دانشور' ٹریڈ یونینوں کے نمائندے' وکلاء اور سماجی تنظیموں کے افراد شامل تھے۔ امریکہ کی یونیورسٹی کے ایک استاد اور بھارت کے سابق جج کی بیٹی بھی موجود تھی جو یوگا کی استاد ہیں۔ اگلے روز کانفرنس شروع ہونا تھی اور ہمیں ایک

دن سیر و تفریح کے گیا تھا۔
یہاں بہت سے رت جگہ حسین مناظر بکھ ئے ہیں۔ ماؤنٹ ابو
کے وسط (Lake) پورے ماحول کو خوشگوار اور
مسحور کن بنائے ۔ اس چھوٹی سی جھیل میں بوٹنگ کی جاتی ہے۔ جوں
جوں اندھیرا چھانے جھیل کے ارد گرد سیاح جمع ہونا ردع ہو جاتے ہیں۔ مقامی
لوگ اور راجستھانی عورتیں اپنے مخصوص لباس اور وضع قطع سے پہچانے جاتے ہیں۔
عورتیں اپنے دونوں بازوؤں تک چڑھائے رکھتی ہیں۔ مارچ' جون اور ستمبر'
نومبر کے یہاں کا موسم خوشگوار ہوتا ہے۔

ماؤنٹ کئی مندر ہیں۔ بہار کا Pilgrim Centre شہر ہے۔
اس کے ع ڑا ٹیمپل بھارت خود بہترین مندروں میں ن
جیسے وں کو دیکھنے کے دوں سیاح یہاں آتے ں۔ ان مندروں کی
خوبصورتی کا جواب نہیں ان کی دیواروں ستونوں پر نقش و نگار' بناوٹ سجاوٹ
رنگ اور نزاکت کا بے اختیار ی جاتا ہے۔ دلواڑا ٹیمپلز کے 29
ہال' 80 ڈو 144 ستون ہیں۔ دلچسپ بات یہ کوئی دو ستون ایک دوسرے
سے ملتے۔ یہاں کی مشہور جگہوں میں اکالگڑھ فورٹ' ن سیٹ
پوا ٹوڈز راک (Toad's Rock) شامل ہیں۔ سورن غروب ہونے سے آدھ
گھ یہاں آئے ہوئے نوں اور کاروں میں سن سیٹ پوائنٹ دیکھنے
 بہت سے لوگ پیدل ہی جانا پسند ی پر چڑھ کر دو
پندرہ منٹ پہنچ جاتے ہیں۔ جس جگہ پہاڑوں کا سلسلہ ختم ہوتا ہے گ
جگہ جمع ہو ہیں اور آدھ کلومیٹر کے اصلہ جڑی ہوئی پہاڑی
چو جگہ جگہ بکھر کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ا میدان ہے اور
سورج ایک ے تھال کی شکل میں آہستہ آہ فق میں غروب ہوتا دکھائی
دیتا ہے۔ جوں جوں وہ غروب ہوتا ہے لوگوں کا تجسس بڑھتا جا لوگ اس منظر کو

کیمرے کی آنکھ سے محفوظ کر لیتے ہیں۔ پہاڑوں کی بلندیوں سے ڈوبتے سورج کا نظارہ
ہلا لگتا ہے۔ واپسی داسی سی چھا جاتی ہے یوں ہے زندگی کا ایک
دن کم ہو گیا۔

ماؤنٹ ابو میں بندروں کی بہتات ہے۔ صبح سے شام تک بندر گھروں' درختوں' بازاروں میں بے خوف و خطر گھومتے پھرتے ہیں۔ اکثر غول کے غول گروپوں کی صورت میں ہیں۔ کسی بندریا نے اپنا ننھا سا بچہ پیٹ کے ساتھ چمٹایا ہوتا ہے۔ بھاگتے پھلانگتے کودتے اسے بچے کے گرنے کا کوئی ڈر نہیں ہوتا کیونکہ بچہ اپنی خود کرتا ہے اور بڑی مضبوطی سے اپنے ماں کے پیٹ کے ساتھ چمٹا رہتا ہے۔ بندریا سے اس نظر سے بچے کو دیکھ کی قدرت یاد آتی ہے۔ میں جتنے دن ماؤنٹ ابو میں رہا بندروں سے دلچسپی قائم رہی۔ ان کے ساتھ دوستی کا آسان طریقہ یہ ہے کہ کچھ کھانے کی چیز انہیں دی جائے۔ وہ خود ہی قریب آجاتے ہیں اور ہاتھ سے لے کر کھاتے ہیں۔ اگر ایک بار آپ نے انہیں کھانے کو کچھ دے دیا تو پھر یہ پیچھا نہیں چھوڑتے اور جب بھی ہاتھ میں کھانے کی کوئی چیز دیکھیں گے اس پر جھپٹ پڑیں گے۔ وہ اپنے جسم پر ہاتھ نہیں لگانے دیتے۔ اگر پیار کرنے کی غرض سے آپ نے انہیں چھولیا تو وہ بہت برا مناتے ہیں اور ممکن ہے آپ پر حملہ بھی کردیں۔ دوکانداروں اور راہگیروں کی چیزوں کا نقصان بھی کرتے رہتے ہیں۔ گھروں کے برتن توڑ دیتے ہیں۔ کوئی انہیں کچھ نہیں کہتا کیونکہ ہندو بندر کو سمجھتے ہیں۔ یہ ان کے بھگوان ہنومان کا درجہ رکھتا ہے۔ میں ایک بھارتی دوست کے ساتھ آٹو رکشا میں بیٹھا تھا۔ رکشہ والے نے پانی پینے کیلئے رکا۔ وہاں ایک بہت بڑا بندر بیٹھا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ پتلون پہنے ہوئے ہو۔ جب رکشہ چلا تو میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے "ہیلو" کہا اور اپنے ہاتھ کی مٹھی بنا کر طرف کبھی کھولی کبھی بند کی۔ یہ ایک شوخی کا اظہار تھا۔ لیکن بندر نے یہ میں نے اس کا مذاق اڑایا ہے۔ رکشہ چل پڑا۔ ابھی رکشہ تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ میرے برابر بیٹھے ہوئے

دوست نے کہا وہ آرہا ہے۔ میری چھٹی حس بیدار ہوگئی اور خطرہ بھانپتے ہوئے میں ہوشیار ہو کر بیٹھ گیا۔ اچانک وہی دیوہیکل بندر میری جانب سے رکشے پر چڑھ گیا اور مجھ پر حملہ کر دیا۔ میں نے اس پر مکہ تان لیا اور منہ سے زور دار آواز نکالی۔ یہ آواز شاید ڈر اور گھبراہٹ سے نکلی ہو لیکن بندر پر اس کا اچھا اثر ہوا اور وہ چند لمحے رکنے کے بعد نیچے اتر گیا۔

پھر وہ دوسری جانب سے میرے ساتھی پر حملہ آور ہوا اور اسے کاٹ لیا۔ اسی اثنا میں رکشے والے نے رکشہ روک لیا اور ہمیں تلقین کی کہ بالکل خاموش بیٹھے رہو اور مداحمت نہ کرو۔ چند لمحے فاتحانہ انداز میں کھڑا رہنے کے بعد وہ واپس چلا گیا۔ میں نے اپنے دوست کا زخم دیکھتے ہوئے اسے مشورہ دیا کہ ڈاکٹر کو دکھا لاؤ لیکن اس نے لاپرواہی برتی۔ اگلے روز ہم دہلی سے جے پور چلے گئے۔ کھیڑی کیمپ میں مسز ایلس گارگ جو کیمپ میزبان تھیں فوراً" ڈاکٹر کو لے آئیں۔ اس نے انجیکشن لگائے اور دو ہزار فیس وصول کی۔ میں اس پر شرمندہ تھا کہ میری شرارت کی وجہ سے یہ سب کچھ ہوا۔ بعد میں اسی دوست نے ہمیں بتایا کہ اس سے پہلے کتا' بلی اور گھوڑا اسے کاٹ چکے ہیں۔

اگلے روز ہم کانفرنس کی جگہ روانہ ہوئے۔ یہ ایک خوبصورت بنگلہ تھا۔ جو لیڈی وملا ٹھاکر کی ملکیت ہے۔ وملا ٹاکر بھارت کی بین الاقوامی اہمیت کی حامل روحانی پیشوا' دانشور' ادیبہ اور سوشل ریفارمر ہیں۔ انہوں نے کئی کتابیں لکھی ہیں۔ ہال میں داخل ہوتے ہوئے ایک غیر ملکی خاتون نے ہمارا استقبال کیا۔ یہ خاتون لیڈی وملا ٹھاکر کی سیکریٹری تھیں۔ کچھ دیر کے بعد ایک پروقار' درمیانے قد کی معمر خاتون آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی ہال میں داخل ہوئی۔ ہم سب احتراماً" کھڑے ہوگئے۔ یہ وملا ٹھاکر تھیں۔

سب سے پہلے دعا پڑھی گئی۔ اس میں کئی مذاہب کی ایسی دعائیں شامل تھیں جو اسلام ہمیں سکھاتا ہے۔ جس میں انسان اور انسانیت کی بھلائی' اللہ کی تعریف اور برتری

ظاہر کی گئی ہے۔

ہمارے میزبان نے ہم سب کا تعارف کرایا۔ میرا تعارف کراتے ہوئے انہوں نے کہا کہ یہ دوست پاکستان سے آئے ہیں اور پہلی دفعہ اس کانفرنس میں شرکت کر رہے ہیں۔ وملا ٹھاکر مسکرائیں اور بھارت کے روائتی انداز میں ہاتھ جوڑ کر میرا استقبال کیا اور کہا کہ آپ کے آنے کی بے حد خوشی ہے۔ انہوں نے سب سے مخاطب ہو کر کہا کہ ہمارے بھائی پاکستان سے کچھ سوالوں کے جواب ڈھونڈنے آئے ہیں۔ یہ جواب انہیں وہاں بیٹھ کر بھی مل سکتے تھے۔ لیکن ان کے اندر سچ کو جاننے' تلاش کرنے اور سمجھنے کی جو تڑپ لگن اور درد مندی تھی۔ وہ انہیں یہاں لے آئی۔ انہوں نے کہا ہم آج تک پڑوسیوں کو چھوٹا سمجھتے آئے ہیں جو ہماری غلطی تھی۔ کوئی پڑوسی چھوٹا یا بڑا نہیں ہوتا۔ پڑوسی بس پڑوسی ہوتا ہے۔ اب دوستی کے معنی اور مفہوم بدل گئے ہیں۔ دوستی کے دائرے وسیع ہوگئے ہیں دوستی کے نئے معنی تلاش کرنا ہوں گے۔ ہماری کیفیت یہ ہے کہ ہم ابھی تک بلا لنگر کے جہاز پر سوار رہے ہیں۔

میں نے اپنے اظہار خیال میں میزبان کا شکریہ ادا کیا اور پاکستان کے عوام کی جانب سے ہندوستان کے عوام کے لئے نیک تمناؤں کا اظہار کیا اور کہا کہ دونوں ملکوں کی ترقی اور خوشحالی کے لئے برصغیر میں امن کا قائم ہونا ضروری ہے۔ اگر پاک و ہند اپنے مسائل حل کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو جنوبی ایشیا پر اس کا خوشگوار اثر پڑے گا۔ جنوبی ایشیاء جو ترقی میں بہت پیچھے رہ گیا ہے زمانے کے بہاؤ میں اکھڑنے سے بچ جائے گا۔ وملا ٹھاکر نے جمہوریت جنوبی ایشیا کی سیاسی و معاشی صورت حال نظام حکومت اور برصغیر کا سیاسی و تاریخی پس منظر کے موضوعات پر لیکچر دیئے۔ جن پر بعد میں تفصیلی بحث ہوئی۔ ہندوستان کی عورت کا سماجی کردار بھی گفتگو کا موضوع رہا۔ یہ ایک دلچسپ موضوع تھا۔ عورت کی پیدائش' اس کی نفسیات' اس کے وجود کی ضرورت اور تصویر کائنات میں عورت کے حسن و جمال کا تذکرہ ہوا۔ وملا ٹھاکر کا کہنا تھا کہ عورت اور مرد برابری کا درجہ رکھتے ہیں۔ عورت کا وجود زندگی میں حرارت' روانی اور جذبہ بیدار رکھتا

ہے۔ اسی سے تصویرِ کائنات میں رنگ جھلکتا ہے۔ لیکن جب عورت مرد بننے لگے تو اس کی اپنی اہمیت کم ہو جاتی ہے۔ اس لئے ایک اعتدال اور توازن قائم رکھنا ضروری ہے۔ تاکہ زندگی کا حسن باقی رہے۔ توہم پرستی کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ہم پیروں فقیروں کے پاس جا کر اپنی آزادی ختم کر دیتے ہیں۔

میں نے کہا توہم پرستی ہمارے ہاں بھی بہت ہے پڑھے لکھے لوگ بھی اس میں شامل ہیں۔ ایک پڑھی لکھی خاتون کے گھر چوری ہو گئی۔ وہ اپنے رومال کو اپنے پیر کے پاس لے کر گئی جو رومال سونگھ کر بتائیں گے کہ چور کون ہے۔ اس پر سب لوگ ہنس پڑے۔ وملا ٹھاکر نے کہا ہمارے ہاں یہ کام منسٹر کرتے ہیں۔

بھارت کے ایک اور دانشور محقق اور گاندھین فلاسفی کے سکالر اچاریہ رام مورتی ہیں۔ تاریخ اور فلسفہ ان کے خاص موضوعات ہیں۔ انہوں نے اپنے خطاب میں کئی ایسی باتیں کہیں جو ان کی مخصوص سوچ کی آئینہ دار تھیں۔ ان کے خیالات سے بھارت کے دانشور بھی اختلاف رکھتے ہوں گے وہ اکھنڈ بھارت کی سوچ رکھتے تھے۔ انہوں نے کہا جب ہندوستان میں دو قومی نظریہ کا نعرہ لگ گیا تو نتیجہ کے طور پر پاکستان بن گیا۔ اب منطقی طور پر ہندوستان کو ہندو سٹیٹ بننا چاہئے۔ جب پاکستان اسلامی ریاست بننے کے لئے ہم سے الگ ہو گیا تو ہندوستان میں ہندو راج ہونا چاہئے۔ بھارتیہ جنتا پارٹی یہی کہتی ہے۔ اس کا یہ کہنا غلط نہیں۔ اس کا مائنڈ پڑھنے کی ضرورت ہے۔ ایک موقع پر انہوں نے یہ بھی کہا کہ ہندوستان میں ہندو راج قائم کرنے سے ہندوستان کمزور ہو گا۔ یہ ان کے متضاد خیالات کا اظہار تھا۔ انہوں نے کہا بھارت کا مسلمان ابھی تک اپنے کردار کا فیصلہ نہیں کر سکا۔ وہ گومگوں کی کیفیت میں ہے۔ وہ بھارت کے سیکولر مزاج سے ہم آہنگ نہیں ہو سکا۔ میں نے اپنی تقریر میں ان کے بعض خیالات پر تنقید کی اور کہا کہ بھارتیہ جنتا پارٹی کو یہ سوچنا چاہئے کہ وہ کس کی نمائندگی کر رہی ہے۔ ہندوستان کا آئین سیکولر ہے۔ اس میں ہندو راج قائم کرنے کی گنجائش نہیں۔ آئین کا آرٹیکل 14 سب شہریوں کے ساتھ یکساں سلوک کا حکم دیتا ہے۔ آرٹیکل 21

اور 30 سب اقلیتوں کو مذہبی آزادی اور اپنے تعلیمی ادارے قائم کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ اگر ہندوستان نے اپنے آئین کی اس روح سے ہٹ کر چلنے کی کوشش کی تو اس کے نظام میں پیچیدگیاں پیدا ہوں گی۔ بلکہ اس کی وحدت کو خطرات لاحق ہو سکتے ہیں۔

جنوبی ایشیاء میں ہندوستان علاقے آبادی اور فوجی قوت کے اعتبار سے سب سے بڑا ملک ہے۔ وہ پورے جنوبی ایشیاء کو اپنے زیر اثر رکھنے کی نفسیات ترک کر دے۔ اسی نفسیات کی وجہ سے اس نے بے پناہ اسلحہ جمع کرنا شروع کر دیا اور یوں اسلحے کی دوڑ میں پاکستان بھی شامل ہوگیا۔ آج دونوں کے پاس خطرناک ایٹمی اسلحہ موجود ہے۔ ہندوستان اپنے ہمسایہ ملکوں کو اعتماد میں لے اور یقین دلائے کہ ان کی سلامتی کو بھارت سے کوئی خطرہ نہیں۔ سرد جنگ جو ختم ہوگئی لیکن بدقسمتی سے بھارت اور پاکستان میں یہ جاری ہے۔ اس سے دونوں ملکوں کی ترقی متاثر ہو رہی ہے۔

مجموعی طور پر جمہوری ماحول میں یہ بحث و مکالمہ اختتام پذیر ہوا۔ بھارتی سیاست و کلچر میں ایک دوسرے سے اختلاف کرنے اور رواداری کی روایات ہماری نسبت زیادہ ہیں۔ پاکستان ہندوستان کے عوام اگر مل بیٹھ کر ایک دوسرے سے سوال کریں اور جواب لیں تو بہت سی قباحتیں اور غلط فہمیاں دور ہو سکتی ہیں۔ اختلافات کے باوجود گفت و شنید کے دروازے کھلے رکھنا ضروری ہے۔

کھیڑی کیمپ

1996ء میں راجستھان کے صوبے میں جے پور شہر سے 30 کلو میٹر دور ایک دیہاتی قصبے کھیڑی میں SAF کیمپ لگا۔ دہلی سے بذریعہ ٹرین جے پور اور وہاں سے بس کے ذریعے کھیڑی پہنچ گئے۔ بس سے اتر کر تین کلو میٹر تک پیدل چلنا پڑا۔ کھیتوں اور اونچے نیچے میدانوں ٹیلوں سے ہوتے ہوئے ہم کیمپ سائٹ پر پہنچ گئے۔ یہ وسیع و عریض احاطہ پر قائم بال رشمی سوسائٹی تھی۔ ہمارے استقبال کے لئے سوسائٹی کی فاؤنڈر سیکرٹری مسز ایلس گارگ موجود تھیں۔ اس کیمپ میں بھارت کی 23 ریاستوں کے مندوب اور 5 ہمسایہ ملکوں سے آئے ہوئے مہمان بھی شامل تھے۔ جن کی کل تعداد 150 کے قریب تھی۔ سوسائٹی کے وسیع و عریض احاطے اور باؤنڈری وال کے ساتھ ساتھ بنے ہوئے کمروں میں یتیم اور لاوارث بچوں کی رہائش کا انتظام ہے۔ یہاں تین سو کے قریب ایسے بچے رکھے گئے ہیں۔ جن کے ماں باپ نہیں یا جو کسی اور وجہ سے اس جہان میں اکیلے رہ گئے۔ ان کی رہائش اور تعلیم و تربیت کا انتظام اسی سوسائٹی کے ذمے ہے۔ ہمیں اس کیمپ میں 5 روز تک ٹھہرنا تھا۔ اس دوران میں نے ان یتیم بچوں سے دوستی پیدا کرلی۔ مجھے جب بھی موقع ملتا۔ میں ان کے کمروں میں چلا جاتا اور ان سے گپ شپ لگاتا۔ انہیں گیت نظمیں اور کہانیاں سناتا اور ان سے بھی ایسی ہی فرمائش کرتا۔ ان دنوں میں وہ مجھ سے بہت مانوس ہوگئے۔ میں ان کے ساتھ کمروں میں سوتا۔ ان کے ساتھ مل کر کمروں کی صفائی بھی کرتا انہیں سوئیٹس تحفے میں دیتا۔ مجھے یوں لگتا جیسے ان بچوں کو کسی ناگہانی آفت نے آدبوچا ہے اور یہ بھری دنیا سے کٹ کر یہاں قید کر دئے گئے ہیں۔

میں بچوں سے ان کی دکھ بھری کہانیاں سنتا ان کے حالات معلوم کرتا تو کلیجہ منہ کو آتا۔ کبھی کبھی کسی بچے کو ملنے کے لئے اس کا سوتیلا باپ یا ماں یا کوئی اور دور کا عزیز رشتہ دار آجاتا۔ جو کسی بچے کو پال نہیں سکتے وہ انہیں یہاں چھوڑ جاتے ہیں۔ مجھے بتایا گیا کہ ان بچوں کو بنیادی تعلیم اور کوئی ہنر سکھایا جاتا ہے اور جب وہ کسی قابل ہو جاتے ہیں تو انہیں کوئی روزگار یا نوکری دلا دی جاتی ہے یا کسی رفاحی ادارے میں بھیج

دیا جاتا ہے جہاں وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو کر کمانے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ ایک مقامی پولیس افسر کا کہنا تھا کہ اس ادارے کو پوری دنیا سے [illegible]تے ہیں لیکن وہ سب کے سب ان بچوں پر خرچ نہیں ہوتے بلکہ ان کا غلط استعمال ہوتا ہے۔ سوسائٹی کی سیکرٹری مسز ایلس گارگ بھارت کی جانی پہچانی سماجی شخصیت ہیں۔ رفاحی کاموں میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ اگلے روز ہم پاکستانی دوست اجمیر شریف چلے گئے اور حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے مزار پر حاضری دی۔ واپسی پر بس سے اترا تو ایک سکول کے پچاس ساٹھ بچے بھی اسی وقت ایک بس سے اترے۔ ان کے ہمراہ ان کی ٹیچرز تھیں جو سب لے سب سوسائٹی کی کیمپ میٹنگ میں شرکت کیلئے آئے تھے۔ انہیں سوسا[illegible] راستے کا علم نہ تھا۔ مجھے آگے جاتا دیکھ کر ایک لیڈی ٹیچر نے سوسائٹی کا راستہ پوچھ لیا۔ میں نے ان کو اپنے [illegible] کھیتوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے میں بچوں سے باتیں کرتا ہوا آگے نکل آیا۔ بچے مجھے کہنے لگے انکل آپ ہمیں پاکستان کی باتیں بتائیں پاکستان میں بچے ہمارے جیسے ہوتے ہیں۔ میں نے ان کی آنکھوں میں حیرت اور شوق چھپا ہوا دیکھا۔ ابھی تک انہوں نے پاکستان کے متعلق سنا ہی ہوگا۔ شاید یہ پہلا موقع ہو کہ وہ کسی پاکستانی سے اس طرح مل رہے ہوں۔ اس وقت گرمی بڑھ رہی تھی اور مجھے بھوک بھی ستا رہی تھی۔ [illegible]ری سے [illegible]نچنا چاہتا تھا لیکن بچوں کی ضد اور اصرار تھا کہ میں ان کے ساتھ رہوں اور بہت سی باتیں کرتا جاؤں۔ بچے مجھ سے بہت سے سوالات کرتے جا رہے تھے۔ معصوم سے سوال۔ میں انہیں کیا بتاؤں کہ کیوں پاکستا[illegible]ے نہیں مل سکتے۔ کیوں بھارت کے بچے پاکستان نہیں جا سکتے۔ ان کو معلوم ہی [illegible]ں سے پہ[illegible]یخ میں پچاس سال پہلے ملک تقسیم ہوا تو اس کے بعد سے اب تک نا اہل حکمران اپنے کے جھگڑوں سے فارغ نہیں ہوئے۔ ان کے مسئلے جوں کے تو[illegible]۔ پاکستان اور بھارت کے سکولوں کے بچوں کو بھلا کون ایک دوسرے سے ملنے [illegible]۔ بارڈر پر کھڑے ہو کر دور سے ہیلو ہیلو کرنے کا موقع [illegible]ں۔ ایک دوسرے کو دیکھ بھی نہیں سکتے۔ پاکستان کے بچے بھارت

کی بال رشمی سوسائٹی دیکھنے نہیں آسکتے۔ بھارت کے بچے عمران خان کا ہسپتال نہیں دیکھ سکتے۔ آنے والی نسلیں دونوں ملکوں کے حکمرانوں کی عقل کا ماتم کرتی رہیں گی۔

لیکن یہ نئی نسل کے بچے اب کچھ اور سوچ رہے ہیں۔ ان کا وجدان تاریخ کا دھارا موڑ سکتا ہے۔ وہ نفرتوں کو قبول کرنے کو تیار نہیں۔ یہ نئی نسل آنے والے وقت کی قسمت کا نیا سورج' نئی زندگی' نئی روشنی ہے۔

امریکہ کے آنجہانی صدر ابراہیم لنکن نے کہا تھا "سب لوگوں کو کچھ وقت کیلئے بے وقوف بنایا جا سکتا ہے۔ کچھ لوگوں کو ہمیشہ ہی بے وقوف بنایا جا سکتا ہے۔ لیکن تمام لوگوں کو ہمیشہ بے وقوف نہیں بنایا جا سکتا۔

کیمپ میٹنگ میں گورنر راجستھان بالی رام بھگت نے بڑی جذباتی تقریر کی۔ ایک موقع پر وہ تقسیم سے پہلے کے اپنے دوستوں کا ذکر کرتے ہوئے رو پڑے۔ انہوں نے جذباتی انداز میں دونوں ملکوں سے اپیل کی کہ وہ اپنے اختلافات کا حل ڈھونڈلیں اور لڑائی جھگڑا ختم کر دیں۔ ان کے آنسو لگاتار نکل رہے تھے اور انہیں جیب سے رومال نکالنا پڑا۔

اتر پرا دیش اور اڑیسہ کے سابق گورنر ستیا نارائین ریڈی اور ساؤتھ ایشین فریٹرنٹی کے سیکرٹری ستیا پال اروڑہ نے بھی تقاریر کیں۔

جے پور کے آئی جی پولیس کی تقریر ختم ہونے پر میں نے ان سے سوال کیا کہ ایک طرف آپ یہ کہتے ہیں کہ نیوکلئر بم اور اسلحہ اجتماعی تباہی کا باعث بنے گا اور دوسری طرف بھارت کی ایٹمی صلاحیت پر بھی آپ کو اعتراض نہیں۔ بھارت کی معیشت اپنے ریونیو کا بڑا حصہ تو اسلحہ بنانے اور خریدنے پر لگا رہی ہے جس نے آپ کے عوام میں غربت پھیلا دی ہے۔ اس پر انہوں نے جواب دیا کہ میں نے یہ نہیں کہا کہ بھارت ایٹمی اسلحہ کے ذخائر جمع رکھے۔ ایٹم بم کی تباہ کاریوں سے بھی انکار نہیں کیا۔ فوجی قوت اور ایٹم بموں سے کوئی ملک مضبوط نہیں ہو جاتا۔ بعد میں تمام مہمانوں نے کیمپ میں شریک افراد کے ساتھ زمین پر بیٹھ کر کھانا کھایا۔

آئی جے [redacted] کا میرے ساتھ اس بات [redacted] تھا کہ اگلی پوری صدی معاشیات [redacted] رول اس میں اہم نہیں رہے [redacted] میں نے اپنی تقریر میں دہلی کے اس [redacted]، کا ذکر کیا جس میں آئی کے گجرال نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ بھارت اپنے ہمسایہ ملکوں کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہ کرنے کی پالیسی پر عمل پیرا رہنے کا عزم کرتا ہے اور سب ہمسایہ ملکوں اور دنیا بھر کی اقوام کی آزادی و خود مختاری کے احترام کا پابند ہے۔ یہ بہت اچھی بات ہے۔ بھارت اس کا عملی ثبوت مہیا کرے تو تمام پڑوسی ملکوں میں اعتماد پیدا ہو سکتا ہے۔ ہم نہ صرف بھارت اور پاکستان سے بلکہ تمام جنوبی ایشیائی ملکوں سے ایسی توقعات رکھتے ہیں۔ روایت کے مطابق ہر روز رات کو کلچرل پروگرام منعقد ہوتے رہے جس میں بھارت سمیت باقی ملکوں کی جانب سے بھی ثقافتی شو پیش کئے گئے۔ پاکستان کی جانب سے SAF کی کسی میٹنگ میں اس طرح کے کسی پروگرام میں ثقافتی شو پیش نہیں کئے گئے۔ اس کی وجہ غالباً" وہ پابندیاں ہیں جو پاکستانیوں پر مسلط ہیں۔ دہلی اور کلکتہ کنونشن میں شیم [redacted] نے رقص پیش کر [redacted] بعد میں پاکستان میں سخت لے دے ہوئی۔

عالمی شہرت کی حامل اوڈیسی ڈانسر کویتادیوبی نے کلاسیکی رقص پیش کئے جس پر انہیں بہت داد ملی۔

کھیڑی کیمپ کے تمام شرکاء کو جے پور کے ڈی۔ اے۔ وی پبلک سکول کے پرنسپل [redacted] ایل گوئل کی جانب سے سکول میں مدعو کیا گیا تھا۔ یہ ایک [redacted] تقریب تھی جس [redacted] کیمپ کے شرکاء کے علاوہ جے پور کی اہم شخصیات اور مختلف [redacted] ادروں کے طلباء کی بڑی تعداد بلائی گئی تھی۔ اس پروگرام کی خاص بات یہ تھی کہ طالب علموں کے والدین کیمپ کے مہمانوں کے لئے اپنے اپنے گھروں سے راجستھانی کھانے بنا کر لائے تھے۔ پاکستانی پنجاب سے آئے [redacted] مہمانوں کے لئے پنجابی روائتی کھانے دیسی گھی پراٹھے، مکھن، لسی، ساگ، گوشت [redacted] کھیر کوفتے وغیرہ رکھے گئے تھے۔ سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ تھی کہ یہ کھانے خود انہی ماں باپ نے مہمانوں کو پیش کئے۔ ان کا

پاکستانیوں سے شوق ملاقات' محبت' خلوص اور مہمان نوازی کا جذبہ متاثر کن تھا۔ شاید یہ دوستی کا سب سے اچھا اور بڑا مظاہرہ تھا۔ سکول نے ایک رنگا رنگ پروگرام ترتیب دیا تھا۔ جس میں راجستھانی ڈانس اور مختلف علاقوں کے لوک گیت اور موسیقی کے پروگرام پیش کئے گئے۔ آخر میں بندے ماترم کا ترانہ / گیت گایا گیا جسے تقریباً" دو ہزار شرکاء نے اکٹھے مل کر گایا۔ حال ہی میں بھارت کی موجودہ بی جے پی حکومت نے احکامات دئے کہ بندے ماترم کا گیت بھارت کے ہر تعلیمی ادارے میں لازمی گایا جائے۔ بھارت کی مسلمان اقلیت نے اس پر اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ اس ترانے میں کہا گیا ہے کہ ہم وطن کی سرزمین کو پوجتے ہیں جبکہ اسلام میں پوجا صرف خدا کی ہو سکتی ہے۔ مسلمانوں کی طرف سے اس کے خلاف عدالت میں کیس دائر کیا گیا۔ عدالت نے فیصلہ دیا کہ اس حکم کا اطلاق اقلیتوں پر نہیں ہونا چاہئے۔

بھارت کے ایک صحافی منور اے راہی کا کہنا ہے کہ موجودہ حکمران جماعت بی جے پی اور کٹروادی پارٹی کے علاوہ بھارت کی سب سیاسی جماعتیں اس بات کے خلاف ہیں کہ بندے ماترم کے ترانے کو اقلیتوں سے زبردستی گنوایا جائے۔ ان کے بقول بی جے پی کے اندر بھی کئی لیڈر ایسی پابندی کو بھارت کے سیکولر آئین کی روح کے خلاف سمجھتے ہیں۔ لیکن سیاسی مصلحت کی بنا پر وہ اس کے خلاف کھل کر آواز نہیں اٹھاتے۔

تاج محل

دنیا بھر سے بڑی تعداد میں سیاح آگرہ میں تاج محل دیکھنے آتے ہیں جسے شاہ جہاں نے اپنی ملکہ ممتاز محل، کی محبت میں بنیـ ن تعمیر کا یہ نادر نمونہ عجائبات دنیا کا ایک حصہ ہے۔ دہلی سے ین چار ریل گاڑیاں آگرہ کیلئے چلتی ہیں۔ مجھے سب سے زیادہ دلچسپ سفر دہلی سے آگرہ کا لگا۔ یہ ٹرینیں صبح سویرے آگرہ کے لئے روانہ ہوتی ہیں۔ جس میر کے طول و عرض سے لوگ ان ٹرینوں میں سفر کـ ۔ زیادہ تر لوگ تاج نے جاتے ہر، جن میں غیر ملکی، سارح بھی، ہوتے ہیں ۔ گھنٹے کا یہ سفـ لچسپ اور پر لط اس میر کی لڑکیاں گروپس کی صورت میں نظر آئیں۔ ٹرین میں ہر جگہ بے تکلفی سـ مرد خواتین لڑکے لڑکیاں ایک ساتھ بیٹھے تھے۔ جس کو گہ ملی بیٹھ گیا۔ عموی مار تاکہ یہاں مکسڈ سوسائٹی ہے اور اس جہان رگ میں مرد عورت کی تخصیـ ن کی الگ الگ حیثیت کا تعین نہیں ہوتا۔ خواتین باعتماد اور ہوشیار نظر آتی تھیں۔ لڑکیاں روانی کے ساتھ انگریزی میں گفتگو کرتی تھیں۔ غریب گھرانے کے افراد کی بڑی تعداد بھی ریلوں میں سفر کرتی ہے۔

تاج محل کی خوبصورتی لاجواب ۔ کا کمال یہ ہے سے دیکھتے ہی دل ہو جاتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے سفید پری اپنے پر پھیلائے ہمارا استقبال ہے۔ پہلی بار میں اسے دیکھ کر دم بخـ ۔ اس کے حسن و جمال' نفاست' وقار' سادگی' نقش و نگار اور مینا کاری کمال کی ی۔ کئی فوٹو بنائیں۔

تاج محل کے بیرونی دروازے سے اندر ا تو ملکہ ممتاز اور شاہ جہـ خوبصورت مقبروں پر نظر پڑی۔ مقبروں کے گرد انتہائی یب اور خوبصورت جالی ہے جس پر ـ ارت سے نقش و نگار کئے گئے تھے۔ اس وقت مجھے یہ شعر اچھا لگا۔

اک شہنشاہ نے بنا کر حسین تاج محل
ساری کو محبت کی نشانی دی ہے

ان ... بت کرنے والے کتنی خا... ش ... ایک دوسرے کے پہلو میں
لیٹے ہوئے ... ں نے جھٹ سے مقبر... اسی لمحے ایک ہاتھ میرے
ہنے کندھے پر پڑا۔ "بابو جی! آپ نے فوٹو ... ں۔ معلوم نہیں اس کی ... نع
ہے۔" میں نے پلٹ کر دیکھا تو ایک شخص مجھے گھور رہا تھا۔ اس نے اپنے سا
ہوئے ایک اور شخص ... کرتے ہوئے کہا۔ "... ں کے گارڈ ہیں۔ ... ی
کنفیوز ہو گیا تھا۔ ... معلوم نہ تھا کہ ... فوٹو بنانا منع ہے۔ ... نے
کرخت آو... ما" صاحب آپ نے پڑھا ہی نہیں ... پر صاف ... میں لکھا
ہے کہ اس کی فوٹو بنانا منع ہے۔ آپ کون ہیں اور کہاں سے ... ں"
میں نے کہا میں پاکستانی ... نے باہر لکھا نہیں پڑھا۔ ... اگر آپ چاہیں تو کیمرے
سے فلم نکال لیں۔ یہ سن ... ں میں کچھ باتیں کرنے لگے اور مجھے کہا کہ آپ
سب کچھ دیکھ لیں اور جاتی ... ں ملے جانا۔ میں ایک بار پھر دیواروں پر
خوبصورت ... نگار اور حسن و ... اس شاہکار کو دیکھنے ... اتنی دوران میں
نے ... 20 روپے نکال ... ور گیٹ ... ہوئے اسے پیسے
... یہ رکھلیں" وہ بولا "یہ کیا دیتے ہو ... دوسرا ساتھی گارڈ یہ سب
کچھ دیکھ رہا ... قریب آکر اپنے ساتھی سے بولا "ابے لے لو جو کچھ دیتا ہے"
میں نے باہر جاتے ہوئے سوچا۔ پاکستان اور بھارت کے معاشروں میں کیا فرق
ہے۔ غربت ہی کرپشن کو جنم دیتی ہے۔ اس کرپشن میں بھی برابر کا شریک ہوں۔ دنیا بھر
کی نفسیات ایک ہی نقطے پر مرکوز ہو گئی ہے۔ ... پیٹ روٹی کے آگے دم توڑ
... ہیں۔

شاہ جہا... اتنا قیمتی تحفہ اپنی محبوبہ کو دے کر ان تما... کی محبت کا مذاق
اڑایا ہے جو ... دینے ... کر سکتا ... نہیں۔ تصویر کا دوسرا ... یہ ہے۔

اک شہنشاہ نے بنا کر حسین تاج محل
ہم غریبوں کی ... کا اڑایا ہے مذاق

آگرہ میں دوسری تاریخی یادگار آگرہ فورٹ ہے جو اپنے وقار' بناوٹ' نقش و نگار اور خوبصورتی کی وجہ سے بے حد پر کشش ہے۔ یہ جگہ بھی سیاحوں کا مرکز بنی رہتی ہے۔ یہاں ایک میوزیم ہے جہاں تاریخی نوادرات بڑی حفاظت اور سلیقے سے محفوظ کئے گئے ہیں اسی جگہ میں نے ایک کرتا (شرٹ) دیکھی جس پر قرآنی آیات لکھی ہوئی تھیں۔ شیشے کے جس فریم میں یہ نوادر محفوظ کیا گیا تھا اس فریم کے باہر لکھا تھا۔ "ایسا لباس مخصوص شخصیات/بادشاہوں کے زیر استعمال رہتا تھا۔"

ایسا لگتا ہے کہ سترھویں صدی میں ایسے لباس کو زیب تن کرنا ناجائز نہیں سمجھا جاتا تھا۔

واپسی پر پولیس سٹیشن رپورٹنگ کے لئے گیا اور انہیں بتایا کہ میں نے تاج محل دیکھ لیا ہے اور ابھی واپس جانا ہے۔ آپ سٹمپ لگا دیں۔ اس پر موجود متعلقہ پولیس اہلکار تھانہ انچارج کو بلا کر لایا اور کہا کہ آپ کو پہلے یہاں رپورٹ کرنا تھی بعد میں تاج محل دیکھتے۔ یہ تو قانون کی خلاف ورزی ہوگئی۔ بات رشوت پر ختم ہونا تھی۔ لیکن جو پیسے میں نے انہیں دینے کے لئے نکالے وہ کم تھے۔ جس پر انہوں نے پیسے لئے بغیر ہی جانے کی اجازت دے دی۔

اجمیر شریف

پاکستان سے بھارت جانے والوں کو بھارت سرکار دہلی کے علاوہ اجمیر شریف کا ویزہ بھی دیتی ہے۔ اجمیر میں عظیم صوفی بزرگ حضرت خواجہ معین الدین چشتی کا مزار ہے۔ پاکستان سے بہت سے زائرین درگاہ کی زیارت کیلئے اجمیر جاتے ہیں۔ ہر سال یہاں عرس بھی منایا جاتا ہے جہاں دنیا کے طول و عرض سے ہزاروں لوگ آتے ہیں۔ پاکستان سے وزارت مذہبی امور کی نگرانی میں ایک وفد بھیجا جاتا ہے جو عرس کی تقریبات میں شرکت کرتا ہے۔

اجمیر شہر بھارت کے صوبہ راجستھان کے درمیان جے پور سے مغرب کی طرف 130 کلو میٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ اجمیر نے بادشاہوں کا اقتدار اور زوال دیکھا ہے۔ ساتویں صدی کے شروع میں اجے پال چوہان نے اسے آباد کیا تھا۔ آج یہ شہر مسلمانوں کے اسلامی تشخص کی علامت کے طور پر پہچانا جاتا ہے۔ اجے پال نے تاڑاگڑھ کا قلعہ بھی تعمیر کیا۔ چوہان خاندان کئی برسوں تک یہاں حکومت کرتے رہے۔ 12 ویں صدی کے آخر میں چوہانوں کے آخری بادشاہ، پرتھوی چوہان محمد شاہ غوری کے ساتھ جنگ میں مارا گیا اور اجمیر براہ راست دہلی سلطنت کے کنٹرول میں آگیا۔

اجمیر کئی طرح کے اتار چڑھاؤ دیکھتا رہا۔ اکبر بادشاہ 1556ء میں تخت نشین ہوا تو اس نے اجمیر کو مکمل صوبے کا درجہ دیا۔ اس نے راجپوتانہ میں کاروائی کیلئے اجمیر کو مرکز بنالیا۔

اجمیر میں راجپوت، مغل، مرہٹے اور غیر ملکی حکمران قابض رہے۔ 1818ء کے بعد سے یہ برطانوی راج کے زیر تسلط رہا ہے۔ جس نے اسے اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنائے رکھا۔ اجمیر میں بہترین تعلیمی ادارے قائم ہیں۔ اس شہر کو ہمیشہ سے تعلیمی سرگرمیوں کے لئے بہترین اور موزوں جگہ سمجھا جاتا رہا۔ یہ شہر حضرت خواجہ معین الدین چشتی کی وجہ سے شہرت رکھتا ہے۔ اکبر بادشاہ نے بھی اپنے دور میں معین الدین چشتی کی درگاہ پر حاضری دی تھی۔

حضرت معین الدین چشتی سنٹرل ایشیا کے ایک گاؤں چشت میں پیدا ہوئے آپ

حضرت عثمان ہارونی کے شاگرد تھے۔ جب تعلیم سے فارغ ہوئے تو آپ کے استاد نے حکم دیا کہ آپ ہندوستان جا کر تبلیغ کا کام کریں چنانچہ آپ اپنا ایک ذاتی باغ اور ایک چکی بیچ کر ہندوستان چلے آئے۔ ہندوستان میں پہلے قیام لاہور میں ہوا۔ اس وقت حضرت داتا گنج بخش وفات پا چکے تھے۔ آپ نے ان کے مزار پر حاضری دی اور اعتکاف کیا۔ انہوں نے یہ شعر کہا

گنج بخشے فیض عالم مظہر نور خدا
ناقصاں را پیر کامل
کاملاں را رہنما

یہ شعر داتا گنج بخش کے مزار پر لکھا ہوا ہے۔

آپ دہلی سے ہوتے ہوئے اجمیر میں آگئے اور یہیں ڈیرے ڈال لئے۔ اس زمانے میں مسلمانوں کی آمد کا یہ پہلا مسافر تھا۔ جو تبلیغ کیلئے یہاں آیا۔ اس وقت دہلی میں پرتھوی راج کی حکومت تھی۔ آپ نے سب سے پہلے یہاں کے رسم و رواج زبان و کلچر کا مطالعہ کیا۔ تبلیغ کے لئے قوالی کا طریقہ اپنایا۔ آپ کے ذاتی کردار کی وجہ سے لوگ جوق در جوق آپ کی طرف رجوع کرنے لگے اور اس طرح خواجہ صاحب کی شہرت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اس بڑھتی ہوئی مقبولیت پر راجہ نے تو کوئی اعتراض نہ کیا البتہ ان کے درباری برہمنوں کو تشویش ہونے لگی۔ انہوں نے آپ کو تنگ کرنے کی کوشش کی لیکن آپ کے اخلاق اور اسلامی تعلیمات کی کشش نے سب کے دل جیت لئے۔

شہاب الدین غوری کے حملے کے بعد پرتھوی راج قائم ہوا تو دلی میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہوگئی۔ آپ نے کئی اور جگہ بھی تبلیغی ادارے قائم کئے۔ آپ نے اپنے شاگرد حضرت بختیار کاکی کو دہلی میں تبلیغ کے کام پر معمور کیا۔ پاک پتن میں حضرت بابا فرید کو تبلیغ دین کی ہدایت کی اور کئی دوسری جگہوں پر دین اسلام کی تبلیغ کا دائرہ وسیع کیا۔

آج بھی آپ کی درگاہ مرجع خلائق خاص و عام ہے۔ دور دور سے لوگ اظہار عقیدت کے لئے درگاہ پر حاضری دیتے ہیں ان میں مسلمانوں کے علاوہ ہندو بھی شامل ہیں۔

درگاہ کے احاطہ میں دو بڑی دیگیں رکھی ہیں۔ سارا سال زائرین اور عقیدت مند ان کے اندر پیسے زیورات اور دیگر قیمتی اشیاء نذرانے کے طور پر پھینکتے رہتے ہیں۔ جبکہ عرس کے دنوں میں چاول' ڈرائی فروٹ اور دیگر کھانے کی اشیاء سے یہ دیگیں بھر جاتی ہیں۔ جو بعد میں دربار کے مجاوروں وغیرہ کے پاس چلی جاتی ہیں۔ اس میں سے کچھ حصہ چاول وغیرہ پکا کر تبرک کے طور پر لوگوں میں بانٹ دیا جاتا ہے۔ پہلی دفعہ جب درگاہ پر گیا تو میرا ہندو دوست بھی میرے ساتھ تھا۔ مزار کے اندر خواجہ صاحب کی قبر کے چاروں کونوں میں متولی / مجاور ہاتھ میں سبز رنگ کی چادر لئے کھڑے تھے۔ چادر کا ایک پلڑا قبر پر رکھا ہوا تھا اور ایک کونہ انہوں نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔ اندر داخل ہونے والے ہر شخص کو قبر کے چاروں کونوں میں کھڑے اشخاص اپنی طرف بلاتے اور اپنے ہاتھ میں پکڑی چادر والا کونہ اس کے سر پر رکھ کر دعا مانگتے اور پھر اس سے نذرانہ طلب کرتے۔ جو شخص ان کی چادر پکڑ کر دعا نہ کرواتا یا نذرانہ نہ دیتا وہ اس کی طرف گھور کر دیکھتے اور نذرانہ وصول کرنے کے لئے سیدھے سادھے عقیدت مندوں پر نفسیاتی دباؤ ڈالتے۔ ان کے اپنے خاص بندے دروازے کے باہر بھی کھڑے رہتے ہیں اور ہر آنے والے کو دعا کرانے کے لئے اپنے آدمی کے پاس لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔

دہلی میں حضرت نظام الدین اولیا اور حضرت امیر خسرو کے مزارات پر بھی مجاوروں کا قبضہ ہے۔ وہ رجسٹر لیکر مزار کے صحن میں کھڑے رہتے ہیں اور ہر آنے والے کا نام و پتہ لکھ کر اس سے چندہ مانگتے ہیں سادہ لوح زائرین ان کے اثر میں آکر نذرانے کی رقم حسب توفیق دے دیتے ہیں۔

پاکستان میں حضرت داتا گنج بخش کے مزار پر بھی بہت عرصہ مجاوروں کا قبضہ رہا

تاوقتیکہ یہاں محکمہ اوقاف بن گیا اور نذرانے سے وصول ہونے والی نقدی' زیورات وغیرہ اب منصوبہ کے تحت مزارات کی توسیع اور دیگر فلاحی کاموں پر خرچ کیا جاتا ہے۔ میرے استفسار پر بھارتی میزبان کا کہنا تھا کہ حکومت ہند کے لئے ایسا کرنا مشکل ہے۔ یہاں دیگر مذہبی عبادت گاہوں / مزارات کی فلاح کیلئے اور مجاوروں کو الگ کرنے کے لئے کوئی قانون موجود نہیں۔ اگر ایسا کیا جائے تو الزام لگے گا کہ کسی کے مذہبی معاملات میں مداخلت کی ہے۔ یہ مسئلہ صرف مسلمانوں کے مزارات کا نہیں بلکہ مندروں' گرجاؤں' گردواروں پر خرافات بدنظمی اور کرپشن کو روکنے کی ضرورت ہے۔ اتفاق رائے سے انتظامی اصلاحات کیلئے اصول وضع کئے جا سکتے ہیں۔ یا کسی ادارے کی تشکیل ممکن ہو سکتی ہے جیسے پاکستان میں محکمہ اوقاف۔ تاہم براہ راست کسی کی مذہبی عبادت گاہوں پر حکومتی کنٹرول کو کوئی فرقہ پسند نہیں کرتا۔

انور ملک کی کہانی

انور ملک ضلع جالندھر کے ایک چھوٹے سے گاؤں بکھلور میں 14 نومبر 1937ء کو پیدا ہوئے۔ اسی گاؤں کے ایک چھوٹے سے سکول سے اس نے چار جماعتیں پاس کیں۔ اس سکول کے راستے میں آم کا ایک بڑا درخت تھا۔ جہاں وہ اپنے ہم جماعت دوستوں کے ساتھ سکول سے واپس آتے ہوئے دوپہر میں اور کبھی شام کے دھندلے سایوں میں گھنٹوں کھیلا کرتا تھا اور آموں کے موسم میں آم توڑ کر کھایا کرتا تھا۔ سکول جاتے ہوئے راستے میں جوہڑ سے اپنی تختی دھو کر اس پر گاچی مل لیتا جس پر سکول میں املاء لکھنا ہوتی۔

لہلہاتے سرسبز و شاداب کھیتوں اور آموں کے باغوں میں گھرا ہوا یہ چھوٹا سا گاؤں انور ملک کے بچپن کا سرمایہ تھا۔ اسے یہاں کی ہر چیز سے پیار تھا۔ اس کے سارے دوست ساتھی، ماسٹر جی درخت چھپڑ، باغ سکول گھر، محلے کے گلی کوچے کھیت یہ سب اس کی ننھی منی دنیا تھی۔ جو اس کی زندگی میں رچ بس گئی تھی۔

معصوم انور ملک کو نہیں معلوم تھا کہ زندگی کے یہ سارے یادگار لمحے اب ایک دم خواب ہو جائیں گے۔ اسے یہ گاؤں اور سب کچھ چھوڑنا ہوگا۔ اس کا معصوم ذہن اور دماغ یہ سب قبول کرنے کو تیار نہ تھا۔ وہ اتنا چھوٹا تھا کہ اپنے ابو، امی، ماسٹر جی محلے کے دوستوں اور سیاسی لیڈروں سے یہ سوال نہیں پوچھ سکتا تھا کہ وہ یہ گاؤں اور یہاں کا سب کچھ آخر کیوں چھوڑے۔ انور ملک کے ماں باپ اسے ایک نئے اور آزاد ملک پاکستان لے آئے۔

انور ملک جوان ہو چکا تھا۔ وہ ایک سکول میں ٹیچر بھرتی ہو گیا اور ترقی کرتے کرتے اب ہیڈ ماسٹر بن چکا تھا۔ لیکن اس کے دل و دماغ سے بچپن کے بیتے دن اوجھل نہ ہو سکے۔ اسے اپنے گاؤں بکھلور کا سب کچھ اسی طرح یاد تھا۔ آموں کے درخت، چھپڑ، محلے کے لوگ، ہم جماعت دوست، ماسٹر جی کی رفاقت، لہلہاتے سرسبز و شاداب کھیت۔ وہ سوچتا بچپن کے وہ دوست اب کیسے ہوں گے کہاں ہوں گے وہ آموں کا درخت اور چھپڑ کیا اب بھی ویسا ہی ہوگا۔ اس کی خواہش تھی وہ بکھلور جا کر اپنا پیارا گاؤں دیکھ

سکے۔ اپنے بچپن کے تمام ساتھیوں کو مل سکے۔ وہ گھر دیکھ سکے جہاں وہ پیدا ہوا تھا جسے وہ آج تک تسلسل کے ساتھ خوابوں میں دیکھتا رہا ہے۔ بس یادیں تھیں جو باقی رہ گئی تھیں۔

بارہا ایسا ہوا کہ وہ خواب میں بکھلور جا رہا ہے وہ بے حد خوش اور پر جوش ہے۔ جیسے اس کی مرادیں پوری ہو گئی ہیں۔ اب وہ اس مٹی کی خوشبو سونگھ لے گا جہاں اس نے جنم لیا۔ وہ اپنے تمام ساتھیوں سے بغلگیر ہو گا ان سے گھنٹوں باتیں کرے گا۔ بچپن کے سارے لمحے ساری یادیں سمیٹ لے گا۔

پھر یہ ہوتا کہ خواب ہی میں اسے بارڈر پر روک لیا جاتا اور کہا جاتا۔ واپس جاؤ۔ تمہارے پاس ویزا نہیں۔ تم بھارت میں داخل نہیں ہو سکتے۔ تم ادھر کے ہو۔ ادھر نہیں آسکتے۔ پھر وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا۔ حسرت و یاس اور نا امیدی کے آنسو اس کے اندر ہی گر جاتے۔ وہ بیوی بچوں کو اپنا خواب سناتا۔ وہ ایسی خوابیں پہلے بھی سن چکے ہوتے اس لئے اس کا زیادہ نوٹس نہ لیتے۔ اور وہ کر بھی کیا سکتے تھے۔ انور ایک اچھا شاعر ہے اس کی کتاب پر احمد ندیم قاسمی کا تبصرہ لکھا ہوا ہے۔ اس نے اپنی کتاب میں اپنے گاؤں بکھلور پر کئی نظمیں لکھیں اور اشعار میں اس کی تصویر کشی کی۔ وہ پچاس سالوں سے یہ امیدیں لگائے بیٹھا تھا کہ کب پاک بھارت جھگڑے ختم ہوں اور کب اسے اپنا گاؤں دیکھنا نصیب ہو۔ انور ملک کا بڑا بیٹا منصور ملک اپنے باپ کی اندر کی خواہشوں کو دور تک دیکھتا اور محسوس کرتا تھا۔ وہ اب ملک کے ایک بڑے اخبار "ڈان" کا صحافی تھا۔ وہ اپنے باپ سے کہتا آپ ضرور اپنا گھر اپنا گاؤں دیکھیں گے۔ میں کوشش کر کے آپ کو ویزہ لے کر دوں گا اور میں آپ کے ساتھ جاؤں گا۔ امید اور روشنی کا ایک لمحہ آیا جب بھارت میں آئی کے گجرال اور پاکستان میں نواز شریف برسر اقتدار آگئے۔ انور ملک کو میری کوششوں سے ویزہ مل گیا اور وہ اپنے بیٹے کے ساتھ دہلی پہنچ گیا۔ اس کے پاس جالندھر کا ویزہ نہیں تھا۔ وہ تو اپنا گاؤں دیکھنے گیا تھا۔ دہلی کے امیگریشن افسر سے انور ملک نے درخواست کی کہ اسے جالندھر کا ویزہ دے دے۔

اس کی سفارش کیلئے SAF کے سیکرٹری جنرل اس کے ہمراہ تھے۔ افسر کا کہنا تھا یہ مشکل ہے ہم پاکستانیوں کو پنجاب کا ویزہ نہیں دیتے۔ انور ملک کی شدید خواہش اور مسلسل اصرار پر اس نے پوچھا آپ جالندھر میں کس کے پاس جائیں گے۔ انور ملک نے کہا میں وہ درخت دیکھنا چاہتا ہوں جہاں سے بچپن میں آم توڑا کرتا تھا۔ وہ جھوہڑ دیکھوں گا جہاں سکول جاتے ہوئے تختی دھویا کرتا تھا۔ وہ کھیت دیکھوں گا جہاں سے گزر کر گھر واپس جاتا تھا۔ وہ گھر دیکھنا چاہتا ہوں جہاں پیدا ہوا تھا۔ ان لوگوں کو ڈھونڈوں گا جو میرے بچپن کے دوست تھے۔ میں جالندھر اپنے بچپن کے دن ڈھونڈے جانا چاہتا ہوں۔ وہ میرے گاؤں میں آج بھی اسی طرح موجود ہیں۔ جہاں دیدہ امیگریشن افسر کے دل میں یہ باتیں اتر گئیں اس نے اپنے ماتحت افسر کو ہدایت کی کہ جالندھر فیکس کرو اور انور ملک کے لئے سیکیورٹی کلیرنس مانگو۔ اگر وہاں سے جواب نفی میں آئے تو انہیں میری ضمانت پر ویزہ لگا دو۔ انور ملک اپنے گاؤں ضرور جائے گا۔

انور ملک کی خواہشیں پوری ہوگئی تھیں۔ سپنے حقیقت کا روپ دھار چکے تھے۔ خیالوں کے تانے بانے جو وہ ایک عرصے سے بن رہا تھا اب حقیقت کا روپ دھار چکے تھے۔ انتظار کی اتنی صبر آزما گھڑیاں ختم ہوگئی تھیں۔ بچپن کا ہر لمحہ اس کے سامنے زندہ حقیقت بن کر جگمگا رہا تھا۔ بچپن کے دن خوبصورت ہوتے ہیں۔ یہ محسوسات کے آئینے میں رہتے ہیں لیکن کبھی کبھی یہ آواز بن کر گونجنے لگتے ہیں۔ جیسے ان کے پاؤں میں کسی نے گھونگھرو باندھ دئے ہوں اور وہ رقص کرنے لگیں۔ انور ملک کا رواں رواں اندر سے رقص کر رہا تھا۔ سب چیزیں تو اکٹھی ہوگئی تھیں۔ وہ خوبصورت دنوں کو اپنے نظاروں سمیت اپنے قریب آس پاس دیکھ رہا تھا۔ سکول کے ہم جماعت اب پچاس سال پرانے لوگ تھے۔ لیکن انہیں مل کر یوں لگ رہا تھا جیسے آج بھی سکول اکٹھے پڑھتے ہوں۔ اسے سکول دیکھتے ہوئے ہر دن اسی طرح یاد آرہا تھا۔ ماسٹر جی فوت ہو چکے تھے۔ لیکن ان کی آواز اسے آج بھی اپنے کانوں میں گونجتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ ”بیٹا انور کل تم نے درخت سے پھر آم توڑے۔ زمیندار نے آج پھر تمہاری

شکایت بھجوائی ہے کہ سکول کے بچے اس کے کھیتوں کے درخت سے آم توڑتے ہیں۔ اس میں تمہارا نام بھی ہے میں نے اسے پیغام بھجوا دیا ہے کہ میں بچوں کو سمجھا لوں گا۔ اب دوبارہ تمہاری شکایت نہیں آنی چاہئے۔" "جی ماسٹر جی اب ایسا نہیں کروں گا۔"

وہ جوہڑ جہاں سے انور ملک تختی دھویا کرتا تھا آج بھی اسی طرح موجود تھا۔ بس تھوڑا سکڑ گیا تھا۔ وہ درخت جہاں سے آم توڑا کرتا تھا بالکل ویسا ہی تھا انور ملک جب اپنا گھر دیکھنے وہاں پہنچا تو اس کی تصویر بنانے لگا۔ گھر کے مالک نے اسے منع کر دیا "تم میرے گھر کی تصویر کیوں بنا رہے ہو" انور ملک نے کہا یہ میرا گھر ہے۔ میں یہیں پیدا ہوا تھا۔ تم مجھے منع نہیں کر سکتے۔ گھر کا موجودہ مالک اس سے بغلگیر ہو گیا۔ اسے اپنے گھر کے اندر لے گیا سب گھر والوں سے اس کا تعارف کرایا اور کہا یہ پاکستان سے اپنا گھر دیکھنے آئے ہیں۔ انور ملک نے اس کمرے کی تصویر بنائی جہاں وہ پیدا ہوئے تھے۔

صاحب خانہ نے انور ملک اور اس کے بیٹے منصور ملک کی شاندار دعوت کی اور اس میں انور ملک کے تمام پرانے دوست اور محلے کے بچپن کے ساتھی بھی بلا لئے۔ تمام محلے کو خبر ہو چکی تھی کہ یہاں وہ پاکستانی آیا ہے جو اس گھر میں پیدا ہوا تھا۔ پورے محلے میں ایک میلے کا سماں تھا۔ انور ملک کو جو خوشی مل رہی تھی وہ اس کے ایک ایک لمحے کو سمیٹ لینا چاہتا تھا۔ وہ لوگوں کی اتنی محبت پا کر جیسے آسمان پر اڑ رہا تھا۔ انور ملک نے واپس آکر مجھے اپنے گھر بلایا اور کہا اویس جی۔ آپ نے میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش پوری کر دی۔ آج میں واپس آکر اپنے بیوی بچوں کو بتا رہا ہوں کہ دیکھ لو۔ میں نے اپنی شاعری میں بکھلور کی جو باتیں کہیں وہ بالکل سچ تھیں۔ میرا بیٹا منصور اس کی تصدیق کرے گا جو میرے ساتھ ساتھ رہا۔ میں انور ملک کی ساری کہانی سن چکا تھا۔ اس کی باتوں میں گم سم تھا۔

مجھے ایک گیت یاد آرہا تھا۔

میرے بچپن کے دن۔ کتنے اچھے تھے دن
آج بیٹھے بٹھائے کیوں یاد آگئے
میرے بچھڑوں کو مجھ سے ملا دے کوئی
میرا بچپن کسی مول لا دے کوئی

کتنی بے لوث تھی اپنی وہ دوستی
کتنی معصوم تھی وہ ہنسی وہ خوشی
جھومتے گاتے ہنستے ہنساتے
اک دوجے پہ جان لٹاتے
کاش پھر وہ زمانے دکھا دے کوئی
میرا بچپن کسی مول لا دے کوئی

وہ گڑیوں کی شادی وہ بچپن کے کھیل
وہ سب مل کے اک گھر بنانے کا کھیل
دن تھے پرانے کتنے سہانے
اک اک کھیل میں سو افسانے
سب کے سب۔ سب وہ فسانے
سنا دے کوئی۔ لا دے کوئی

انور ملک نے ایک خط مجھے دکھایا جس کا متن میں ان کی اجازت سے لکھ رہا ہوں۔

از لاہور

14-10-97

مکرمی و محترم ستیا پال جی

آداب! آپ کو یقیناً" ہمارے خط کا انتظار ہوگا۔ دیر اس لئے ہوئی کہ پندرہ روزہ غیر حاضری سے ہمارے تمام کام رکے ہوئے تھے۔ ان کو نمٹانا ضروری تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ ہمارے تمام عزیز رشتہ دار اور دوست ہماری ہندوستان یاترا پر مسلسل ملنے آرہے ہیں۔ کچھ عزیزوں کی طرف خود جانا پڑا۔ یہاں لوگوں کے ذہنوں میں ہندوستانی اور ہندوستان کے باسیوں کے متعلق جو نظریات مدتوں سے قائم تھے۔ ہماری باتوں سے غلط ثابت ہو رہے تھے۔ وہ محبتیں جو ہم باپ' بیٹا یہاں سے سمیٹ کر لے گئے ہیں۔ لوگوں کے لئے تعجب اور حیرت کا باعث ہیں۔

ہماری ہندوستان یاترا ہمارے حلقہ احباب میں بارش کے پہلے قطرے کے طور پر سامنے آئی ہے۔ ہر شخص کے دل میں ہندوستان دیکھنے کی شدید خواہش نظر آئی۔ ہمارے قریبی رشتہ دار زیادہ تر لدھیانہ' جالندھر' ہوشیارپور اور گورداسپور کے اضلاع سے ہجرت کر کے یہاں آئے ہیں۔ ان لوگوں کے علاوہ نئی نسل کو اپنے آباؤ اجداد کے سابقہ وطن کو دیکھنے اور اس سے متعلق جاننے کی فطری خواہش کا اظہار بھی ہوا۔ عزیزوں کو جب بتایا کہ ہمیں وہاں جا کر اجنبی ہونے کا ذرہ بھر بھی احساس نہیں ہوا۔ یوں لگا جیسے ہم اپنے گھر اور ماحول میں موجود ہوں تو وہ بہت خوش ہوئے۔ برخور دار سریندر اور بیٹی کسوم نے ہمیں شہر' یونیورسٹی اور کالج دکھائے۔ یوں لگا جیسے ہم اپنے ہی بچوں کے ساتھ گھوم پھر رہے ہوں۔ آپ کی بیٹی سے مذہب' اخلاقیات' تعلیم' رسوم و رواج پر کھل کر باتیں ہوئیں۔ آپ کے بھائی نے دونوں دیشوں کے درمیان محبت اور پیار کے رشتوں کو زندہ کرنے پر نہایت درد مندی سے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ ہم

نے بیٹی کسوم کو اپنا سابقہ گھر دکھایا۔ انہیں اپنا سکول اور وہ جوہڑ دکھایا جہاں کبھی میں
، دھویا کرتا تھا۔ وہ آموں کا باغ ں کبھی کھیلا کرتے تھے۔ ان کی ملاقات
اپنے ہم جماعت ساتھیوں سے نے پچاس سال بعد دوستوں کو گلے ملتے
دیکھا۔

جو پودا جناب اویس شیخ صاحب نے اور آپ نے مل کر لگایا ہے اللہ کے کرم سے
پھلے پھولے گا اور پروان چڑھے گا۔ تنظیم ساؤتھ ایشین فریٹرنٹی کا مقصد جو میں سمجھ سکا
ہوں یہ ہے

"میرا پیغام جب سے جہاں تک پہنچے"

میری طرف سے ، بھون، نئی دہلی اور پورے ہندوستان کو سلام

آپ کا بھائی

انور ملک

پارٹیشن کے وقت جبکہ قتل و غارت گری، فسادات، لوٹ مار اور انسانی عزتوں کی
پامالی کا ہولناک اور شرمناک کھیل جاری تھا۔ عین اس وقت بھی انسانیت اپنے شعور کی
لو پر محبتوں کے دیئے وئے تھی۔

یہ 1947ء کی بات ہے اقبال بیگم اس وقت 21 سال کی تھی۔ جب امرتسر کے
قریب واقع ایک گاؤں گھرڈکی میں فسادات پھوٹ پڑے۔ ان فسادات میں اس کے
بہت سے عزیز جان سے ہاتھ دھو بیٹھے اور مجبوراً اپنا آبائی گاؤں چھوڑ کر اپنی دو بیٹیوں
کے ہمراہ لاہور میں ایک مکان پانڈو سٹریٹ کرشن نگر میں منتقل ہوگئی۔ جہاں اس کا بیٹا
اور خاندان کے دوسرے افراد ملے۔ اقبال بیگم آ ان ہولناک ر کو نہیں
بھول سکی۔ شاید وہ انہیں کبھی بھی نہ بھول سکے۔

جب اسے معلوم ہوا کہ اس کا پوتا ساؤتھ ایشین فیرنٹرنٹی کی دعوت پر ایک امن
مشن کے ساتھ امرتسر میں بیساکھی میلے میں شرکت کیلئے جانا چاہتا ہے تو وہ گھبرا گئی۔ اس
نے کسی قدر تلخ اور تشویش بھرے لہجے میں ا سے کہا "ہرگز نہیں۔ تم امرتسر

نہیں جاؤ گے۔ وہ تمہیں قتل کر دیں گے"

اس کے ساتھ ہی اس نے 1947ء کے آنکھوں دیکھے احوال بتانے شروع کر دئے۔ اقبال بیگم کی چھوٹی بیٹی کلثوم کا تجرباتی سفر شادی ہو جانے کے بعد بالکل مختلف نوعیت کا ہے۔ وہ اپنی ماں کی نسبت بالکل مختلف خیالات رکھتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ تقسیم کی ساری تلخیوں اور انسانی جبر کے سارے مناظر کے باوجود اس گھر نے اپنے آنگن میں محبتوں اور انسانی رشتوں کے دئے جلائے رکھے۔

یہ گھر کلثوم کے والد نسبتی چوہدری محمد لطیف کی ملکیت ہے جو ایک سرکاری ملازم ہیں۔ چوہدری لطیف ضلع جالندھر سے ہجرت کر کے لاہور آگئے اور انہیں یہ گھر الاٹ کر دیا گیا۔ یہ خوبصورت گھر ہے جس میں ایک کشادہ صحن دو باتھ روم دو بڑی با لکنیاں دو کچن اور تین بیڈ روم ہیں۔ اس وقت جبکہ ہر طرف افراتفری بد نظمی اور ہنگامی صورت حال تھی کس کو معلوم تھا کہ اس گھر کا اصل مالک کون ہے۔

ایک روز نئے سال کے آغاز کے ساتھ ہی ایک خط چوہدری لطیف کو ملا۔ جس پر 30 دسمبر 1947ء کی تاریخ درج تھی۔ یہ خط جالندھر سے ہری کرشن داس بیدی نے لکھا تھا۔ اس خط کے ساتھ ہی تقسیم کے فوراً" بعد بارڈر کے آرپار رہنے والے ایک ہندو اور ایک مسلمان کی خط و کتابت کا طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔

ایسے وقت میں جبکہ نفرتوں کے سمندروں میں سب کچھ بہہ گیا تھا اور انسانیت شرما رہی تھی۔ چوہدری لطیف اور ہری کرشن داس بیدی امن اور محبتوں کی شمع جلا رہے تھے۔ اپنے ضمیر کی کہانی ایک دوسرے کو سنا رہے تھے اور انسانیت زندہ ہے کا نعرہ لگا رہے تھے۔

کلثوم نے اس خط کو کئی سالوں کے بعد اپنے والد نسبتی کی الماری سے حاصل کیا تھا۔ اسی طرح کے کئی اور خطوط اس نے میرے دوست عارف شمیم کو دکھائے۔ بیدی کو اپنے گھر میں رہنے والے نئے مالک مکان کے نام کا علم نہ تھا۔ اس لئے اس نے لفافے پر The occupant لکھا۔

خط کا اصل متن:

30-12-47

تسلیم! میں آپ کی خدمت میں یہ خط بطور ایک انسان کے لکھ رہا ہوں۔ امید ہے آپ خیال نہ کریں گے کہ ایک ہندو آپ کو خط لکھ رہا ہے۔ ہم پہلے انسان ہیں اور بعد میں ہندو یا مسلمان۔ مجھے امید واثق ہے کہ آپ اس انسانی ناطے سے میرے اس خط کا جواب ضرور دے کر مشکور فرمائیں گے۔

میں 17 ستمبر کو اپنے مکان نمبر 32 پانڈو سٹریٹ کرشن نگر میں داخل ہوا۔ مجھے پتہ چلا کہ یہ مکان پہلے الاٹ ہو چکا ہے۔ اس لئے میں اپنے مکان سے کوئی چیز نہ لا سکا۔ میں نے بچوں کے کپڑوں والا چھوٹا ٹرنک لانا چاہا مگر سپاہی نے لانے نہ دیا۔ میں سناتن دھرم ہائی سکول لاہور میں سینئر ٹیچر آف انگلش اور حساب تھا۔ میرے شاگرد ہندو مسلم اور سکھ سب تھے اور میری آنکھوں میں ہندو اور مسلم میں کسی قسم کا فرق نہ تھا۔ آپ چوہدری سراج دین سے پوچھئے۔ میں نے اور لالہ دینا ناتھ نے اس کے مکان کی ہر طرح حفاظت کی۔ وہ کرشن نگر میں نہ رہتا تھا۔ ہم نے اسے کسی قسم کا نقصان نہ ہونے دیا۔ سکول بند ہو گیا تھا۔ لاہور میں کافی گڑ بڑ تھی۔ میں اپنے بچوں کو لے کر چھٹیاں گزارنے باہر گیا ہوا تھا اور میرا تمام سامان گھر میں تھا۔ میرا خیال یہ تھا کہ گڑ بڑ بند ہو جائے گی اور ہم ہر حالت میں پاکستان یا ناپاکستان لاہور میں رہیں گی۔ مگر قدرت کو یہ منظور نہ تھا اور میں واپس لاہور صحیح وقت پر نہ جا سکتا اور میرا تمام سامان وغیرہ جاتا رہا۔ جس دن میں اپنے گھر میں گیا تو میری کتابیں فرنیچر اور دوسرا سامان موجود تھا۔ مگر میں اسے لا نہ سکا اور بے مراد واپس آگیا۔ خیر میں آپ کو ایک تکلیف دیتا ہوں۔ میری لوہے کی پیٹی میں کچھ بہت ضروری کاغذات۔ بنک کی پاس بک اور ڈاک خانے کی پاس بک اور انشورنس کی پالیسیاں۔ کچھ رائلٹی کے کاغذ اور کتابوں کے Agreement تھے۔ اگر یہ چیزیں آپ کو میری پیٹی میں سے ملی ہوں۔ تو آپ ان چیزوں کو رجسٹری کرا کے ضرور بھیج دیں۔ لوہے کی پیٹی کی چابیاں کھڑکی کی شیشے والی الماری میں تھیں اور 17

ستمبر کو میں نے لوہے کی پیٹی کو کھلے ہوئے پایا تھا۔ آپ کی خدمت میں التماس ہے کہ یہ سب چیزیں مجھے رجسٹری کر کے بھجوا دیں۔ اور ان کے ساتھ بیمہ کمپنی کی پالیسیاں ضرور بھیجیں۔ ان کے ساتھ ہی پیٹی میں میرے مکان کی رجسٹری اور دو رجسٹریاں دو ٹکرہ جات زمین کی ہیں۔ میرے لئے یہ سب سے زیادہ قیمتی اشیاء ہیں۔ امید ہے آپ ان سب چیزوں کو بھیجنے کی تکلیف ضرور گوارہ کریں گے۔ آپ یہ جان سکتے ہیں کہ میرے لئے یہ کاغذات کس قدر قیمتی ہیں۔ میں کیا لکھوں۔ اس وقت بے گھر ہوں۔ جیب میں پیسہ نہیں اور نوکری سے ہاتھ دھو چکا ہوں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ کیا کروں اور باقی ماندہ زندگی کے دن کیسے بسر کروں۔ اگر آپ میری یہ مدد کر دیں تو میری مشکلات کافی حد تک ہلکی ہو سکتی ہیں۔ ان کاغذوں کی آپ کو ضرورت نہیں اور آپ کے لئے یہ محض کاغذ کے پرزوں کے اور کوئی قیمت نہیں رکھتے۔ مگر میرے لئے باعث زندگی ہیں اس لئے آپ انسانی رشتہ سے میری مدد ضرور کریں۔ میری لائبریری میں بہت سی کتابیں تھیں۔ آپ ان کتابوں کو بوری میں ڈال کر ایک کمرے کے کونے میں رکھ چھوڑیں حالات ٹھیک ہونے پر میں یہ کتابیں لے جاؤں گا۔ جن اشیاء کی آپ کو ضرورت نہ ہو وہ آپ بوری میں ڈال رکھیں۔ برتن اور فرنیچر وغیرہ کا آپ استعمال کریں۔ میری لائبریری میں بہت سی کتابیں بڑی نایاب تھیں۔ جن کی مجھے بہت ضرورت رہتی ہے۔ آپ ان کتابوں کو رکھ چھوڑیں۔ حالات ٹھیک ہونے پر لے جاؤں گا۔

اگر جالندھر یا ہوشیار پور سے کوئی کام میرے لائق ہو تو لکھیں۔ میں بسرو چشم آپ کے کام کروں گا۔ اگر آپ کا ڈاک خانے یا بینک وغیرہ میں کوئی حساب ہووے۔ تو بھی لکھیں۔ میں ہر ممکن کوشش کروں گا کہ آپ کے کام کر سکوں۔ اگر رجسٹری وغیرہ میں زیادہ خرچ ہووے تو آپ پارسل بنا کر وی پی پی بھیج دیں۔ امید ہے آپ میری اس معاملہ میں ضرور مدد کریں گے۔

خدا سے دعا ہے کہ حالات ٹھیک ہوں اور ہم ہندو اور مسلمان پھر ہندوستان اور

پاکستان آجا سکیں اور امن سے رہیں۔

آپ کا خیر اندیش
ہری کشن داس بیدی بی اے۔ بی ٹی
معرفت پنجاب کتاب گھر
گیٹ مائی پیراں۔ جالندھر شہر
30 - 12 - 1947

خط نمبر2
9 - 1 - 48

مکرمی مسٹر محمد لطیف

آداب عرض۔ آپ کا نوازش نامہ ملا۔ میں نے آپ کے خط کو دو تین دفعہ پڑھا اور پڑھ کر محسوس کیا کہ یہ خط مجھے، ایک سچے رفیق کی طرف سے ملا ہے۔ میں نے آپ کے لکھے ہوئے خط کو کئی دوستوں کو پڑھ کر سنایا۔ سب نے یہ فتویٰ دیا کہ اگر سب ہندو اور مسلمانوں کے جذبات ایسے ہوتے جیسے آپ نے اپنے خط میں ظاہر کئے ہیں تو ہندوستان میں یہ خونی ہولی کبھی نہ کھیلی جاتی۔ اور ہم ہندوستان اور پاکستان میں رہتے ہوئے اپنے اپنے وطن کو ایک اونچے آسمان پر پہنچا دیتے۔ مگر پرماتما کو یہ منظور نہ تھا۔ جب مجھے ان حالات کا خیال آتا ہے۔ جو کچھ ہندوؤں اور مسلمانوں نے اپنے ہم وطنوں سے کیا تو پورا جسم لرزنے لگتا ہے اور میں سچے دل سے چاہتا کہ کاش ان واقعات کے ہونے سے پہلے میں اپنی آنکھیں ہمیشہ کیلئے بند کر لیتا تاکہ میں آنے والی نسلوں کو ان واقعات کا ذکر تک نہ کر سکتا۔

خیر جو کچھ ہوا اس کیلئے ہم جیسے شریف ہندو اور مسلمان رتی بھر ذمہ دار نہیں۔ یہ ایک پاگلانہ جنون تھا۔ جس نے ہندو اور مسلمان دونوں کی آنکھیں اندھی کر دیں اور سب سے بری بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ مذہب ایمان اور دھرم کے لئے ہوا۔ کوئی مذہب یا دھرم اس خونی ہولی کی اجازت نہیں دیتا۔ شاید قدرت نے ہمارا امتحان کرنا تھا

جس میں ہم بری طرح فیل ہوئے ہیں اور دنیا کے لوگوں کے سامنے منہ نہیں دکھا سکتے۔ خیر میری دعا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان میں امن و امان ہو اور ہم پھر آزادانہ طور پر ایک جگہ سے دوسری جگہ جا سکیں۔ جو کچھ ہوا ہے یہ پاور پالیٹکس کی وجہ سے ہوا ہے۔ میں آپ کے جذبات و خیالات کا سچے دل سے احترام کرتا ہوں۔ اور شاید آئندہ زمانہ میں ہم ایک دوسرے کے سچے رفیق و مددگار ثابت ہو سکیں۔ آپ جیسے نیک انسان سے یہ امید تھی کہ آپ دوسرے انسان کی مدد کرنے میں قلبی راحت محسوس کریں گے۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ جیسے نیک انسان کو اس گڑ بڑ میں تکلیف ہوئی اور باوجود مشرقی پنجاب میں خدمات پیش کرنے کے آپ کو پاکستان میں جانا پڑا۔ مگر ہمارے بھائیوں نے حالات ایسے پیدا کر دئے کہ ایک ہندو اور سکھ کا مغربی پنجاب میں اور ایک مسلمان کا مشرقی پنجاب میں رہنا محال ہوگیا۔ مگر شکر کا مقام ہے کہ آپ مع اہل و عیال کے لاہور پہنچ گئے۔ مگر جائیداد کے نقصان کا افسوس ضرور ہے۔ امید کامل ہے کہ دونوں سلطنتوں میں جائیداد کے متعلق جلد فیصلے ہوں گے اور شاید ہم جائیداد کے تبادلے کر سکیں اور ہماری مصیبتوں میں کچھ کمی ہو جائے۔ فی الحال سوائے قسمت کے کوسنے کے اور کوئی چارہ نہیں۔

میں نے آپ کی دونوں عرضیاں پڑھی ہیں۔ آپ نے سنٹرل کوآپریٹو کی نئی پاس بک کے متعلق لکھا ہے۔ میری عرض یہ ہے کہ آپ کو نئی پاس بک حاصل کرنے میں چنداں فائدہ حاصل نہ ہوگا۔ آپ مجھے ایک درخواست اس مطلب کی لکھ کر ارسال کریں کہ میرا حساب امرتسر کوآپریٹو بینک سے لاہور کو آپریٹو بینک میں تبدیل کر دیا جائے۔ تاکہ آپ یہ روپیہ لاہور کوآپریٹو بینک سے حاصل کر سکیں۔ باقی کام میں خود کر لوں گا اور اس کے متعلق آپ کو اطلاع دے دوں گا۔

ڈاک خانے کے حساب کی تبدیلی کے متعلق عرض یہ ہے کہ آپ اپنا سیونگ بینک کا اکاؤنٹ نمبر لکھیں۔ نیز یہ لکھیں کہ حساب کب کھولا تھا۔ تاکہ میں کچہری پوسٹ آفس سے آپ کا نمبر دے کر حساب لاہور میں تبدیل کرا سکوں۔ میں ہر ممکن کوشش

کروں گا کہ آپ کو یہ رقم جلد از جلد امرتسر سے لاہور پہنچ سکے اور میں آپ کی کچھ خد[illegible] میں اپ[illegible] بھتا ہوں۔ میں بعد میں کسی دن آپ کے گاؤں جاؤں گا اور پٹواری سے مل کر آپ کی چاغی اور بارانی زمین کے متعلق واقفیت حاصل کر کے آپ کو[illegible] خط لکھوں گا کہ اس کے متعلق [illegible] کی کونسی خدمت کر سکتا ہوں۔ میں [illegible] باب میں ہوتا ہوا آپ کے بوجھوں [illegible] ہلکا کر سکوں تو اپنی سرخروئی سمجھوں۔

آپ نے میری جائے [illegible] نے یہ ضرور دیکھا ہوگا کہ میں لاہور میں بطور سینئر [illegible] کام کرتا [illegible] 200 روپیہ تنخواہ تھی [illegible] ہری لکھی ہوئی کتابیں پ[illegible] کے [illegible] ان کتابوں کی را[illegible] مجھے چار ہزار اور پانچ [illegible] یہ سالا[illegible] ہوتا تھ[illegible] اپنے بال بچوں کے درمیا[illegible] خوشی او[illegible] ر [illegible] تا تھا۔ و[illegible] قسم کے آرام تھے۔ بچے تھے۔ وفادار بیوی تھی [illegible] نے پینے کو [illegible] مل جاتا تھا۔ یہ [illegible] گوشت اور [illegible] بجلی تھی۔ مگر ان سب چیزوں کو مع مال و اسباب سب [illegible] ست کو [illegible] سے چلا گیا تھا اور خیال تھا کہ 20 اگست تک واپس آجاؤں گا۔ مگر واپس نہ آ[illegible] میں 17 ستمبر کو اپنے گھر گیا تو آپ کے نیاز حاصل نہ ہو سکے۔ میں سپاہی کے کہنے پر آپ کی غیر حاضری میں گھر [illegible] ہر ہر [illegible] چیز کو مکان سے گم پایا۔ میرے گھر میں [illegible] سامان کے علاوہ 200 رس امریکن پینسلوں کے تھے۔ جو میں نے امریکہ [illegible] ٹ امپورٹ کئے تھے اور میں اپنے گرم کپڑے بھی شیشے والی لا[illegible] ں رکھ آیا تھا۔ مگر ان [illegible] کو

[illegible] سی حالت دیکھ کر میں گھبرا گیا اور اپنے گھر میں جسے میں نے بڑی محنت اور کاوش سے بنایا تھا۔ چوروں کی طرح ایک سپاہی کے ساتھ [illegible] وا اور بغیر کچھ لئے واپس آگیا۔

میں نے [illegible] ہ جانے کی زحمت اس لئے نہ کی تھی کہ میرے بچے ننگے

تھے اور سردی آرہی تھی میرا خیال تھا کہ شاید ان کی مدد کر سکوں گا۔ مگر پرماتما کو منظور نہ تھا۔ اگر آپ جیسے نیک انسان کا نیاز حاصل ہو جاتا تو شاید کچھ ساتھ لے آتا۔ مگر قسمت میں کچھ نہ لکھا تھا۔ اب میں جالندھر میں ایک دوست کے پاس رہتا ہوں۔ بچے ہوشیارپور کے ضلع میں ایک گاؤں میں ہیں۔ میرے پاس کوئی مکان نہیں کوئی ملازمت نہیں اور اب بے گھر اور بے در ہوں۔ یہاں سب سکول بند ہیں۔ پرائیویٹ سکولوں میں کام کرنے والوں کو گورنمنٹ نے ملازمت نہیں دی۔ نہایت پریشان ہوں کہ ان حالات میں بچوں کا پیٹ کیسے پال سکوں۔ جو کچھ اثاثہ میرے پاس تھا وہ میں نے تجارت میں لگا دیا تھا۔ 20 رم بڑے کاغذ کے اور 2500 انگریزی کے پرچے میں نے اپنے مکان میں پڑے دیکھے تھے۔ کتابیں جو میری ساری عمر کی کمائی تھیں پڑی تھیں۔ مگر اب مجھے کامل یقین ہے کہ آپ ان چیزوں کو بحفاظت رکھیں گے اور حالات نارمل ہونے پر میں آپ سے لے سکوں گا۔ آپ میرے مکان میں رہئے اور اس کا ہر طرح سے خیال رکھئے امید ہے آپ میری مدد کرنے میں پوری سعی کریں گے۔

ہری کرشن داس بیدی
جالندھر شہر

اس خط کی آخری سطروں پر میں رک گیا تھا۔ اسے کئی بار پڑھا۔

"آپ میرے مکان میں رہئے اور اس کا ہر طرح خیال رکھئے" ہری کرشن داس کا حوصلہ نہیں پڑتا کہ وہ اپنے مکان سے ذہنی طور پر دست بردار ہو۔ وہ اسے کھو کر بھی "اپنا مکان" کہہ رہا ہے۔ تاریخ کا یہ جبری انخلا کتنا تلخ تھا۔ حکومتیں اتنی اجازت تو دے دیں کہ بارڈر کے دونوں جانب رہنے والے اگر اپنے اپنے گھروں کو واپس نہیں لے سکتے تو کم از کم انہیں دیکھ ہی لیں۔

ایک روز سوم آنند کی کتاب "باتیں لاہور کی" پڑھ رہا تھا کہ اسی ٹیچر کے بارے میں تذکرے پر میری حیرت اور دلچسپی بڑھ گئی۔ میری ادھوری بات اس تحریر نے پوری کر دی تھی۔

"لاہور کے مشہور انقلابی پرنسپل پاکستان بننے کے بعد جالندھر میں آبسے۔ یہاں انہیں ایک مکان الاٹ کیا گیا جو ایک مسلمان کی جائیداد تھی۔ کچھ برس پہلے کی بات ہے کہ ایک نوجوان ان کے یہاں آیا۔ آیا بھی اس طرح کہ گیٹ کے باہر کھڑا ہو گیا اور دیر تک ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ گھر والوں کو تعجب ہوا کہ یہ نہ جانے کون ہے جو اتنی دیر سے باہر کھڑا ہے۔ پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ پاکستان سے آیا ہے اور یہ مکان اس کے والد کا تھا۔ وہ نوجوان کچھ روز تک پرنسپل صاحب کا مہمان بن کر رہا۔ دونوں کنبوں میں خط و کتابت بھی ہوتی رہی۔ کچھ عرصے کے بعد پرنسپل صاحب کو وہ مکان خالی کرنے کا نوٹس ملا۔ اب وہ پرانا مالک ان کی مدد کو آیا۔ اس نے پاکستان سے ایک حلف نامہ بھیجا جس کی مدد سے پرنسپل صاحب وہ مقدمہ جیتنے میں کامیاب ہو گئے۔

ان کہانیوں نے تلخیوں سے جنم لیا اور انسانی ظرف کی اعلیٰ مثالیں قائم کیں۔

لاہور ہائی کورٹ کے سینئر وکیل محمد اقبال چوہدری نے ایک روز مجھے کہا کہ اس کا آبائی گاؤں تحصیل دسویہ ضلع ہوشیار پور میں واقع ہے۔ گاؤں کا نام چیچیاں چھوڑیاں ہے۔ میں بہت چھوٹا تھا جب میری والدہ انتقال کر گئیں۔ ہمارا گاؤں دریائے بیاس کے کنارے ہوشیار پور ضلع کا آخری گاؤں تھا۔ جو بارات بھی کسی گاؤں میں جاتی وہ یہاں سے ہو کر جاتی۔ اس کا پڑاؤ ہمارے گاؤں میں ہوتا۔ میری والدہ جو نہایت سادہ دل' انسانیت دوست اور محبت کرنے والی خاتون تھیں۔ وہ بارات کو اپنے گھر ٹھہراتیں اور ان کی خوب خاطر تواضع کرتیں۔ یہ باراتیں ہندوؤں' سکھوں' چمیاروں اور مسلمانوں کی ہوتی تھیں۔ وہ سب کی مہمان داری کرتیں۔ خود کھانا پکاتیں۔ وہ خلوص کی پیکر تھیں۔ ہندوؤں' سکھوں' چمیاروں' سب سے اپنوں جیسا برتاؤ کرتیں۔ مجھے یہ منظر یاد ہے۔ مجھے گاؤں کی ہر چیز یاد ہے۔ میں نے ویزہ لینے کی بڑی کوشش کی لیکن ناکامی ہوئی۔

میں نے چوہدری اقبال کی آنکھوں میں آنسو تیرتے ہوئے دیکھے۔ اسے اپنی جنم بھومی یاد آئی تھی۔ اپنی ماں یاد آتی تھی' اپنا گاؤں یاد آیا تھا۔ جسے دیکھنے کی تڑپ نے اس کے اندر انگڑائی لی۔ محبت کا لاوا جیسے پھوٹ پڑا۔

اقبال ملک کو میں یقین دلا آیا تھا۔ کہ ایک روز ہمارا ہوگا۔ عوام کا ہوگا۔ امن چاہنے والوں کا ہوگا۔ ہم دل برداشتہ نہیں ہوئے۔ اپنی کوششیں جاری رکھیں گے۔ ہم اپنی اپنی حکومتوں کو سمجھاتے رہیں گے۔ ان پر دباؤ ڈالتے رہیں گے۔ امن کی کوششوں میں ان کا ہاتھ بٹائیں گے۔ ان کی مدد کریں گے۔ آنے والے کل کے بچوں کے لئے۔

رقص و موسیقی

رقص و موسیقی کو بے حیائی کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ بھارت کے حوالے سے تو یہ بات کوئی بھارتی قبول نہیں کرے گا۔ بھارتی دانشور یہ تو کہتے ہیں کہ بے حیائی ہمارا کلچر نہیں لیکن رقص و موسیقی کو عین بھارتی کلچر سمجھا جاتا ہے۔ رقص و موسیقی بھارتی ثقافت اور سماجی زندگی کا لازمی حصہ ہے۔

ساؤتھ ایشین فریٹرنٹی کے ہر کیمپ میں کلچرل پروگرام ایک لازمی جزو ہے۔ ویسے بھی ہماری تنظیم کے مقاصد میں ایک مقصد جنوبی ایشیاء کے ملکوں میں ثقافتی ہم آہنگی پیدا کرنا ہے۔ ساؤتھ ایشین فریٹرنٹی اور پاک انڈیا پیپلز فورم کے حوالے سے کلکتہ' دہلی' امرتسر' لاہور اور پشاور میں کنونشن منعقد ہوئے ان میں کلچرل پروگرام بھی ترتیب دیا گیا جس میں دونوں ملکوں کے فن کاروں نے حصہ لیا۔ جے پور' کھیڑی و امرتسر کے کیمپوں میں بھارت کے کئی صوبوں کے علاوہ سری لنکا' بنگلہ دیش' نیپال' بھوٹان' برما اور مالدیو کے ملکوں نے ثقافتی پروگرام پیش کیے۔ دہلی اور پشاور میں پاکستان کی مشہور فنکارہ شیما کرمانی نے کلاسیکی رقص پیش کیا۔

جوش ملیح آبادی نے رقص کو اعضاء کی شاعری قرار دیا ہے۔ یہ انسانی جذبات کے اظہار کا فطری ذریعہ ہے ساری کائنات ردھم میں ہے۔ اور یہ ردھم انسان کے اندر موجود ہے اس لئے موسیقی کو حرام قرار دینا فطرت کو جھٹلانا ہے۔ موسیقی صرف وہ حرام ہے جس میں گانے والا بے سرا ہو جائے رقص صرف وہ حرام ہے جس میں پاؤں سر اور تال کا ساتھ چھوڑ دیں۔

بھارت کے کلچر کی اپنی انفرادیت ہے۔ اس کا کلچر اتنا وسیع اور ہمہ جہت ہے کہ دنیا کا کوئی ملک اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ پاکستان میں رقص و موسیقی کے مخالفین کا کہنا ہے کہ رقص و موسیقی ہماری چیز نہیں۔ یہ ہمارے مذہب میں حرام ہے۔ گناہ ہے۔ جب یہ ہماری نہیں تو اس میں ترقی کرنا یا موازنہ کرنا سب فضول ہے۔

رقص زندگی میں توازن و موزونیت کا احساس دلاتا ہے۔ یہ انسانی جذبوں محسوسات اور امنگوں کی ترجمانی کرتا ہے۔

ہندوستان کے کلاسیکی رقص جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے درجہ اول کے رقص شمار ہوتے ہیں۔ ان میں نرت' روپک' تلانہ' شیودیوتا' کرشن لیلا اور نتھال شامل ہیں۔ یہ رقص ہندو دیو مالا کی عکاسی کرتے ہیں۔

1- نرت رقص۔ کتھک ناچ

یہ فرد واحد کا ناچ ہے جس میں شمالی ہندوستان کے رقص کی تکنیک یا اس کے آداب فن کا اظہار ہوتا ہے۔

2- روپک

جب پہلی بارش اس امر کا اعلان کرتی ہے کہ موسم برسات کا آغاز ہوگیا ہے۔ تو دو دوشیزائیں کیف و سرور میں ناچتی ہیں۔

3- تلانہ (گوری نائکہ)

4- شودیوتا

رقص کے دیوتا کا ایک بھگت اپنے دیوتا کی تعریف میں وجد میں آکر نغمہ سرائی کرتا ہے۔

"اے گوری کے محبوب۔ تمام کائنات کے رکھوالے اور تمام اچھائیوں اور خوبیوں کے منبع تو سنہرے مندر کا نتراج دیوتا ہے۔ میں تیری ہی پوجا کرتا ہوں۔

5- کرشن لیلا

یہ رقص کھتک کے انداز میں پیش کیا گیا۔

6- نتھال رقص

یہ اجتماعی رقص ہے۔ یہ ایک لوک ناچ ہے۔ جو نتھال کے پرگنوں (بہار) کے لئے

مخصوص ہے۔ بارش نے پتوں کو دھو دیا ہے اور زمین سرسبز و شاداب ہے۔ پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو آرہی ہے۔ گاؤں کے لوگوں کو اس موقع پر اپنی خوشی کے اظہار کا موقع ملتا ہے اور انتہائی گرم موسم کے بعد اس خوشگوار اور پر بہار موسم میں وہ میدانوں میں رقص کناں نکل پڑتے ہیں۔

رقص کے ساتھ ایک کہانی چلتی ہے۔ رقص پیش کرنے والا فن کار اپنے اعضاء اور چہرے کے تاثرات سے اسے الفاظ کا جامعہ پہناتا ہے۔ رقص کے پس منظر میں گیت گایا جاتا ہے۔

گیت :-

وہ جا رہی ہے گوالے کی لڑکی، جس کی رگوں میں جوانی موجزن ہے۔ اوہ! دیکھو وہ کس انداز اور دلربایانہ نگاہوں سے دیکھتی ہوئی چلتی ہے اور اس کے خرام ناز میں کس قدر دلفریبی و دلکشی ہے۔

وہ اپنے شیام کے خیالوں میں متغرق ہے اور برج کی کیاریوں میں سرخ قرمزی نقاب ڈالے ہوئے سیر کناں ہے۔

موسم بہار اپنے شباب پر ہے۔ رادھا اپنے کرشن کی تلاش میں روانہ ہوتی ہے اور راستے میں پھول توڑتی ہے اور فطرت کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر رقص کناں ہے۔ وہ اپنے دیوتا کے لئے ہار تیار کرتی ہے اور اس کا انتظار کرتی ہے اس کی سہیلیاں کرشن کو تلاش کرنے نکلتی ہیں اور وہ بھی پیچھے پیچھے چل پڑتی ہے۔ مایوس و شکست خوردہ و غمگین۔

اور اب وہ منظر پیش کیا جاتا ہے جس میں کرشن داخل ہوتا ہے اور اپنے ساتھ کھیلنے والوں کو نہ پا کر بانسری کی دھن پر تنہا رقص کرتا ہے۔ یہ دیومالائی بانسری فضاء کو نغمات سے پر کر دیتی ہے۔ اور دوسرے گوالوں اور گوالنوں کو کھینچ بلاتی ہے اور وہ رفتہ رفتہ کرشن کے رقص سے مسحور ہو کر خود بھی اس میں شامل ہو جاتے ہیں۔

گیت:-

میں موسم بہار میں فرط مسرت سے اپنے کرشن دیوتا کے ساتھ ہولی میں رنگ رلیاں منانے نکل پڑتی ہوں۔ وہ جب میری عزت افزائی کے طور پر میرے گھر آئے گا۔ تو میں اس کے سر پر سرسوں کے رنگ کی بسنتی پگڑی کی تعریف میں رطب الاسان ہوں گی۔

محبوب کی تلاش شروع ہو چکی ہے۔ اور رادھا اپنے محبوب کرشن سے ملنے ہی والی ہے۔ عشق کی راہ میں امید نے اسے خوبصورتی اور جوانی کی تصویر بنا دیا ہے۔ جب وہ کرشن کو اپنے ساتھیوں کے ساتھ پالنے کے کھیل میں مشغول دیکھتی ہے۔ تو وہ اپنی سہیلیوں سے کرشن کے پاس جانے اور کھیل بگاڑنے کے لئے کہتی ہے اور جب وہ اس عمل میں مصروف ہوتی ہیں تو رادھا کی آنکھیں کرشن کی آنکھوں سے چار ہوتی ہیں اور وہ ایک دوسرے کا راز پالیتے ہیں۔ وہ اپنا پانی سے بھرا ہوا گھڑا تیار رکھتی ہے۔ کرشن پر ایک نظر ڈالتی ہے اور موسم بہار کا تہوار منانے کے لئے تیار ہو جاتی ہے۔ گوالے اور رادھا کی سہیلیاں شوخی اور شرارت پر تلے ہوئے ہیں۔ وہ کرشن اور رادھا پر رنگین پانی پھینکتے ہیں۔

اس تہوار کی مناسبت سے ان کی روح بیدار ہو جاتی ہے اور یہ تہوار چلتے چلتے ایک پر جوش نغمے پر ختم ہو جاتا ہے۔ ایک قرمزی چمک دمک سارے ماحول پر چھا جاتی ہے۔

گیت:

یہاں نندا کا لڑکا کھیل میں مصروف ہے۔ جوانی اس پر چھائی ہوئی ہے اور اس کا چہرہ چاند کی طرح دمک رہا ہے برج کی گوپیاں اس کے اور اس کے ساتھی گوالوں کے ساتھ شوخیاں دکھا رہی ہیں اور بندرابن کی شہرت کو چار چاند لگا رہی ہیں۔

(دنیا بدل گئی)

کلاسیکل ڈانس کی کئی قسمیں اور سکول آف تھاٹ ہیں۔ ان میں نمایاں بھارتا شیام، اوڈیسی، کتھکالی، مانی پوری وغیرہ ہیں۔ جنہیں تکنیکی طریقے سے پیش کر کے جذبات، فکر و خیال، غمی، خوشی، ظلم، انتقام، نیز ہندو فلسفہ اور بھارت کی سرزمین کے جغرافیائی و معنوی خدو خال بیان کئے جاتے ہیں۔

پاکستان سے بھارت سیاحت کی غرض سے جانے والوں کو بھارتی سینما میں فلم دیکھنے کی خواہش ہوتی ہے۔ بھارت کا سینما بھرپور اور ترقی یافتہ ہے۔ یہاں بڑی تعداد میں لوگ سینماؤں میں فلم دیکھتے ہیں۔ نئے نئے موضوعات نئی نئی کہانیوں کے رنگ اور جدت خیال کو دیکھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ بھارتی سینما جمود کا شکار نہیں۔ لکھنے والوں کا قلم نت نئے زاویوں اور زندگی کے پہلوؤں کا احاطہ کرتا رہتا ہے۔ بھارت میں جمہوریت ہے تو لکھنے کو بھی بہت کچھ ہے۔ فلموں کے موضوعات کا پھیلاؤ دراصل زندگی کے رنگوں کا عکس ہے۔ جہاں ہنسی خوشی غم دکھ درد تجربات و مشاہدات سب ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ انسان نے کتنا کچھ دریافت کر لیا۔ ابھی نہ جانے کتنا کچھ چھپا ہوا ہے۔ یہی تلاش اور جستجو زندگی ہے۔ اسی سے ارتقا ہے۔ آرٹ اور کلچر کی زندگی اور اس کا پھیلاؤ جبر کے ماحول میں نہیں ہو سکتا۔ ہمارے ملک میں تخلیقی فن کی موت اس لئے واقع ہوئی کہ یہاں مختلف ناموں اور حوالوں سے جبر کو روا رکھا گیا۔ فن اور فن کار جاگیرداری کلچر میں اپنا فن عوام تک نہیں پھیلا سکتے۔ جاگیردار کلچر کو اپنے گھر کی لونڈی بنائے رکھتا ہے۔ کلچر کا عوام تک پہنچنا تب ہی ممکن ہے جب جاگیرداری نظام کا خاتمہ ہو۔ تھیٹر جب گلیوں، بازاروں، میدانوں، چوراہوں، گھروں، سکولوں میں لگنے لگیں تو یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ کلچر عوام تک پہنچ گیا۔

بھارت میں فلم سنسر بورڈ سیاست، سیکس اور مذہب کے حساس پہلوؤں پر نظر رکھتا ہے۔ تاہم بھارتی فلموں میں بے حیائی اور عریانیت نے جگہ بنا لی ہے۔ حالیہ چند برسوں میں ایسی فلمیں عام بننے لگی ہیں جن میں سیکس کو فری کرنے کی طرف سفر شروع کیا گیا ہے۔ ایک بھارتی دانشور نے کہا "عریانیت کلچر کا حصہ نہیں ہوتی۔ ہمارے کلچر کا بالکل

نہیں ہماری نئی نسل فلموں میں عریانیت کی وجہ سے بری طرح متاثر ہو رہی ہے۔ عریانیت کلچر کا حصہ بنائی جائے تو نسلیں پراگندگی اور ذہنی انتشار کا شکار ہو جاتی ہیں۔ جو کچھ فلموں میں دکھایا جا رہا ہے یہ ہمارے کلچر کا حصہ نہیں۔ اس میں سے بے حیائی کو نکالنا ہوگا۔"

حال ہی میں ریلیز ہونے والی نئی فلم "فائر" نے متنازعہ حیثیت اختیار کر لی ہے۔ یہ فلم عورتوں کی ہم جنسی پر بنائی گئی ہے۔ جس میں شبانہ اعظمی کا اہم رول ہے۔ بال ٹھاکرے کی جماعت شیو سینا نے ممبئی اور دہلی کے ان سینماؤں پر حملہ کر دیا جہاں یہ فلم دکھائی جا رہی تھی۔ ان کا کہنا تھا یہ بھارتی کلچر نہیں۔ دلیپ کمار اور ان کے ساتھیوں نے کہا کہ یہ آزادی رائے اور جمہوری کلچر کے خلاف حملہ ہے۔ جو بھائی یا اچھائی معاشرے میں موجود ہو اس کے اظہار کا جمہوری حق قانون اور آئین نے دیا ہے۔ جس کو زبردستی روکنا آزادی رائے کا گلا دبانا ہے۔ دلیپ کمار کے اس بیان پر شیو سینا کے انتہا پسندوں نے ان کے مکان کے آگے نیم برہنہ ہو کر مظاہرہ کیا۔ بال ٹھاکرے نے کہا کہ اس فلم میں عورتوں کے کرداروں کے نام سیتا اور رادھا کی بجائے مسلمانوں کے نام پر شبانہ، نجمہ یا سائرہ رکھے جائیں۔

شبانہ اعظمی کے بقول ہندو مذہب میں عورت کو مرد کے پاؤں کی جوتی سمجھا جاتا ہے۔ اسے مرد سے محبت نہیں ملتی۔ وہ بے توجہی کا شکار ہو کر ہم جنس پرستی پر آمادہ ہونے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ اگر ہم جنس پرستی سے بھارت کا کوئی تعلق نہیں تو سینماؤں اور گھروں پر حملے کر کے یہ بتایا جا رہا ہے کہ تشدد اور انتہا پسندی ہماری ہے۔ بھارتی معاشرے میں کئی طرح کی سماجی برائیاں ناسور کی طرح موجود ہیں ان کو ختم کرنے کی طرف کسی کا دھیان نہیں جاتا۔ آندھرا پردیش کے صوبے میں ہر تین ماہ بعد عورتوں کی نیلامی ہوتی ہے اور آٹھ دس عورتوں کو صرف 9 ہزار روپے پر ایک سال کے لئے پٹے پر دے دیا جاتا ہے۔ اس نیلامی کو کیوں نہیں روکا جاتا۔ فلم فائر میں دو عورتیں اپنے جذبات کو ٹھنڈا کر لیتی ہیں تو ایک طوفان کھڑا ہو جاتا ہے۔ عورتوں کی ہم

جنس پرستی صرف بھارت میں ہی نہیں کئی اور معاشروں میں موجود ہے۔ پاکستان میں اس بارے میں کبھی سروے نہیں ہوا اور اس پہلو پر غور نہیں کیا گیا۔ اکثر لوگ کہتے ہیں کہ ایک چھپی ہوئی برائی کو اس طرح منظر عام پر لانے سے برائی عام ہوگی اور نئی نسل متاثر ہوگی۔

تقسیم سے پہلے عورتوں کی ہم جنسی کے موضوع پر عصمت چغتائی نے ایک مشہور افسانہ "لحاف" لکھا تھا جس کے خلاف بعد میں مقدمہ دائر کیا گیا۔ اس افسانے میں جرات مندی کے ساتھ اس انسانی زندگی کے ناخوشگوار پہلو کو نمایاں کیا گیا تھا۔

پاکستان میں بعض طبقے بھارت کے کلچر کی یلغار سے خوفزدہ ہیں۔ لیکن مغرب کے کلچر کے برے اثرات جو تیسری دنیا کی نفسیات بدل کر ان کی تہذیب اور ان کے میڈیا کو بچھاڑ رہے ہیں۔ اس کا توڑ کسی کے پاس کیا ہے۔ کلچر کسی کی میراث نہیں۔ نہ ہی انسانوں کے زندہ سماج کو باندھ کر رکھا جا سکتا ہے۔ کھوکھلی تہذیبیں اور فرسودہ بے جان روائتیں اپنی موت آپ مرجایا کرتی ہیں۔ جاندار معاشروں میں اعلیٰ انسانی اقدار عمومی معاشرتی زندگی کی نفسیات بناتی ہیں اور انہیں کنٹرول کرتی ہیں۔ سوچ اور فکر کی اساس وہم، خوف فرسودہ روایات، تعصب استحصال اور طبقاتی اونچ نیچ پر قائم ہو تو اس کا بدل جانا ضروری ہوتا ہے۔ ایشیائی ملکوں کے رہنے والے کروڑوں عوام اپنی بے پناہ صلاحیتوں اور فطری اچھائیوں کے باوجود استحصال زدہ طبقوں کے زیر اثر ہونے کی وجہ سے اپنے معاشروں میں اپنے تہذیبی ورثہ کی اصل روح اور طاقت و تمازت کو ساتھ لے کر نہیں چل سکے۔ وہ رک گئے۔ بے جان بے روح معاشروں کا روپ دھار لیا۔

انہیں کسی کے کلچر کی یلغار کا خوف کھانے کی بجائے پہلے اپنے کلچر کی روح سمجھنا ہوگی۔ اپنے تہذیبی ورثے کو جاندار بنانا ہوگا۔ اس کے لئے استحصالی بورژوا جاگیرداری و سرمایہ داری نظام سے چھٹکارہ حاصل کرنا پڑے گا۔ ہر وہ تہذیب جس میں باطنی تضادات ہوں ایک نہ ایک دن اپنے ہی خنجر سے خودکشی کر لیتی ہے۔

بھارت میں ہر سال جتنی فلمیں بنتی ہیں شاید اتنی کسی اور ملک میں نہ بنتی ہوں۔

ممبئی میں ہالی وڈ سے کہیں زیادہ فلمیں بنتی ہیں۔ بھارت میں بارہ ہزار سے زیادہ سینما ہیں۔ ان میں پورٹیبل سینما بھی ہیں۔ جن کی سکرین اور پروجیکٹر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جایا جاتا ہے۔ بھارت میں فلم اکیڈمی ہے جہاں باقاعدہ تربیت دی جاتی ہے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ فلم انڈسٹری سے منسلک ہیں۔

پہلی بار بھارت میں 1896ء میں فلم دکھائی گئی۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد پہلی انڈین فیچر فلم ڈی۔ جی۔ پھالکے نے بنائی تھی۔ جنہیں انڈین سینما کا فادر سمجھا جاتا ہے۔

1699

کتاب کے بارے میں

مجھے خوشی ہے کہ آپ کی کتاب "سمجھوتہ ایکسپریس" منظر عام پر آ رہی ہے۔ آپ کے بھارت کے سفر نے دونوں ملکوں کے عوام کے درمیان دوستی اور باہمی رابطوں کے نئے راستے بنائے ہیں۔

بھارت اور پاکستان دو آزاد اور خودمختار ملک ہیں جو ایک دوسرے کی آزادی اور اقتدار اعلیٰ کا احترام کرتے ہیں۔ دونوں ملکوں کے درمیان بہت سی چیزیں مشترک ہیں۔ جن سے ہم اپنی زندگیوں میں بہتری لانے کے ساتھ ساتھ ادب اور لٹریچر میں بھی ایک دوسرے سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

آپ کی کتاب "سمجھوتہ ایکسپریس" پڑھنے والوں کو یہ جاننے میں بڑی مدد ملے گی کہ ہم دونوں ممالک ایک دوسرے کی فلاح اور خوشحالی کے لئے کتنا کچھ کر سکتے ہیں۔ میں آپ کو "سمجھوتہ ایکسپریس" لکھنے پر داد دیتا ہوں۔

نیک تمناؤں کے ساتھ

آئی کے گجرال

5 فروری 1999ء

فکشن ہاؤس

۱۸۔ مزنگ روڈ، لاہور